منڈی
مشرف عالم ذوقی

منڈی
افسانے

یہ کتاب اردو اکادمی، دلی کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے

یہ کتاب ان نقادوں کے لئے نہیں ہے جو،
زندہ سچائیوں پر یقین نہیں رکھتے۔

انتساب

انجم شاہ کے لیے

جس نے بتایا کہ --------- ادب کے علاوہ بھی ایک دنیا ہے

جہاں صرف مسکراتے رہنا ہے۔

میں نے اپنے بچے کی آنکھوں میں دیکھی ہے
مسکراہٹ / شرارت / زندگی
زندگی اور صرف زندگی
جس میں خمار ہے / اور نشہ / اور تازگی
نئی کہانی اسی سے جنمے گی / اس مسکراہٹ سے /
نئی کہانی کسی بغاوت کی کوکھ سے نہیں جنمے گی
وہ جنمے گی اسی زندگی سے
سرشاری / بہت ساری خوبصورت غلط فہمیوں /
اور ایک خاص طرح کے بھرم کے ساتھ

نئی کہانیاں

(۱۹۹۰ء سے ۱۹۹۷ء)

میں نے اپنے بچے کی آنکھوں میں دیکھی ہے
مسکراہٹ / شرارت / زندگی
زندگی اور صرف زندگی
جس میں خمار ہے / اور نشہ / اور تازگی
نئی کہانی اسی سے جنمے گی / اس مسکراہٹ سے /
نئی کہانی کسی بغاوت کی کوکھ سے نہیں جنمے گی
وہ جنمے گی اسی زندگی سے
سرشاری / بہت ساری خوبصورت غلط فہمیوں /
اور ایک خاص طرح کے بھرم کے ساتھ

نئی کہانیاں

(۱۹۹۰ء سے ۱۹۹۷ء)

ٹیلی فون

یہ اس رات سے پہلے کی ایک رات تھی..... ایک کالی، بھدی اور واہیات رات..... سارے دن کے تھکے ہوئے بوجھل لمحوں سے گزر کر یہ رات آئی تھی۔ میری بیوی حسب عادت کروٹ بدل کر سو گئی تھی۔ میں نے شاید بہت آہستگی سے، اسے شب بخیر کہا تھا۔ اتنی آہستگی سے کہ وہ سن بھی نہیں سکے۔ اتنی آہستگی سے کہ صرف میں ہی اپنی بات کا گواہ رہوں..... ہاں میں نے اسے شب بخیر کہا تھا اور شاید...... رات کا بوسہ بھی لیا تھا.... پاس میں سوئے دو سالہ سوی کو پیار بھی کیا تھا۔ اس سے پہلے، یعنی سونے سے پہلے عادتاً، جیسا کہ ایسے موقع پر میں ہمیشہ کرتا ہوں، میں نے بیوی کا شکریہ بھی ادا کیا تھا، اس گرے کلر کے شرٹ کے لیے، جو وہ میرے لیے لائی تھی۔ افسوس کی بات، مجھے گرے کلر پسند نہیں ہے اور بیوی شادی کے ان پانچ برسوں میں بھی یہ نہیں جان پائی کہ مجھے گرے کلر پسند نہیں ہے۔ مگر وہ شرٹ لائی تھی اور مجھے شکریہ ادا کرنا تھا۔ میں نے کیا اور تکیہ پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔

"شکریہ ہنی۔ تم نے.... کم از کم سوچا تو..... میرے جسم پر ایک نیا شرٹ۔ آدمی چاہے کتنا بھی پرانا ہو جائے، کپڑا نیا ہے تو احساس بھی نئے ہو جاتے ہیں.... کل ہی پہن لوں گا میں..... کل ہی..... دفتر کو جاتے ہوئے۔"

بیوی میری اس غیر دلچسپ گفتگو سے اوب کر کروٹ بدل کر سو گئی۔

اس رات کے لیے ایک پورے دن کا ستیا ناس کیا تھا میں نے۔ کیا کیا سوچا تھا۔ مگر ساری غلطی سوچنے کی ہے۔ ایک بار ہم سوچ لیتے ہیں تو پھر ہم اپاہج بن جاتے ہیں۔ اس لیے کہ لفظ اندر ہی اندر کود پھاند کر اپنا سبق مکمل کر لیتے ہیں۔ پھر یہ سبق وہاں نہیں دہرا پاتے، جہاں دہرانا چاہیے۔

ایک پوری صبح صرف خیالوں میں گزری تھی۔ صرف خیالوں میں۔ اور ایسے خیال میں، جو برسوں سے دماغ میں کوندنے یا آنے کا راستہ بھول گئے تھے....

"صبح بخیر... کچھ یاد ہے آپ کو....؟ پہلے ایک سریلی میٹھی تان آپ کو جگایا کرتی تھی..؟ ہولے ہولے مخروطی انگلیوں کا گیسوؤں میں رقص چلتا رہتا تھا...؟ چہرے پر اچانک..... سانسوں کے زیر و بم کے پھول لہراتے تھے.... اور.... سانسوں سے خفیف سی خوشبو اڑتی ہوئی نتھنوں میں سما جایا کرتی تھی..... کلائیوں میں چوڑیاں بجتی تھیں اور کوئی کوئی چوڑی پیار کے خوبصورت لمحے میں چنک کر، بکھر کر اپنے ہونے کا احساس کراتی تھی...."

ایسی کوئی صبح، کوئی خالی خالی سا خوشبو بھرا دن..... ایسی کوئی الست دوپہر یا ......ایسی کوئی راگنی میں ڈوبی ہوئی شام..... ایسی کوئی خوبصورت رات..... میں نے دھیرے سے حامی بھری....." صبح بخیر۔ میں سچ مچ بھول گیا تھا.....!"

اس صبح باتھ روم کے پاس ایک چوہا مر گیا تھا۔ اس دن صبح صبح موڈ غارت ہو گیا۔ بیوی سے کسی خوشگوار موڈ کی امید ہی فضول تھی۔ مرا ہوا چوہا باہر ڈال آنے کے بعد بھی اس کی بدبو ماحول میں برقرار تھی۔ اور اس بدبو کے ساتھ میں یادوں کے سفر پر نکل گیا تھا۔ مگر خیالوں کا ریلا دل و دماغ میں ادھم مچائے ہوا تھا۔

"بس ایک چوہا.....!"

"دن غارت کرنے کے لیے ایک چوہا بہت ہوتا ہے۔"

"شاید!"

"لیکن تم اس سے کیا باتیں کرتے ؟"

ہاں، یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔ مگر بہت دنوں سے، جیسا کہ ابھی ابھی خیال گزرا ہے..... کہ وہ سارے لمحے جو سندر تھے، سلونے تھے، حسین تھے، جگمگاتے تھے..... میں کسی اتاشی یا بکس میں بند کر کے بھول آیا ہوں.....

"تو جا کر کھول لو.....؟"

"نہیں۔ اتنا آسان نہیں ہے۔"

"پھر چپ ہو لو، سمجھوتا کر لو۔ عمر کی بیل کو بڑھنے دو۔ بڑھتے بڑھتے بوڑھی ہو کر مرجھا جائے گی..... جھڑ جائے گی۔"

"نہیں، یہ ایک تکلیف دہ احساس ہے۔ صبح صبح چوہے کے مرنے کی اطلاع سے زیادہ بھیانک اور تکلیف دہ۔"

"پھر؟"

"میں ہنسا نہیں ہوں بہت دنوں سے۔ ہاں سچ مچ، مجھے دل سے ہنسے ہوئے شاید ایک زمانہ ہو گیا۔"

"پہلے تو تم بہت کچھ کرتے تھے..... یاد ہے.....؟"

آگے ننگے یوکلپٹس کے پیڑوں کی قطار تھی۔ زمین بھوری تھی، سڑک پر بھیگی ہوئی مردہ پتیاں پڑی تھیں۔ جو رات کی شبنم سے، یا سبک، لہراتی ہوئی ہوا سے ٹوٹ کر بھوری زمین پر بچھ گئی تھیں۔ یہاں پہاڑ ہوتے تو.....! یہاں سے نیلا آسمان جھانک رہا ہوتا تو.....؟ "یہاں سے پہاڑ کی بلند چوٹیوں پر موتیوں کی طرح چمکتی برف نظر آتی تو.....؟ احمقانہ اور جذباتی۔ کورا جذباتی پن....."

پہلے میں ایسا بہت کچھ کرتا تھا جہاں میرا سیدھا جذبات سے واسطہ پڑتا تھا۔

"چیونٹیوں کی دعوت کی ہے کیا؟" جیمس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"یہ چیونٹیاں یہاں آئیں کیسے......؟"

"لو تم نے ہی بلوائی ہیں...... جیمس ہنس رہا تھا۔ پیون سے اسی لیے تمہاری میز صاف نہیں کرائی کہ چیونٹیوں کی دعوت کا بھرپور انتظام کر سکو۔"

یہ جیمس کم بخت...مجھے رشک کا احساس ہوا۔ کتنی بھرپور ہنسی ہنس سکتا ہے۔

میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ فائل پر ادھر سے ادھر گھومتی چیونٹیوں کو دیکھتا رہا۔ نہیں، یہ لمحہ مجھے ودیعت کیا گیا ہے.... شاید ہنسنے خوش ہونے کے لیے۔ مجھے ہنسنا چاہیے۔ کیوں جیمس! ان کی دعوت ذرا زوردار ہونی چاہیے نا.....؟"

میں نے میز پر رکھے گلاس میں جگ سے پانی بھرا۔ پھر قلم سے فائل پر منڈراتی چیونٹیوں کو گلاس میں دھیرے دھیرے ڈالنے لگا۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟" جیمس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"انہیں ان کی منزل تک پہنچا رہا ہوں۔ کیوں، انہیں کسی روحانی نظام کی تلاش ہے۔ نہیں؟ جیمس، منہ کیوں بنا رہے ہو، تمہیں نہیں لگتا۔ میرے چہرے پر شاید مسکراہٹ تھی... کیوں تمہیں نہیں لگتا، جیسے سموچی کائنات ان کے لیے Nothingness ہو اور یہ وجود کی نفی کی طرف بڑھ رہی ہو... فائلوں پر رینگتی ہوئی...."

"نہیں۔ تمہارا خیال درست نہیں ہے، جیمس تیزی سے لپک کر میرے پاس آیا۔ فائل چھین کر ایک طرف رکھا، نہیں۔ مذاق نہیں۔ یہ مر جائیں گی۔"

اس کے چہرے پر معصوم کراہ تھی...... "تم ان کی زندگی ختم کر رہے ہو..... جبکہ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔"

میں نے دیکھا اس کے لہجے میں افسردگی تھی۔ میں نے دھیان کیا۔ میرے اندر بھی ہنسی کہیں نہیں تھی۔ شاید ایک افسوسناک مغالطہ Pathatic Fallacy

میں بہت دیر تک چپ چاپ اداس سا سر جھکائے بیٹھا رہا۔

"کیا بات ہے"..... جیمس نے ٹوکا۔

"نہیں کچھ نہیں۔ بس دل نہیں لگ رہا۔"

"نہیں لگ رہا تو گھر چلے جاؤ۔"

"ہاں۔ گھر ہی جا رہا ہوں۔"

گھر لوٹتے ہوئے وہ بیہودہ سا منظر بار بار آگ کے شعلوں کی طرح میرے ذہن پر لپک رہا تھا.... وہی، گلاس میں تیرتی بہت ساری چیونٹیاں، جو پانی کی دھار بہتے ہی زمین پر چھٹپٹا کر دم توڑ گئی تھیں....

آخر ایسا کیوں لگا؟ کیوں کیا ایسا..... پتہ نہیں.....؟بس ان کے ہجوم کو دیکھ کر.... سوچا.... یہ تھک گئی ہوں گی۔ انہیں پانی میں لے آنے سے تھوڑا سکون ملے گا۔ تھوڑا ناچیں گی.... جھومیں گی.... پھر انہیں خشکی پر لے آؤں گا....ان کا سیر سپاٹا ہو جائے گا۔ اور یہ خشک ہو کر اپنے اپنے گھر واپس لوٹ جائیں گی۔ مگر یہ تو مر گئیں۔"

"تم بہت برے ہو.... آج تم نے ڈھیر سارے قتل کر دیے۔"

زمین آگ اگل رہی تھی۔ سورج کی گرم گرم جلتی ہوئی شعائیں جسم کو تندور کی طرح پکا رہی تھیں۔ ایک بہت بوجھل، گرم، بے مزہ دن گزار کر میں گھر آگیا۔ اور سچ کہتا ہوں، ہنسی کی ساری رسم ادھوری رہ گئی۔ اس دن میں نہیں ہنس سکا۔ شام کو بیوی کے آنے کے بعد بھی وہی بوجھل پن میرے وجود کے ساتھ چپکا تھا۔ مگر خیالوں کا ریلا اب بھی بہہ رہا تھا۔ ونس اگین..... ایک بار اور۔ آخر ملے ہوئے بہت زمانہ ہو گیا۔ چائے پینے، کھانا کھاتے ہوئے بھی، میں بیوی اور سومی کے ساتھ اپنے حصے کی ہنسی میں شامل نہیں ہو سکا۔ اس دن بیوی دفتر سے لوٹنے پر میرے لیے شرٹ لائی تھی۔ وہی گرے کلر کا شرٹ۔

اور ایک واہیات دن، واہیات رات اگلے دن کا خیال کر کے گزر گئی۔

دوسرا دن آگیا۔

اس دن چوہا نہیں مرا۔ اس دن صبح صبح سومی کے ہاتھ سے بون چائنا کا گلاس نہیں ٹوٹا۔ اس دن ہم دونوں کو باہر نکلنے کی عجلت تھی۔ میں نے کئی بار مناسب موقع دیکھ کر اس سے کچھ کہنا چاہا۔ جیسے ... سنو ہنی .... آج تمہارے ساتھ ..... برسوں بعدُ .... نہیں! تمہیں یاد ہے ..... پچھلی بار ہم کب ہنسے تھے؟ چڑیا گھر میں ... نہیں، بچوں کے پارک میں ..... آئس کریم کھاتے ہوئے۔ نہیں، اس تھرڈ کلاس سینما ہال میں تھرڈ کلاس فلم کی برائی کرتے ہوئے ..... نہیں ... بہت زور لگانا پڑ رہا ہے ... دماغ پر۔ نہیں ... سوچ کیا رہے ہو۔ بہت دن ہوگئے۔ ہم میں سے کوئی نہیں ہنسا ہے ... ایک دن ... یہی کر کے دیکھتے ہیں ... تھوڑا چینج اور Change-Over .... تھوڑا ہنس لیتے ہیں۔

وہ کپڑے اور سامانوں میں لدی پھدی پریشان تھی۔ وہ بہت پریشان تھی۔ اور پھر وہ اپنی پریشانیوں کے ساتھ بیگ ہلاتی چلی گئی۔

کوئی بات نہیں .... مجھے تسلی تھی۔ شام تو ہوگی۔ اور اس سے پہلے، ہنسنے کے سارے امکانات پر بھی مجھے غور کرنے ہیں۔ مثلاً کن کن باتوں پر مجھے ہنسی آسکتی ہے اور کن کن باتوں پر وہ خوش ہو سکتی ہے۔

"مثلاً اسے کیا اچھا لگتا ہے ..... کوئی ایسی چیز جسے دیکھ کر وہ خوش ہو جائے .... کوئی ایسی ... پیاری مضحکہ خیز بات جسے سن کر وہ اپنے آپ کو بھول جائے اور بے ساختہ ہنسنے لگے۔ مثلاً چوڑیاں ..... نہیں، اب اسے چوڑیاں اچھی نہیں لگتی ہیں۔ اب وہ چوڑیاں نہیں پہنتی۔ مثلاً زیور ..... نہیں اب اسے زیوروں کا بھی شوق نہیں ..... اور جب سے اس نے خود کمانا شروع کیا ہے، ایسی کسی چیز سے اسے خوش نہیں کیا جا سکتا۔"

مثلاً میں سارے گھر کی صفائی کر دوں ..... مثلاً وہ آئے تو کھانا بنا ہوا ملے .... اور رسوئی جگ مگ جگ مگ صاف ستھری۔ نہیں .... یہ سب تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ ان باتوں سے وہ پہلے پہل تو خوش ہوا کرتی تھی مگر اب .....

مثلاً اسے کوئی چٹکلہ سنایا جائے، کوئی دل چسپ لطیفہ، واقعہ یا اڑوس پڑوس کی کوئی خبر..... نہیں، اب یہ باتیں بھی اس کے لیے سر جھٹکنے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔

بکواس۔ بیوقوفی.... ایسی باتوں پر وہ یہی دو لفظ دہرا کر سنجیدہ ہو جائے گی۔

مثلاً......

خوش ہونے کے سارے راستوں پر گرم تپتی دوپہر کی دھوپ منڈرا رہی تھی۔ نہیں، مجھے اس سے کہنا چاہیے کہ..... ابھی اتنی زیادہ عمر نہیں ہوئی ہماری کہ..... ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے..... یعنی ایک دوسرے کے ہو کر بھی الگ الگ پگڈنڈیوں کے مسافر بنے رہیں۔ کیا یہ اچھا لگتا ہے..... ایسا کیا ہو گیا ہے ہمارے درمیان..... اتنی خشکی..... اتنی کڑواہٹ..... اتنی بدمزگی..... اتنی بے لطفی..... کیا اس فاصلے کو ہم پاٹ نہیں سکتے؟ نہیں..... ٹھیک ہے..... جینا ہے۔ سب ایسے ہی جیتے ہیں..... یہ سچ ایک بار، ایک دفعہ سب کی زندگی میں آتا ہے۔ مگر میں نے قطعی طور پر کبھی اس سچ کے بارے میں..... ایسے نہیں سوچا..... نہیں کبھی نہیں۔ میں نہیں سوچ سکتا تھا..... میں تو خواب دیکھتا تھا۔ خواب میں سنہری پرچھائیاں تیرتی تھیں۔ خواب میں رنگ برنگے شہر نظر آتے تھے۔ خواب میں ہوائی گھوڑے نظر تھے۔ ہوائی گھوڑوں پر دو ہلتے ہوئے ہاتھ مجھے اپنی طرف بلاتے تھے، جادو بھرا اشارہ کرتے تھے۔ میں تو سدا سے خواب دیکھنے والا رہا ہوں..... سدا سے خواب دیکھنے والا..... میں ایسا کیسے ہو گیا.....؟

نہیں تھوڑی سی تبدیلی۔ آج ہنسنے کی کوشش کرنی ہے مجھے۔ سومی کے ساتھ ..... اس کے ساتھ..... کہیں باہر چلتے ہیں۔ نہیں، وہ نہیں مانے گی۔ جائے گی ہی نہیں۔ جائے گی بھی تو بس ایک سویا سویا سا بوجھل پن ساتھ رہے گا..... پھر واپس آ جائیں گے..... اور کچھ بھی نہیں ہو گا۔ کچھ بھی ایسا، جو ایک لمحے کے لیے فرحت بخش جھونکے کی طرح محسوس ہو۔

یہ وہی رات تھی، جس کے لیے یہ ساری تیاریاں کی گئی تھی۔ وہ دفتر سے آئی۔ میں پہلے ہی آچکا تھا۔ وہ آتے ہی بیگ پھینک کر کچن میں داخل ہو گئی۔

تو تم آج پہلے آگئے۔ ذرا جلدی آگئے آج؟ چائے پیو گے؟

وہ چائے بنا کر لائی تو اس کا موڈ کچھ اکھڑا ہوا تھا۔

"کیا بات ہے؟"

"چیونٹیاں......!"

"کیا..... میرے چونکتے چونکتے وہ بول بڑی۔ کچھ نہیں، چینی میں چیونٹیاں۔ یہ کم بخت میٹھی چیزوں پر ایسے ڈیرہ جماتی ہیں کہ....."

"ڈیرہ جماتی ہیں کہ....." میری ہنسی آتے آتے رہ گئی۔ وہ بلا کی سنجیدہ تھی۔

"اس موسم میں چیونٹیاں بہت آتی ہیں۔ کیوں؟ گرمی کی وجہ سے.....لاکھ ڈھکن بند کرو۔ میزوں کی حفاظت کرو مگر چیونٹیاں....."

میرے اندر دھیرے دھیرے شاید کوئی بول رہا تھا۔ بول رہا تھا یا ہنس رہا تھا .....یہ ساری کائنات ان کے لیے Nothingness ہے.....یہ اپنی نفی کی منزل میں کبھی فائلوں، کبھی چینی کے ڈبوں میں.....

کچھ کہا کیا؟

نہیں تو..... میں اپنا جائزہ لیتے ہوئے گڑبڑا سا گیا۔ وہ اٹھی اور کپڑا بدلنے کے لیے چل دی۔ اس طرح ایک پورا دن اپنے بوجھل پن کے ساتھ گزر گیا اور رات آگئی۔

میں نے اس کے قدموں کی چاپ سنی۔ باہر کی بتیاں بجھا کر وہ اندر آگئی تھی۔ سومی سو گیا تھا۔

"ابھی تک سوئے نہیں؟"

وہ مسکرا رہی تھی۔ میں نے اسے دیکھا اور یکایک چونک گیا۔ اور چونکنے کے عمل میں میرا چہرہ تاثرات کی کش مکش میں کوئی سا بھی تاثر نہیں جٹا پایا۔

"بات کیا ہے؟"

"ہاں، تمہیں بتانا بھول گئی!"

وہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی بستر پر آکر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر ایک خاص طرح کی چمک تھی۔ میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

"سوچو کیا بات ہو سکتی ہے "Guess" وہ امتحان لے رہی تھی۔

نہیں، میں نے کافی دماغ پر زور ڈالنے کے بعد کہا۔ نہیں سوچ سکا۔ تم ہی بتا دو نا....؟

نہیں سوچ سکے، وہ بتی بجھانے کے لیے اٹھی۔ پھر مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ تمہیں بتانا بھول گئی تھی.... ٹیلی فون کا کاغذ آگیا ہے.....

اس نے بتی بجھا دی۔ اس کے چہرے کا تاثر نہیں دیکھ سکا۔ لیکن وہ کہہ رہی تھی....

"ہاں سنو، اب یہ نہیں کہ فون لگ گیا ہے تو ہر وقت فون سے لگے بیٹھے ہو۔"

کروٹ بدلتے ہوئے میرے لہجے میں بھی ناگواری شامل تھی۔

"میں کیوں کروں گا۔ فون تمہارے ہی زیادہ آئیں گے۔"

○○

بادبان (پاکستان)..... ۹۶ء

آجکل..... ۹۷ء

مجھے اسے زندہ رکھنا ہے

جیسا کہ گھر والے بتایا کرتے تھے۔ وہ رات بہت بھیانک تھی جب میں پیدا ہوا۔ بہت بھیانک..... جیسے خوف و دہشت کے ماحول میں کوئی چیخ اٹک گئی ہو۔ نہیں، اس سے بھی کہیں زیادہ بھیانک، اور جیسے سب بچے روتے ہوئے پیدا ہوتے ہیں۔ میں بالکل نہیں رویا تھا۔ اس لیے پہلے تو مجھے مردہ سمجھ لیا گیا۔ پھر جس دائی نے مجھے پیٹ سے نکالا وہ فوری تدبیر کے تحت بغیر تاخیر کیے میرے گندے منہ میں اپنے ہونٹ ڈال کر ہوا بھرنے لگی۔ کہ شاید اس عمل سے بچے کے مردہ جسم میں تھوڑی تمازت آجائے اور کوئی سانس بچ رہی ہو تو اس میں زندگی کی کرن لوٹ آئے۔ اور جیسا کہ گھر والے بتاتے ہیں۔ ایک بھیانک، بہت بھیانک رات جبکہ دائی کا منہ نومولود بچے کے خون اور پیپ سے بھر گیا تھا، وہ میری زندگی کے بچانے کا سبب ثابت ہوئی اور میں ایک تاریک سرنگ سے دنیا کے اجالے میں آگیا۔

پیدا ہونے کے بعد بھی میں اتنا دبلا پتلا تھا کہ مجھے کبھی اپنے ہونے پر یقین نہیں آیا۔ اور میں ہمیشہ سے، جیسا گھر والے میرے بچپن کے بارے میں بتاتے ہیں ....کہ میں بس ایک ہی رٹ لگایا کرتا تھا..... نہیں، میں پیدا کہاں ہوا ہوں.....میں تو بس ہوں.....اس طرح جیسے گھاس پھوس ہوتے ہیں.....یا برسات کے دنوں میں

"پھنکی پھنکی" نظر نہیں آنے والے کیڑے ہوتے ہیں۔

اور جیسا کہ سب بچے اسکول جاتے ہیں، ایک دن مجھے بھی اسکول بھیجا گیا۔ اس دن صبح ہی صبح ماں نے مجھے تیار کیا۔ نئے نئے کپڑے پہنائے۔ پرانی رضائی کا بنا ہوا بستہ میرے کندھے سے لٹکایا اور بابا کے ساتھ مجھے اسکول بھیج دیا۔ اسکول میں میرا نام تو لکھا گیا مگر شروع کے چند ماہ میرے لیے بہت سخت ثابت ہوئے۔

جیسے بچے، میرے لاغر جسم اور میرے ہونے کے باوجود نہ ہونے پر میرا مذاق اڑاتے....

"تو آپ بھی پڑھنے کو آئے ہیں.....؟"

"ہاں...."

"تو آپ کو احساس ہے، کہ آپ ہیں....؟"

"ہاں؟ کیوں نہیں"

"آپ کو سچ مچ احساس ہے...."

اف شرمندگی کی انتہا تھی۔ میں گھر آکر پھوٹ پھوٹ کر رویا.....

"نہیں۔ مجھے نہیں پڑھنا ہے۔"

"مگر کیوں۔" ماں کے لہجے میں ناراضگی تھی۔

"کیونکہ میں ہوں ہی نہیں"

"نہیں تم ہو۔ اور ایک دن وہ بھی سمجھ جائیں گے۔"

یہ ماں تھی۔ جیسی کہ شفقت رکھنے والی سبھی مائیں ہوتی ہیں۔ جبکہ باپ اس کے برخلاف تھا۔ اس کی آنکھوں میں شک گہرا ہو گیا تھا۔

"سنو، یہ ٹھیک کہتا ہے۔ اسے اسکول بھیجنا بند کردو۔"

"مگر کیوں....؟"

"کیونکہ.... یہ جو کہتا ہے کہ یہ ہے ہی نہیں۔ باپ پھسپھسا رہا تھا۔ کیا کبھی تمہیں اس کی موجودگی کا احساس ہوا۔ نہیں۔ مہربانی کر کے اس نو ماہ کے عذاب کا

تذکرہ مت کرو... باپ نے ایک بھدی سی گالی دی... جیسے بچے گھر میں اپنے ہونے کا احساس کراتے ہیں..... ویسے ہی۔ کیا تمہیں کبھی لگا کہ یہ گھر میں ہے۔ جیسے گھروں میں بچے ہوتے ہیں..... نہیں غصہ مت ہو۔ یہ سچ مچ نہیں ہے۔ جو ہے وہ ہم سب کا شک ہے۔"

نہیں، میں نہیں ہوں۔ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے میں بس اسی خیال سے گھرا رہتا۔ میں نہیں ہوں..... جو ہے وہ آنکھوں کا شک ہے۔ جبکہ اس کے برخلاف ماں کی آنکھوں میں سختی تھی۔

"نہیں تم ہو۔ اور تمہیں اسے زندہ بھی رکھنا ہے۔ سمجھ رہے ہو نا.... تم ہو.... اور تمہیں ثابت کرنا ہے۔"

مجھے نہیں معلوم، ماں کی آنکھوں میں اس چیز کے لیے خواب کیوں لہراتے تھے جو تھا ہی نہیں۔ جبکہ محلے والے، آس پڑوس کے لوگ، سب کا یہی خیال تھا... کیا تمہارے یہاں بچہ بھی ہے؟ اور گھر والے بتاتے ہیں کہ بعض عورتیں تو ماں کا مذاق بھی اڑاتی تھیں.... کہ سچ کہو، نو ماہ کے تھیلے سے کچھ برآمد بھی ہوا ہے..... یا بس یونہی اپنا جی خوش کرتی ہو....."

ماں ان کی باتوں کا چنداں برا نہیں مانتی بلکہ ہنس کر کہتی۔ "نہیں وہ ہے..... اور ایک دن وہ ثابت بھی کرے گا"۔

میں بڑا ہوتا رہا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ جیسے جیسے بڑا ہوتا رہا، مجھے اپنے نہ ہونے کے احساس کا خوف مٹتا گیا۔ میری آنکھیں جو دیکھ رہی تھیں، کان جو سن رہے تھے، وہ افسوس ناک حد تک برے تھے۔ جیسے مجھے معلوم ہوا کہ اسکول کے ایک بچے نے دوسرے بچے کا قلم چرا لیا۔ دو بچے آپس میں لڑ گئے۔ ایک نے دوسرے کو زخمی کر لیا۔ پڑوس کے ایک بڑے میاں نے چھت سے کود کر جان دے دی۔ اور تو اور..... ایک بار بابا نے میری ماں کو رات کے وقت پیٹ پیٹ کر ادھ مرا کر دیا۔ نہیں، میرا نہیں ہونا ہی اچھا تھا۔ مجھے بھرپور طمانیت کا احساس ہوا۔

"باپ نے تمہیں کیوں پیٹا؟" دوسرے دن میں نے ماں سے دریافت کیا۔
"کیونکہ وہ بس یہی کر سکتا ہے۔" ماں ہمیشہ کی طرح مسکرائی۔
"تمہیں برا نہیں لگا؟"
"نہیں۔"
"کیوں......؟ کیونکہ وہ ہے! اس لیے؟"
"نہیں یہ بات نہیں ہے۔ ماں نے مجھے تھپکیاں دیں......یہ جاننے کے لیے تم بہت چھوٹے ہو۔ مگر جان لو۔ اسے بھی اپنے ہونے کو وقتاً فوقتاً ثابت کرتے رہنا ہے۔ جینے کے لیے۔ اس لیے ایسا ہوا۔ وہ ایسا نہیں کرے تو۔ ماں فخر سے مسکرائی... ..شاید اسے اپنے ہونے کا یقین نہیں آئے۔"
"تمہیں یقین کیسے آتا ہے۔؟"
"ماں نے مجھے لپٹا لیا۔ میرے چہرے کا بوسہ لیا۔ جگمگاتی آنکھوں سے میری طرف دیکھا...... اس لیے کہ تم ہو......اور میرے یقین کے لیے نو ماہ کا یہ تحفہ بہت ہے......"

وہ لمبا گھا گھرہ پہنتی تھی۔ بڑی بڑی دو چوٹیاں رکھتی تھی۔ زیادہ تر ننگے پاؤں رہتی تھی۔ چہرے پر چیچک کے داغ تھے۔ اس کا باپ نہیں تھا۔ میں اپنے نہ ہونے کے احساس کے ساتھ بڑا ہو رہا تھا اور وہ اس دوران برابر گھر میں آیا کرتی تھی۔ ماں کے کام میں ہاتھ بٹاتی تھی اور ماں کہتی ہے......کہ کنکھیوں سے میری طرف دیکھا بھی کرتی ہے جو ماں کو اچھا لگتا ہے....
"تمہیں کیوں اچھا لگتا ہے؟"
"اس لیے کہ وہ تمہیں پسند کرتی ہے۔"
"لیکن میں تو ہوں ہی نہیں۔"
"تم ہو۔ اور تم اسے ثابت بھی کر رہے ہو۔"

ماں کو ہنسی آئی تھی، اس کے موتیوں جیسے دانت کھل گئے تھے.....

پتہ نہیں، میں کچھ ثابت کر بھی رہا تھا یا نہیں۔ میں تو صرف دیکھ رہا تھا۔ اور جو دیکھ رہا تھا وہ بہت معمولی سی باتیں تھیں۔ مثلاً درخت میں پتے کیسے آتے ہیں۔ پھول کیسے کھلتے ہیں۔ سورج جب طلوع ہوتا ہے یا غروب ہوتا ہے تو آسمان کیسا لگتا ہے۔؟ بلی چوہے کو کس طرح ختم کرتی ہے۔ چمگادڑ کیسے اڑتے ہیں۔ میں بعض چیزوں کی نقل بھی اتارا کرتا تھا۔ لیکن یہ چیزیں جو میرے مشاہدے میں تھیں، اتنی حقیر تھیں کہ جب میں بیان کرتا تو باپ اپنا منہ دوسری طرف پھیر کر ہنسا کرتا تھا۔ یا پھر میرا مذاق اڑاتا۔

"سچ مچ تم نہیں ہو۔"

"کیوں؟ تمہیں کیوں ایسا لگتا ہے۔ تمہیں معلوم ہے پانی میں کاغذ کی ناؤ کیسے تیرتی ہے.... ہوائیں کہاں سے آتی ہیں.... پنچھیوں کو آسمان میں کیا چاہیے۔ نہیں یہ سچ مچ چھوٹی اور معمولی باتیں تھیں۔ اور باپ کہتا تھا..... تمہیں اس سے بڑی باتیں سوچنا چاہیے..... جیسے تمہیں سوچنا چاہیے کہ زندگی کے لیے ضروری کیا کیا چیزیں ہیں.....؟"

"زندگی کے لیے ...."

میں اس طرح چونکا، جیسے ماں کی اس بات سے چونکا تھا کہ وہ گھا گھرہ والی لڑکی مجھے پسند کرتی ہے..... زندگی کے لیے...... مجھے اپنا سوال ماں کے سامنے رکھتے ہوئے مشکل نہیں ہوئی۔ اس لیے کہ اس کے پاس جواب کا خزانہ پہلے سے ہی کھلا ہوا تھا۔

"ہاں زندگی کے لیے تاکہ وہ گھا گھرہ والی لڑکی تمہارے گھر آجائے اوار تمہارا اپنا چوکا چکی ہو۔ اور اس کے لیے تمہیں خود کو ثابت کرتے جانا ہے.... سمجھ رہے ہو نا۔ آخری سانس تک.....!"

باپ ایک مختصر سی بیماری میں چل بسا۔ مختصر سی بیماری۔ اسے کنپکنپا

دینے والا بخار آیا۔ اپنے چھوٹے سے کمرے میں وہ ہذیان کی کیفیت میں اول فول بکتا رہا۔ پھر اس کی زبان بند ہو گئی۔ ماں نے دیکھا تو اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے تھے۔ باپ جا چکا تھا۔ باپ کبھی تھا۔ باپ کبھی موجود بھی رہا ہو گا۔ مگر چند دنوں میں ہی لگنے لگا کہ وہ کبھی تھا ہی نہیں۔ نہیں، وہ نہیں تھا۔ اس لیے کہ جہاں کہیں بھی وہ ہو سکتا تھا۔ اب وہ نہیں تھا۔ اس کی موجودگی کا کوئی سا بھی احساس نہیں تھا۔ یا ممکن ہے اس نے اپنی موجودگی کو پنپنے ہی نہیں دیا ہو۔ ماں بھی روتی دھوتی ایسے چپ ہو گئی جیسے وہ کبھی تھا ہی نہیں۔

"باپ تھا۔؟" میں نے ماں سے پوچھا۔

"ہاں وہ تھا۔ جیسے تم ہو۔ پہلے میں بھی گھاگھرہ پہنتی تھی۔ پھر وہ مجھے لے آیا۔ رکھا۔ وہ مارتا بھی تھا اور..... وہ ملائمیت سے بولی۔ "مجھے اس کا احساس سدا رہے گا۔"

ماں پھر بولی۔ "میرے پیارے اب تمہیں باہر نکلنا ہو گا۔ جیسا کہ تم شروع سے خود کو ثابت کرتے آئے ہو۔ مگر اصل میں ثابت کرنے کا وقت اب آیا ہے۔ سمجھ رہے ہو نا۔ اور پھر اس گھاگھرے والی کو بھی بیاہ کر لانا بھی ہے تمہیں۔

گھاگھرہ والی لڑکی۔ مجھے تعجب ہوا، وہ واقعی دیکھا کرتی تھی مجھے۔ کبھی چوکی چولہے کے پاس سے، کام کرتے ہوئے، نلکے پر پانی بھرنے کے دوران، یا ماں کے ساتھ سوپ پر چاول پھٹکتے ہوئے۔ ایک بار وہ مونگ پھلی کے دانے لائی تھی میرے لیے اور میرے ہاتھوں پر بکھیر کر بھاگ گئی۔

"یہ کیا تھا؟" میں نے ماں سے پوچھا۔

ماں ہنسی۔ یہ جو بھی تھا مگر تیرے لیے تھا۔ اور اسے تجھے خود ہی سمجھنا ہے....

ماں کی اس بات سے مجھے حیرانی ہوئی۔ مگر اب مجھے کام پر بھی نکلنا تھا۔ اس لیے کہ بقول ماں، میری مسیں بھیگ چکی تھیں۔ اور میرا باپ مر چکا تھا۔ اور جوان لڑکوں کو ہی گھر گرہستی کی فکر کرنی ہوتی ہے۔

یہ سب باتیں گویا چلتی رہیں مگر پھر بھی مجھے یقین نہیں تھا کہ میں ہوں۔ مگر

ماں کے پاس اس بات کا تسلی بخش جواب تھا..... میں اس لیے ہوں کہ میں ان سارے واقعات کا چشم دید گواہ ہوں۔

مجھے ہنسی آئی۔ ایک چھوٹی سی عمر میں ہم کتنی کتنی باتوں کے گواہ بن جاتے ہیں۔ جیسے ایک بار محلے میں بھیانک خاموشی چھا گئی تھی۔ جیسے بابا مر گئے تھے..... جیسے سڑکیں سنسان ہو گئی تھیں..... جیسے..... جیسے..... نہیں، میں کسی بات کا گواہ نہیں تھا۔ اس لیے کہ میں تھا ہی نہیں۔ اگر میں ہوتا تو مجھے دکھ ہوتا کہ میں کیوں ہوں۔ اور یہ سب کیوں ہو رہا ہے۔ لوگ کہتے تھے اس کے پیچھے بڑی بڑی باتیں ہیں۔ شاید اسی لیے۔ مجھے تو بس یہی پسند تھا کہ طوطا ٹائیں ٹائیں کیوں کرتا ہے۔ کوا منڈیر پر آکر چلاتا ہے تو اس کے معنی کیا ہوتے ہیں.....

جب پہلے دن میں کام پر نکلا تو ماں نے میرے ساتھ ڈھیر ساری دعائیں باندھ دیں۔ نئے جہان کے سارے تجربے نئے تھے۔ نہیں، تم نہیں ہو۔ تم ہو کر بھی نہیں ہو۔ مجھے ہر جگہ بس یہی ٹکا سا جواب ملتا۔ ماں ہر بار خوش ہو کر میرا حوصلہ بڑھاتی۔ ڈٹے رہو..... ایک نہ ایک روز..... پھر وہ فخر سے اپنی جھکتی کمر، اپنی پھیلتی جھریوں کو سمیٹ کر کھکھلا پڑتی..... دیکھا، تم ہو اور تم اسے ثابت بھی کر رہے ہو..... جاؤ کوشش کرو۔

نئی زمین، نیا آسمان۔ شہر، اسٹیشن، بڑی بڑی گاڑیاں، آسیبوں جیسی عمارتیں، نہیں۔ تم ہو ہی نہیں۔ آہ، تم کہاں ہو۔ جیسے ایک بدن ہوا میں اڑ رہا ہو۔ روئی کے گالے، جیسا یا..... نہیں، میں تھا ہی نہیں۔ تبھی تو ایک دن اس گھاگھرے والی لڑکی نے بھی میری طرف دیکھنے والی اپنی آنکھیں واپس لے لیں۔

"افسوس میں اپنا وقت برباد کرتی رہی۔ تم نہیں ہو۔ اور جان لو۔ تم میرے لیے ایک گھاگھرہ بھی نہیں لا سکتے۔ اس نے دکھایا..... ایسا پھٹا ہوا بھی....."

مجھے دکھ ہوا۔ اس کا گھاگھرہ سچ مچ پھٹا ہوا تھا۔ اور وہاں ایک بھدے کپڑے کا

پیوند لگا ہوا تھا۔ افسوس، میری نظر کبھی بھی اس پیوند پر نہیں گئی۔ اس نے اپنا گھا گھرہ سنبھالا اور چلی گئی۔

"نہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" ماں کو اطمینان تھا اور اس نے پھر فخر سے دہرایا..... "تم ہو.....اور تمہیں اسے زندہ بھی رکھنا ہے۔ بس سمجھ گئے نا۔"

اس دن میں پھر کام کے لیے نکلا۔ ماں نے کچھ زادِ راہ سفر کے لیے باندھ دیا تھا۔ چلتے چلتے میں کافی دور نکل گیا۔ یہاں ایک پل بن رہا تھا۔ کافی مزدور کام کر رہے تھے۔ سورج سر پر چڑھ آیا تھا۔ مزدور پسینے سے شرابور اور تھکے تھکے سے لگ رہے تھے۔ اب وہ قریب کے چشمے سے پانی پی رہے تھے۔ اور اپنے چہرے وغیرہ دھو رہے تھے۔ میں تیز تیز چلتے ہوئے ان کے قریب پہنچ گیا۔ اور اپنا مدعا سامنے رکھا۔

ان سب نے حسرت سے اور لطف لینے والے انداز سے میری طرف دیکھا۔ پھر ایک دوسرے کو دیکھ کر کھلکھلا پڑے۔

"نہیں۔ ہنسو مت.....زندگی کے لیے.....جیسا کہ میرے بابا نے سمجھایا تھا.. ...اور تم لوگ بھی تو.....میں کافی مارا مارا پھرا ہوں...."

"ممکن ہے....."

"تو مجھے کام مل جائے گا۔ کوئی سا بھی.....مجھے ثابت کرنا ہے کہ...."

ایک مزدور نے غصے سے میری طرف دیکھا۔

"نہیں تم ہو ہی نہیں۔ جو ہے ہی نہیں، اسے کام کیا ملے گا۔"

وہ سب ایک بار پھر قہقہہ لگا کر ہنسے۔ پھر پھاوڑا، کدالیں لے کر کام پر لگ گئے۔ وہاں ایک موٹا سا آدمی تھا۔ اس کے ساتھ ایک خوش لباس دوسرا آدمی بھی تھا۔ وہ میری طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا، اس نے ہماری باتیں بھی سنی ہوں گی۔ میں نے کان لگایا تو محسوس ہوا، وہ موٹا آدمی اس دوسرے آدمی سے میرے ہی بارے میں باتیں کر رہا تھا۔

"نہیں۔ یہ کام ذرا مشکل ہے۔ اس سے نہیں ہو گا۔"

"نہیں۔ کر لے گا۔"

"کر تو لے گا۔ مگر یہ..... یہ تو ہے ہی نہیں۔"

موٹے آدمی کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ "یہی ہمارے لیے کام کی بات ہے۔ وہ ہے ہی نہیں۔ سمجھ رہے ہو۔ وہ نہیں ہے۔ بس یہی خاص بات ہے۔ اور میں اسی لیے اسے کام دینا چاہتا ہوں۔ وہ نہیں ہے۔ اس سے ہمارے بہت سے مسائل حل ہو جاتے ہیں۔ سمجھ رہے ہو، نا....."

خوش لباس شخص نے دھیرے دھیرے کچھ سوچتے ہوئے گردن ہلائی۔ پھر اس نے میری طرف اشارہ کیا۔ میں گھبرایا گھبرایا سا دونوں کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

چلو، کام سے لگ جاؤ۔ بغیر تاخیر کیے۔

اس نے حکم دیا۔ مجھے عجیب سا لگا، تاہم جھٹ پٹ آگے بڑھ کر میں نے کام سنبھال لیا۔ سر پر تیز سورج تھا۔ دھرتی جل رہی تھی۔ میں مستقل کام کر رہا تھا۔ مگر.... وہ مزدور کہاں تھے.... نہیں.... وہ نہیں تھے.... مگر ابھی تو وہ یہیں تھے..... یہیں میرا تمسخر اڑا رہے تھے۔ مگر اب وہ نہیں تھے.... کہیں نہیں تھے..... یا میں انہیں نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ یا وہ مجھے نہیں دیکھ پا رہے تھے۔

اس دن میں لوٹتے ہوئے کافی تھک چکا تھا۔ جیسا ماں نے بھی دیکھا۔ میرے ہاتھوں اور پاؤں میں چھالے پڑ گئے تھے۔ میں ماں کے گھٹنوں کے پاس بیٹھ گیا۔ ماں اپنے چہرے پر تمام فخریہ جذبات سمیٹے میرے ہاتھ سہلا رہی تھی۔

"اذیت.... آہ، اپنے ہونے کے لیے یہ اذیت بھی کتنی ضروری شے ہے..... وہ مسکرائی۔ تم نے ثابت کر دیا ہے..... تم برداشت کر سکتے ہو، اس لیے کہ تم ہو...."

ماں کی باتیں میرے لیے تکلیف دہ تھیں۔ ماں نے پھر مجھ سے میرے مزدور ساتھیوں کے بارے میں پوچھا۔

"نہیں وہ نہیں تھے، میں نے اپنا تاثر بیان کیا۔ جب کہ وہ وہیں تھے۔ میرے

قریب..... اور کام کر رہے تھے..... مگر وہ مجھے دکھائی نہیں دیے۔"

"آہ۔ ماں کو افسوس ہوا۔ اذیت، سب کتنی اذیت سہہ رہے ہیں۔ تو تمہیں وہ دکھائی نہیں دیے؟"

"نہیں۔ وہ تھے ہی نہیں۔"

ماں نے مجھے دلاسا دیا۔ میرا سر سہلایا۔ پھر پیار سے بولی۔ وہ تھے بیٹے۔ ایسے ہی، جیسے کہ تم ہو..... ہاں، وہ ہیں اور تمہیں یہ بات برابر ان لوگوں کو بتانی چاہیے کہ وہ تھے، وہ ہیں... اور وہ ہمیشہ سے موجود ہیں..."

ماں نے اس بار اپنا چہرہ چھپا لیا۔ ممکن ہے ایسا کرتے ہوئے وہ بابا کو تلاش کر رہی ہو، جواب نہیں تھا۔ مگر جس کے ہونے کا احساس ماں کے اندر زندہ تھا۔

○○

بادبان (پاکستان)..... ۹۶ء

غلام بخش (ہندی کہانیوں کا انتخاب)..... ۹۷ء

مجھے جانوروں سے، بھوتوں سے، پیار کرنے دو

جینی کو کتے اور بلی پسند نہیں تھے ... وہ جب بھی انہیں دیکھتی، نفرت سے منہ سکوڑ لیتی۔ راہ چلتے کسی جانور پر اس کی نظر پڑ جاتی تو اس کا اچھا خاصہ موڈ خراب ہو جاتا۔ گھر آکر وہ کافی اودھم مچاتی۔

"ڈیر، یہ لوگ جانوروں کو گھر میں باندھ کر کیوں نہیں رکھتے۔ کھلا کیوں چھوڑ دیتے ہیں۔"

"پتہ نہیں۔"

"نہیں، تمہیں سب پتہ ہے۔ تم مرد اچھی طرح جانتے ہو، معزز خواتین اس طرح کھلے عام جانوروں کے گھومنے کو پسند نہیں کرتیں۔ تمہارا جی چاہے تو تم عورتوں کا سڑکوں پر گھومنا ہی بند کرا دو۔"

جینی اس کے بعد بھی لگاتار بولتی رہتی.... ایک بار موڈ اکھڑ گیا تو اکھڑ گیا۔ جذباتی عورت... اسے جینی کی ناراضگی یا خفگی پر کبھی غصہ نہیں آیا۔ وہ

جانتا تھا۔ Angry Women کے یہاں جذبات کی شدت ہوتی ہے۔ وہ جذبات کو چہرے مہرے سے لگاتار عیاں ہونے دیتی ہیں۔ جذبات چھپا کر نہیں رکھتیں۔

مگر جینی جب ایک دن اچانک بغیر کچھ بتائے۔ اپنے ایک بوائے فرینڈ کے ساتھ بھاگ گئی تو اسے دھکا لگا تھا۔ جینی کیوں بھاگ گئی؟

نہیں، اسے کچے پیاز کے سینڈوچ پسند نہیں تھے جو ایک زمانے میں اس کی مرغوب غذا تھی۔ اور ایک بار اس نے جینی سے اپنے چین کے سفرنامے کا ذکر کیا تھا، جہاں اس نے چاول کی بنی ہوئی چینی شراب پی تھی۔ جس بوتل میں یہ شراب تھی اس کی تہہ میں چھوٹے چھوٹے سانپ کنڈلی مار کر بیٹھے تھے...... جینی کو ابکائی سی آنے لگی۔ وہ زور سے چیخی۔ "سنو، بس کرو۔ اب میں اور زیادہ تمہیں برداشت نہیں کر سکتی۔"

اسے چھوڑ کر جانے کے لیے جینی کے پاس بھرپور جواز تھا۔ تاہم اسے یقین تھا کہ وہ لمحے جو جینی کے ساتھ محبت کی گواہی اور موجودگی میں گزرے، وہ خاصہ اہم تھے۔ اس لیے جینی کے جانے کا اسے ملال تو تھا، صدمہ نہیں تھا۔ جیسے یہ کہ جینی کو پیاز کے سینڈوچ اور چینی شراب پسند نہیں آئی تھی۔ اور جیسے یہ..... کہ ایک بار اس کی کار رات کے اندھیرے میں کسی پول سے ٹکرا گئی تھی تو ایک بیسوا نے اس کی جان بچائی تھی۔ جینی اکثر اس کے جسم پر اس بیسوا کے ہاتھ کے لمس کو محسوس کر کے غصہ جتاتی تھی۔

ہاں جینی کے جانے کے بعد اکیلے پن کا احساس ہوا تو اس نے سوچا۔ اب کیا کرنا چاہیے؟

کوئی دوسری عورت؟ نہیں، اسے بھی کچے پیاز کے سینڈوچ، چینی شراب اور بیسوا کا ذکر پسند نہیں آئے گا۔ اس لیے دوسری عورت کے بارے میں سوچنا ہی بے سود تھا۔ دوسرا اس کا یہ یہ ماننا تھا کہ چیز اپنے مثبت پہلو کی وجہ سے نہیں بلکہ منفی پہلو کی وجہ سے زیادہ یاد رکھی جاتی ہے۔ جینی کو کتے بلی پسند نہیں تھے۔ اور جینی

کی یاد کو تازہ بھی رکھنا تھا۔۔۔۔۔۔ اس لیے ذرا بھی تاخیر کیے بغیر وہ ایک عدد کتے لسی پوٹارا، اور ایک عدد سفید بلی لیڈی پوسی کو مہمان بنا کر گھر لے آیا۔ اور ان کے لیے الگ الگ دو کمروں کے بندوبست بھی کر دیے۔

صبح بخیر.....!

علی الصباح وہ ان کے لیے بریک فاسٹ کی تیاری میں مصروف تھا۔ گوشت کے چھوٹے چھوٹے پیس بنائے، راسٹ تیار کیے۔ راسٹ اور دودھ کی بوتل کے ساتھ وہ ان دو نئے مہمانوں کے سامنے حاضر تھا۔

"صبح بخیر.... صبح بخیر لسی پوٹارا..... صبح بخیر میری پیار لیڈی پوسی۔ دیکھیے بھونکیے نہیں.....اور آپ لیڈی پوسی۔ خدا کے واسطے ڈریے نہیں۔ یہ گھر آپ کا ہے۔ اور یہاں آپ سب کو مل کر رہنا ہے۔ کیوں ٹھیک ہے نا، تو آرام سے مزے لے لے کر بریک فاسٹ کیجیے۔"

وہ مطمئن ہو کر انہیں کھاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

لسی پوٹارا نے ممنونیت سے پونچھ ہلائی۔ اس نے آہستگی سے اس کے روئیں کو سہلایا۔ پھر بولا معلوم، اگر ابھی جینی ہوتی تو کیا کہتی..."مجھے اچھی طرح معلوم ہے، معزز خاتون کے لیے اس دنیا میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ معزز خاتون... سمجھ رہے ہو نا ڈیر...!

زندگی میں اس نے کسی کو اپنا دوست نہیں بنایا۔ صرف ایک شانگو کو چھوڑ کر، جو فطرتاً اسے پسند تھا۔ شانگو، یہ اس کا اصلی نام نہیں تھا۔ مگر چونکہ اسے شکار سے بہت زیادہ الفت تھی، اس نسبت سے وہ اسے اسی نام سے پکارنے لگا تھا۔ شانگو فطری مناظر اور ایڈونچر کا شوقین تھا۔ بینک میں ملازمت تھی، مگر اصل میں وہ اس کا شیدائی اس لیے تھا کہ اس کے پاس ہزار طرح کی داستانیں جمع تھیں۔ سانڈوں کی لڑائی، گہرے سمندر میں مچھلیوں کے شکار، اسکائی انگ Ski-ing وہ اپنے دل چسپ

تجربات بتا کر اسے محظوظ کیا کرتا تھا۔ اور وہ بار بار مسکرا کر سر ہلایا کرتا۔ خوب......
بہت خوب شانگو...... شانگو کے پیر میں ایک بار بندوق کی گولی لگی۔ تین بار
اس کے سر کی ہڈی کا فریکچر ہوا۔ دو بار وہ گاڑی الٹنے کی وجہ سے زخمی ہوا......اس
کے جسم پر چھ بار ٹانکے لگے۔ وہ سات نمبر کا اسپیشل جوتا پہنتا تھا۔ اور ساری عمر اپنا
کپڑا ایک ہی درزی سے سلواتا آیا تھا۔ وہ ایک وقت میں بس ایک ہی پیگ پینے کا
عادی تھا۔

جذباتی آدمی۔ ایسے جذباتی لوگ کہاں ہوتے ہیں.....اور بیشک ایسے لوگ
ہی، جو زندگی کے ساتھ جدوجہد میں مصروف نظر آتے ہوں، اسے پسند تھے۔ اس کی نظر
میں قابل رشک تھے۔ اور وہ ایسے ہی لوگوں کو پسند کرتا تھا۔

مگر شانگو اچانک غائب ہوگیا۔ اس نے اس سے دو لاکھ روپے قرض لیے تھے۔
قرض کی نوعیت کچھ اس طرح تھی کہ اچانک ایک رات شانگو کو خیال آیا کہ ایک
کینسر اسپتال بنوانا ہے۔ وہ بہت جذباتی ہوکر اس کے پاس آیا اور اپنے خاندان
کے، اور ایسے جان پہچان والوں کے قصے سنانے لگا، جن کی موت کینسر کی اذیت سہتے
ہوئے ہوئی تھی۔

پھر برسوں گزر گئے۔ شانگو نے اپنی شکل نہیں دکھائی۔ ہاں بہت بعد میں اسے
معلوم ہوا کہ بینک سے غبن کے الزام میں اسے پہلے ہی نکالا جا چکا ہے۔ اسی حادثے
کے بعد وہ اس سے پیسہ لینے آیا تھا۔

جذباتی آدمی۔ اسے یقین تھا کہ شانگو کہیں نہ کہیں اسپتال بنوانے والے
کام میں لگا ہوگا۔ اچھے مقصد کے لیے نکلا ہوا نیک آدمی۔ شانگو کو انڈے پسند نہیں
تھے۔ وہ اکثر انڈے کی زردی اور سفیدی کا ذکر بڑے خراب لفظوں میں کیا کرتا تھا۔
یقینی طور پر شانگو کو مرغے مرغیاں بھی پسند نہیں ہوں گے۔ کڑکڑانے والی، جگہ بہ جگہ
لاہیاں کرنے والی۔ شانگو کی یاد تازہ کرنے کے لیے ایک دن وہ بہت ساری مرغیوں کو
لے آیا۔ مرغیاں، جو انڈے دیتی تھیں، بچے سیتی تھیں، ور لاہیاں کرتی

تھیں۔

ہاں۔ بلی، کتے اور مرغیاں۔۔۔ اب اس کی مصروفیت دنوں دن بڑھتی جارہی تھی۔۔۔۔

ایک دن اس کے پاس گاؤں سے بڑے بھائی کا خط آیا۔ "باپ لمبی بیماری میں گزرگئے۔ آخری وقت میں تمہیں بہت یاد کر رہے تھے۔ مرنے سے پہلے انہوں نے وصیت نامہ بھی تیار کروایا تھا۔ اس مکان پر تمہارا بھی حصہ ہے۔ مگر جیسا کہ ہمیں معلوم ہوا ہے، تم خود اکیلے ہو۔ بیوی تمہیں چھوڑ کر غیر مرد کے ساتھ بھاگ چکی ہے۔ اور تمہارے پاس باقی زندگی گزارنے کے لیے ایک بڑا مکان بھی ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم دو ایک روز کے لیے یہاں آجاؤ اور مکان پر اپنے حق سے قانونی طور پر دست برداری کا اعلان کردو۔ بہتر ہے خط ملتے ہی چلے آؤ۔ تاکہ معاملات آسانی سے سلجھائے جاسکیں۔"

باپ لمبی بیماری میں چل بسے..... اس نے اپنے آنسوؤں کو دبایا۔ باپ کے نرم اور ملائم ہاتھوں کو یاد کیا۔ مدھم مدھم سا چہرہ آنکھوں کے آگے بجلی کی طرح کوندا۔ یہ وہی چہرہ تھا، جس نے پہلی بار جینی سے اس کے تعلق کے بارے میں سن کر گھر میں کہرام مچا دیا تھا۔

"وہی کرو جو تمہیں اچھا لگتا ہے۔ مگر خدا کے لیے یہاں سے چلے جاؤ۔"

پھر وہ جینی کو لے کر دور نکل گیا۔ گاؤں، گاؤں کی یادیں سب انہی پگڈنڈیوں پر بھول آیا جہاں سے شہر کو جانے والے راستے کے لیے اس نے گھوڑا گاڑی پکڑی تھی۔ پھر وہ گاؤں نہیں گیا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا، باپ کو اصلیت بتانے میں اس کے بڑے بھائی کا بھی ہاتھ تھا۔ بڑا بھائی یعنی۔۔۔ ایک سچا اور کھرا آدمی۔

تب اس کے بھائی کی شادی ہو چکی تھی۔ اور اس کی بیوی سے پانچ اولادیں پیدا ہوئی تھیں، تین تو لڑکیاں تھیں اور دو لڑکے۔ ایک ذمہ دار باپ۔ بیوی کی

ضرورت۔ بچوں کے اچھے مستقبل کی فکر کرنے والا رحم دل باپ، اسے بھائی کے سچے اور کھرے ہونے پر خوشی ہوئی۔ اس نے شکریہ ادا کیا اور گاؤں کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ دیا۔

اسے یقین تھا، دنیا میں عمدہ، سچے اور کھرے لوگوں کی کمی نہیں۔ اور ایسے لوگ جذباتی ہوتے ہیں۔ حساس دل والے۔ شدت پسند۔ جیسا کہ اس کا بھائی تھا۔ تین لڑکی، دو لڑکوں اور ایک محبت کرنے والی بیوی کی ذمہ داری محسوس کرنے والا۔ پھر اس نے باپ کی لمبی بیماری میں جی بھر کر اس کی خدمت بھی کی ہوگی۔ ایک اچھا اور نیک انسان۔ اسے خوشی تھی کہ وہ اپنے بھائی کے کام تو آیا۔ اور یقینی طور پر وہ بھائی کے لیے اپنے حق سے دست بردار ہو جائے گا۔

وہ گاؤں نہیں جانا چاہتا تھا۔ مگر گاؤں جانے کے کئی بہانے تھے اس کے پاس۔ جیسے وہ باپ کی گیلی نرم قبر پر انگلیاں پھیر کر اسے جیتے جی محسوس کرنا چاہتا تھا۔ ایک بھلا انسان، جیسا کہ اس کا باپ تھا۔ غلط بات نہیں برداشت کرنے والا۔ آخر لوگ محبت کا پاگل پن کرتے ہی کیوں ہیں۔؟ وہ بھی جینی کے لیے کیسا بے خود ہو گیا تھا کہ باپ کی عزت تک کی پرواہ نہ کی۔ ایک بے حد معزز اور بھلا باپ۔ بیشک اسے حق حاصل تھا کہ اس انتہا درجے کی غلطی کے نتیجے میں اسے گھر سے نکال دے۔ اور اس نے یہی کیا۔ ایک بے حد نیک اور صالح منش۔

گاؤں جانے کا سب سے عمدہ بہانا دراصل وہ جگہ تھی، جسے وہ اس عمر میں دیکھنے کا خواہش مند تھا۔ یہ گاؤں والے گھر کے پچھواڑے کی خالی زمین تھی۔ جہاں ایک پیپل کا پیڑ تھا۔ وہ چھوٹا تھا تو گھر والے منع کیا کرتے تھے.... خبردار، اندھیر منہ اس طرف مت جانا۔ وہ اس طرح کے کئی قصے سن چکا تھا کہ ایک بچہ کھیل رہا تھا اور پیپل سے اچانک ایک ہاتھ بڑھا۔ ہاتھ لمبا ہوتے ہوتے بچے کے گلے تک پہنچ گیا۔ بچے کے گھر میں کہرام مچ گیا۔

رات کے اندھیرے میں گاؤں والوں کا خیال تھا کہ پیپل کے پاس سے

بڑی عجیب عجیب صدائیں آتی ہیں۔ جیسے کوئی کسی کو آواز دے رہا ہے۔ کسی کو پکار رہا ہے.....

یہ قصے سنتے سنتے، اس اجنبی بھوت سے اس کی ایک طرح کی دوستی ہو گئی۔

اجنبی بھوت!

وہ اکثر سناٹے میں پیپل کے پیڑ کے پاس نکل جاتا۔ اور گھنٹوں اس بھوت سے باتیں کرتا رہتا۔ مجھے معلوم ہے، تم چھپے ہوئے ہو، تم میرے دوست ہو گئے ہو..... اس لیے تم مجھے ڈرانا نہیں چاہتے..... ارے میں نہیں ڈروں گا اجنبی بھوت..... میں بس ذرا دیر کو تمہارا دیدار کرنا چاہتا ہوں۔ بس ذرا کچھ دیر کے لیے۔

وہ پیپل کا پیڑ اب بھی ہو گا۔ اور وہ بھوت۔ بچپن میں تو اس کا دیدار نہیں ہو پایا مگر اب وہ اپنے برسوں پرانے اجنبی دوست کے دیدار کا خواہشمند تھا۔ اسے یاد آیا، ایک بار گاؤں کی ایک لڑکی کو اسی پیڑ کے ساتھ باندھ دیا گیا تھا۔ اس پر الزام تھا کہ وہ کرپٹ تھی۔ گاؤں والوں کا خیال تھا کہ رات کے سناٹے میں بھوت اسے دبوچ لے گا اور وہ خود بخود ختم ہو جائے گی۔

کرپٹ... اس کا خیال تھا کہ کرپٹ لوگ زیادہ جذباتی ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ اپنے احساس اور جذبات کو بلا وجہ قابو میں رکھنا نہیں چاہتے۔ وہ دوسروں کو خوش رکھنے یا دیکھنے کی حتی الامکان کوشش کرتے ہیں۔ اور نتیجے کے طور پر انہیں ذلت آمیز ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ اسے خوشی تھی کہ دوسرے دن پیپل کے پیڑ کی رسی کھلی ہوئی تھی اور وہ لڑکی غائب تھی۔ گاؤں والوں کا خیال تھا کہ اسے اجنبی بھوت اپنے ساتھ لے گیا۔ اسے یقین نہیں تھا۔ تاہم اسے اس بات کی خوشی ضرور تھی کہ وہ لڑکی جہاں کہیں بھی ہوگی، دوسروں کو خوش رکھنے کے بہانے تلاش کر رہی ہوگی۔ اچھی اور نیک لڑکی۔

دوسرے دن اس نے اپنے پالتو جانوروں کو اپنی روانگی کی اطلاع سنا دی۔

، لیڈی پوسی... بہت پیار سے لسی پوٹا را اور چنگی منگیاں۔ مجھے خود

اچھا نہیں لگ رہا ہے کہ میں تم لوگوں کو چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ مگر پیارے..... بس دو دن صبر کرلو۔ دو دنوں تک کے لیے میں نے سارا انتظام کر لیا ہے۔ میرے پیارو۔ اب مجھے اپنے مت نہارو۔ دیکھو، سچ مچ، میں تم لوگوں کی جدائی کی تاب نہ لاکر رو پڑوں گا۔ اچھا، الوداع۔"

اس نے ان جانوروں کے ہوائی بوسے لیے اور گاؤں کے لیے روانہ ہو گیا۔

گاؤں بدل گیا تھا۔ بہت کچھ بدل گیا تھا۔ پہلے تو وہ بھائی کے گلے لگ کر خوب رویا۔ پھر باری باری سے بھائی کے بچوں سے ملتا رہا۔ سب بڑے ہو گئے تھے۔ وقت کے ساتھ بڑے اور تجربہ کار۔ لڑکیوں کی شادی ہو گئی تھی اور لڑکے روزگار کی تلاش میں تھے۔ گھر پہلے سے کہیں زیادہ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ مطلب کی بات اب تک نہیں ہوئی تھی۔ شام ہوتے ہی بھائی اور بھاوج اس کے قریب آ گئے۔

بھائی نے پوچھا۔ "ابھی رہو گے نا؟"

"نہیں، کل ہی روانہ ہو جاؤں گا۔"

شفیق بھاوج نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ "یہ گاؤں رہنے کے لائق نہیں ہے۔ اتنی گندگی اور یہ گھر..... وہاں تو آپ گدوں پر سوتے ہوں گے۔ یہاں بھلا کیا دل لگے گا۔"

اسے خوشی ہوئی۔ بھائی اور بھاوج اس کا کتنا خیال رکھتے ہیں۔

"شکریہ۔ بہت بہت شکریہ....."

"پھر معاملات کا کیا ہوگا؟" بھائی کی آنکھوں میں شاید گرد پڑ گئی تھی۔ وہ آنکھیں مل رہا تھا۔

"جیسا آپ چاہیں۔ آپ بڑے ہیں۔ آپ کی خوشی میری خوشی ہے۔"

بھائی نے جہاں کہا، اس نے دستخط کر دیا۔ معاملات ٹھیک بیٹھ گئے۔

دوسرے دن وہ اپنے باپ کی آخری آرام گاہ دیکھ آیا۔ اچھے لوگ..... اچھے لوگوں کو

خدا جلد بلا لیتا ہے۔ اس نے چھو کر دیکھا.... وہاں کی زمین نرم اور بھوری تھی۔ ڈال سے ٹوٹ کر مردہ پتیاں ادھر ادھر بکھری ہوئی تھیں۔ اس نے آنکھیں پوچھیں اور اٹھ کھڑا ہوا۔ جانے سے قبل اب اجنبی دوست سے ملنا باقی تھا۔

اور یہ گاؤں میں آنے کے بعد اس کو پہلا جھٹکا لگا تھا۔

وہ جگہ...... پچھواڑے کی جگہ.... اب وہاں ایک نیا مکان تعمیر تھا۔ تو بھائی نے یہ جگہ بیچ دی۔ اسے خبر بھی نہیں کی..... بھائی نے اس کی آنکھوں میں لہراتے سوال کو بھانپ لیا۔

"ضرورت پڑ گئی تھی...."

ہاں ضرورت.... لڑکیا جوان ہو گئی ہیں۔ بچے بڑے۔ بھائی کو بچوں سے کتنا پیار ہے۔ کتنا خیال ہے....

اسے بس اسی بات کا غم تھا کہ وہ اجنبی دوست سے نہیں مل پایا۔ وہ پیپل کا پیڑ کٹ چکا تھا۔ اور وہاں انسانی گھر آباد تھا۔ بھوت اجڑ گئے تھے اور اس کی جگہ انسان آگئے تھے۔

"اچھا خدا حافظ اجنبی بھوت..... تم جہاں کہیں بھی ہو۔ خدا حافظ....."

اس نے دل ہی دل میں دہرایا.....

بھائی نے اس کی طرف دیکھا۔ "اب کب آؤ گے؟ آتے رہا کرو....."

اس بار وہ کچھ نہیں بولا۔ بس مسکرا کر رہ گیا۔

○○

....بادبان (پاکستان)

........جدید اسلوب

اصل واقعہ کی زیراکس کاپی

وہ جو،
ہر طرح کے ظلم، قتل عام اور بربریت
کے پیچھے ہیں،
انہیں ڈھونڈو
تلاش کرو
اور ختم کردو
اس لیے، کہ وہ اس نئی تہذیب کی داغ بیل
ڈالنے والے ہیں
جو تمہاری جانگھوں یا ناف کے نیچے سے ہو کر گزرے گی۔ "

گرمی کی ایک چلچلاتی دوپہر کا واقعہ

سپریم کورٹ کے وسیع و عریض صحن سے گزرتے ہوئے اچانک وہ ٹھہر گیا۔ سامنے والا کمرہ جیوری کے معزز حکام کا کمرہ تھا۔ اس نے اپنی نکٹائی درست کی۔ خوبصورت سلیٹی کلر کے مینی بریف کیس کو، جسے اس نے سوئزرلینڈ کے ۲۵ سالہ ورک شاپ سے خریدا تھا۔ داہنے ہاتھ میں تھا، اور اس جانب دیکھنے لگا، جدھر پولیس

کے دو سپاہی ایک منحنی سے آدمی کو ہتھکڑی پہنائے لیے جا رہے تھے۔

سموئل یہ بھی آدمی ہے...... وہ بے اختیار ہو کر ہنسا جیسے اس دبلے پتلے سے آدمی کو ہتھکڑیوں میں دیکھتے ہوئے ہنسنے کے علاوہ دوسرا کوئی کام نہیں کیا جا سکتا۔ آدمی..... تم کیا سمجھتے ہو سموئل، اس نے کوئی جرم کیا ہوگا۔ میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں۔ یہ آدمی ایک مکھی بھی نہیں مار سکتا۔

آپ کا دعویٰ صحیح ہے یور آنر۔ سموئل نے قدرے کھل کر اس کی طرف دیکھا۔ یہ مکھی بھی نہیں مار سکتا۔ مگر پچھلے دنوں آپ نے وہ چرچا سنا ہوگا۔ ایک شخص نے اپنی دو بیٹیوں کے ساتھ..... اپنی سگی دو بیٹیوں کے ساتھ.....

"کیا یہ شخص....."

سموئل نے سر کو جنبش دی۔ یور آنر، یہ وہی شخص ہے۔

منحنی سا دبلا پتلا آدمی۔ چہرہ عام چہرے جیسا۔ آگے کے بال ذرا سا اڑے ہوئے، بالوں پر سفیدی نمایاں ہو چکی تھی۔ سانولا رنگ۔ کرتا پائجامہ پہنے۔ ایک ہاتھ سے اپنے چہرے کو بہت ساری چبھنے والی نگاہوں سے بچانے کی کوشش میں۔ سپاہی اسے لے کر کورٹ روم میں داخل ہو گئے۔

اس نے گھڑی دیکھی۔ بینک تو بارہ بجے بند ہوتا ہے نا.....

یس یور آنر،

مجھے یور آنر مت کہا کرو۔ میں ہوں نا، ایک بہت عام سا آدمی۔ معمولی آدمی۔ کہتے کہتے وہ ٹھہرا۔ تم نے کبھی اس طرح کا کوئی مقدمہ دیکھا ہے سموئل؟ نہیں۔ میں نے بھی نہیں دیکھا۔ میں سمجھ سکتا ہوں سر..... سموئل جھک جھک کر سر ہلا رہا تھا۔

اب وہ کورٹ روم میں تھے۔ جیوری کے ممبر موٹی موٹی کتابوں، فائلوں کے ساتھ اپنی جگہ لے چکے تھے۔ بیچ بیچ میں کوئی وکیل اٹھ کھڑا ہوتا۔ جج درمیان میں بات روک کر گمبھیر آواز میں کچھ کہتا۔ جیوری کے ممبر نظر اٹھا کر اس منحنی سے شخص کو

دیکھ کر کچھ اشارہ کرنے لگتے۔

پھر بہت ساری نظریں کٹہرے میں کھڑے ہوئے ملزم کی جانب اٹھ جاتیں۔ وہ آدمی۔ وہ سر جھکائے کھڑا تھا۔ وہ چہرے سے عیاش اور پاجی بھی نہیں لگ رہا تھا۔ وہ چہرے سے اس قماش کا قطعی نہیں لگ رہا تھا۔ چہ مگوئیوں، شور کرتی آوازوں کے بیچ دو لڑکیاں اپنی جگہ سے اٹھیں۔ ایک کی عمر کوئی سترہ سال کی ہوگی۔ دوسری کی پندرہ سال۔ دونوں کے چہرے پر ایک خطرناک طرح کا تیور تھا۔ جیسے کسی زمانے میں افریقی نسل کے سیاہ فام جمپانا نام کے بندر کے چہرے پر پایا جاتا تھا۔

اسے وحشت سی ہوئی۔ چلو سموئل۔ باہر چلتے ہیں....،

مگر یور آنر... سموئل کے چہرے پر ہلکی سی ناراضگی پل بھر کو پیدا ہوئی جسے حسب عادت اپنی مسکراہٹ کے ساتھ وہ پی گیا... جیسی آپ کی مرضی یور آنر۔

دونوں سڑک پر آگئے۔ اس کی آنکھوں میں سراسیمگی اور حیرانی کا دریا بہہ رہا تھا۔

"تم وہاں رکنا چاہتے تھے سموئل۔ کیوں؟ میں سمجھ سکتا ہوں۔ اس نے سر کو جنبش دی، مگر بتاؤ۔ آخر کو وہ آدمی۔ کیوں تمہارے ہی جیسا تھا، نا.....؟"

"سموئل گڑبڑا گیا۔ پھر فوراً سنبھل کر بولا۔ ہاں بالکل۔ ہمارے آپ کے جیسا۔ ..... آدمی۔ جیسے سبھی آدمی ہوتے ہیں...."

"چہرے پر ملال ہو گا۔ ہونا چاہیے..... ہو گا ہی..... تم نے دیکھا نا، سموئل، وہ کٹہرے میں کیسا نظریں بچائے کھڑا تھا۔"

"یس یور آنر..."

"میری سمجھ میں ایک بات نہیں آتی سموئل، آخر خود پر لگائے گئے الزامات کی وہ کیا صفائی بیان کر رہا ہو گا۔ وہ کہہ رہا ہو گا کہ... اس کے چہرے کے تیور بدل رہے تھے۔ آدمی کو ایک زندگی میں ایک ہی کام کرنا چاہیے۔ یا تو بس اپنے کام سے جنون کی حد تک پیار ہو یا پھر شادی کر کے گھر بسا لینا چاہیے۔ دونوں میں سے ایک کام۔ یہ کیا..... کہ شادی ہوئی اور ماں کی گود سے کود کر بچی دندناتی ہوئی تاڑ جتنی

لمبی ہوگئی۔ اور لوگوں کی نگاہوں میں ٹینس بال کی طرح پھسلنے لگی۔ ادھر۔۔۔ ادھر۔۔۔۔ سموئل ہنسا۔ وہ دیکھیے سر!"

سامنے سے دو کانونٹ پراڈکٹ ٹھاکہ لگاتی ہوئی گزر گئیں۔ ایک پل کو اس کی نگاہیں چار ہوئیں۔ جسم میں ایک تیزابی ہلچل ہوئی۔ بجلی، کوندی گرجی اور خاموش ہوگئی۔

ایسی لڑکیاں... ہم آپ کسی نظر سے دیکھیں مگر میرا دعوی ہے..... ان کا ایک باپ ہوگا۔ گھر میں چائے پیتا ہوا۔ اخباروں پر جھکا۔ بیوی سے کسی نامناسب بحث میں الجھا ہوا۔ اور بیٹیوں کو دیکھ کر اشارتاً کوئی بے معنی سا سوال پوچھتا ہوا۔ یا.. ...بریک فاسٹ، لنچ، ڈنر یا چائے بنا دینے کی بے چارگی بھری فرمائش کرتا ہوا۔ ایک عام باپ... جیسا کہ وہ تھا... جیسا کہ اسے ہونا چاہیے... اور جیسا کہ سب ہوتے ہیں۔ .. سموئل نے داڑھی کھجلائی پھر یوں چپ ہوگیا جیسے ابھی غیر ارادی طور پر اس کے منہ سے جو بھی بول پھوٹے ہیں، وہ اس کے لیے شرمسار ہو۔۔۔ اس نے بھی دھیرے سے گردن ہلائی جیسے گہرے صدمے سے باہر نکلنے کا راستہ تلاش کر رہا ہو۔

اس نے کچھ سوچتے ہوئے دوبارہ گردن ہلائی۔ اور جیسے، آنکھوں کے آگے بہت کچھ روشن ہوگیا۔ ماں کے حمل سے نکل کر، آن میں کودتی پھاندتی تاڑ جتنی بڑی ہو جانے والی لڑکی.....

یہ لزا بار بار آنکھوں کے آگے کیوں منڈلاتی ہے۔ اور وہ..... ایک لاچار باپ... چھپ کیوں نہیں سکتا۔ نہیں دیکھیے اسے۔ ایک بار بھی۔ بچپن میں اچک کر کندھوں پر سوار ہو جانے والی، اچانک ہرنی کی طرح قلانچیں بھرتی ہوئی، کتنی ڈھیر ساری بہاروں کے ساتھ ہوا کے رتھ پر سوار ہوگئی تھی۔ نہیں لزا، یہاں نہیں۔ یہاں مت بیٹھو۔۔ یہاں میں ہوں نا... جاؤ اپنا ہوم ورک کرو۔ اپنے کمرے میں جاکر اسٹڈی کرو لزا۔ یہاں سے... یہاں سے جاؤ، پلیز۔۔۔ عمر کے پاؤں پاؤں چلتی ہوئی لڑکی کے بڑے ہوتے ہی باپ اچانک نظریں کیوں چرانے لگتا ہے۔۔۔ ہوٹل،

کلب، ریستوران کے ڈھیر سارے جانے انجانے لمس کے بیچ یہ رشتے کی نازک پتنگ اسے پریشان کیوں کر دیتی ہے۔ کیونکر دیتی ہے... کہ ایک باپ ہونے کے ناطے اسے سمجھانا پڑتا ہے خود کو... ایک اچھا سا لڑکا... ایک عمدہ آدمی..."

"یہ عمدہ آدمی کہاں بستا ہے... کہاں ملتا ہے۔ کیوں سموئل!"

سموئل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کسی اور سوچ میں گم تھا۔ عمدہ آدمی..... بہتر آدمی، بے لوث، بے غرض، مخلص، ہمدرد اور عمدہ آدمی۔ روانڈا کی سڑکوں پر بھی ایسے کسی آدمی سے اس کی ملاقات نہیں ہوئی۔ لندن، پیرس، برلن کی گلیوں میں بھی اس سے ایسا کوئی آدمی نہیں ٹکرایا۔ افریقہ کی سڑکوں پر بھی نہیں جہاں دھوپ سے جھلسے سیاہ فام چہروں پر اس نے بیٹیک کی نظم لکھی دیکھی تھی.....

"اس دھرتی پر،

ہم اپنے سفید دانتوں سے ہنستے ہیں۔

اس وقت بھی...

جب ہمارا دل لہولہان ہو رہا ہوتا ہے۔"

کمپالا (یوگانڈا) کے ہوٹل میں سیاہ فام نگونگی نے اس کے بدن سے کھیلتے ہوئے اچانک پوچھا تھا۔ سر، ایک لمحے کو سوچئے، اگر میں آپ کی سگی بیٹی ہوتی تو..... وہ بستر سے چھلانگ لگا کر اتر گیا تھا۔ ننگ دھڑنگ..... کانپ رہا تھا۔ نگونگی ایک بے شرم سفاک مسکراہٹ کے ساتھ اس کے بوکھلائے چہرے کو دیکھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی.....

"سموئل، ہم یہ کمینہ پن کیوں کرتے ہیں؟"

"ہم..... تھک جاتے ہیں سر..... تھک جاتے ہیں اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں سے پرے ہو جاتے ہیں..."

اس نے گہرا سانس کھینچا..... ٹھیک کہتے ہو..... ہم تھک جاتے ہیں..... اس جسم میں کتنی طرح کی لذتیں دفن ہیں سموئل؟ ہاں دفن ہیں..... اس نے پھر

سانس کھینچا...... کتنی طرح کی لذتیں..... کتنے ملکوں کی..... نرم، گرم اور..... ہم کچھ بھی نہیں دیکھتے..... یہ کہ چاروں طرف آگ لگی ہوئی ہے۔ اور ہم ایک غیر جسم سے چپکے ہوئے ہیں۔ کھیل رہے ہیں..... جب ہم اپنے گلاس میں اسکاچ انڈیلتے ہیں..... کاکروچ مارتے ہیں..... لوگ مر رہے ہیں..... ہر لمحہ..... ہندوستان میں..... پاکستان میں..... کوئی سا بھی ملک باقی نہیں ہے۔ جب ہم اپنی ٹائی درست کرتے ہیں..... لوگ مر رہے ہیں..... امریکہ، روس، جاپان، ویتنام..... ایٹم بم اور میزائلس سے باہر نکلو تو وہی ایک جسم آجاتا ہے..... لوگ مر رہے ہیں..... اور لوگ اپنی سگی بیٹیوں کے ساتھ.....

"یور آنر۔ بینک آگیا ہے۔"

مہنگے ہوٹل کی ایک رات اور ٹرائل

"اچھا، وہ کیا جرح کر رہا ہوگا سموئل! ذرا سوچو، اس کے پاس اپنے دفاع میں کہنے کے لیے کیا رہ جاتا ہے۔ اچھا ایک منٹ کے لیے مان لو..... وہ آدمی میں ہوں..... تم وکیل ہو، جج ہو یا کچھ بھی مان لو..... ماننے کو تو کچھ بھی مانا جا سکتا ہے سموئل..... یوں پاگلوں کی طرح مجھے مت گھور کر دیکھو..... مان لو..... اور سمجھ لو، ٹرائیل شروع ہوتا ہے..... اگر شروع ہوتا ہے تو کیسے.....؟"

یور آنر۔ سموئل نے کچھ کہنے کے لیے حامی بھری۔ اس نے روک دیا۔

نہیں۔ یہاں یور آنر تم ہو سموئل..... اور سمجھو مقدمہ شروع ہو چکا ہے۔ جیوری کے ممبر بیٹھ چکے ہیں۔

کٹہرے میں، میں کھڑا ہوں۔ ایک لاچار اپرادھی باپ، جس نے اپنی سگی بیٹیوں سے..... نہیں، مجھے یہ جملہ ادا کرنے میں دشواری ہو رہی ہے سموئل..... تاہم میں..... کہنا یہ چاہتا ہوں کہ.....

اس نے آنکھیں بند کیں۔ جیسے اپنے تمام تاثرات چہرے پر لاکر جمع کر رہا ہو۔

"ہاں تو میں..... ایک لاچار کمینہ باپ..... کسی ایک جبر و کشمکش کے لمحے کے ٹوٹ جانے کے دوران..... نہیں..... مجھے اعتراف ہے کہ وہ حوا کی کوکھ سے نہیں میرے خون سے نکلی تھی۔ جنی تھی۔ مجھے اعتراف ہے کہ نہیں، مجھے کہنے نہیں آ رہا..... اور کیسے آسکتا ہے..... آپ سب مجھے ایسے گھور رہے ہیں..... سب کی نگاہیں..... عیاشی کی اس سے بھدی مثال اور کمینگی کی اس سے زیادہ انتہا اور کیا ہو سکتی ہے۔ مجھے سب اعتراف ہے۔ مگر...... میں کیسے سمجھاؤں..... بس ایک جبر و کشمکش کے ٹوٹ جانے والے لمحے کے دوران....."

"آرڈر.... آرڈر.... ملزم جذباتی ہو رہا ہے۔ ملزم کو چاہیے کہ اپنے جذبات پر قابو رکھے۔" سموئل کے چہرے پر کٹھور تا تھی۔

"مور کھتا۔ ملزم جب وہاں اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ پایا تو یہاں..... خیر، میں کہہ رہا تھا..... میں پچھلے دنوں ویتنام گیا تھا۔ سیاحت میرا شوق ہے.... تو میں کہہ رہا تھا کہ میں ویتنام..."

"اس پورے معاملے کا ملزم کے ویتنام جانے اور سیاحت سے کوئی تعلق نہیں ہے....."

"میں مانتا ہوں می لارڈ ...... مگر جو واقعہ یا حادثہ ایک لمحے میں ہو گیا۔ ایک بے حد کمزور لمحے میں اس کے لیے مجھے ویتنام تو کیا، فلسطین، ایران، عراق، امریکہ روس، روانڈا سب جگہوں پر جانے دیجئے۔ میں گیا اور میں نے دیکھا.... سب طرف لوگ مر رہے ہیں..... مر رہے ہیں..... ہر لمحے میں..... جب ہم ہنستے ہیں، روتے ہیں، باتیں کرتے ہیں، قہوہ یا چائے پیتے ہیں۔ قتل عام ہو رہے ہیں..... لوگ مر رہے ہیں.....مارے جا رہے ہیں.....، سموئل نے ناگواری سے دیکھا۔ بیوقوفی بھری باتیں۔ کوری جذباتیت۔ اس کیس میں ایک ریپ ہوا ہے..... ریپسٹ ایک..... باپ ہے... جس نے اپنی .... کہیں تم گے (GAY) لیسبئن (LESBIAN) یا فری

کلچر کے حق میں تو نہیں ہو......؟

"نہیں۔ آہ، تم غلط سمجھے سموئل۔ اس نے گردن ترچھی کی۔ شاید میں سمجھا نہیں پا رہا ہوں......ابھی تم نے جن کلچرز کا ذکر چھیڑا، وہ سب دکھ کی پیداوار ہیں.....دکھ.... جو ہم جھیلتے ہیں.....یا جھیلتے رہتے ہیں... مہاتما بدھ کے مہا بھشکر من سے لے کر بھگوان کی آستھاؤں اور نئے خداؤں کی تلاش تک... پھر ہم کسی روحانی نظام کی طرف بھاگتے ہیں ..... کبھی اوشو کی شرن میں آتے ہیں..... کبھی گے(GAY) بن جاتے ہیں تو کبھی لیسبئن۔ قتل عام ہو رہے ہیں.....اور بھاگتے بھاگتے اچانک ہم شدبد کھو کر کنڈوم کلچر میں کھو جاتے ہیں.....ہم مر رہے ہیں سموئل۔ اور جو نہیں مر رہے ہیں وہ جانے انجانے ایچ۔ آئی۔ وی پازیٹیو(H.I.V POSITIVE) کی تلاش میں بھاگ رہے ہیں..."

"ہمارا ملزم اپنا دفاع نہیں کر پا رہا ہے۔ اس لیے مقدمہ خارج..."

وہ غصے سے سموئل کی طرف مڑا۔ ایک باپ پشیمانی کی انتہا پر کھڑا ہے۔ اور تم اسے اپنی بات مکمل کرنے کا موقع بھی نہیں دینا چاہتے۔ ویدک ساہتیہ کو لو۔ دھرم کے بعد کام کا ہی استھان ہے۔ موکش کا نمبر اس کے بعد کا ہے۔ گیتا میں کہا گیا ہے، شری کرشن سب جگہ ہیں..... انسانوں کے اندر وہ کا میچھا، کے روپ میں موجود ہیں۔ کھجوراہو، مندروں میں سمبھوگ کے چتر اس بات کے ثبوت ہیں کہ سمبھوگ پاپ نہیں ہے۔ اگر پاپ ہوتا، اپوتر ہوتا تو اسے مندروں میں جگہ کیوں کر ملتی سموئل؟

"بھیانک... بہت بھیانک..."

"مان لو کوئی کہتا ہے... فلاں چیز میری ہے... میں جو چاہوں کروں..... تم اس بارے میں کیا جواب دو گے سموئل... مثلاً کوئی کہتا ہے کہ بیوی میری ہے... بیٹی میری ہے... میں جو چاہے کروں..."

"بھیانک... بہت بھیانک..." سموئل کے چہرے کے رنگ بدل رہے تھے۔

"اور مان لو سموئل، دنیا ختم ہو جاتی ہے۔ بس ایک ایٹم بم یا اس سے بھی کوئی بھیانک ہتھیار... ویتنام کے شعلے تو سیگون ندی سے اٹھ کر آسمان چھو گئے تھے۔ مان لو، صرف دو ہی شخص بچتے ہیں اور دنیا کا سفر جاری رہتا ہے۔ ایک باپ ہے، دوسری۔ بیٹی..."

"بہت بھیانک.... سموئل چیخا۔ بس کرو... میں اور تاب نہیں لاسکتا..."

"وہ جبر دکشں مکش کا ٹوٹ جانے والا لمحہ اس سے بھی کہیں زیادہ بھیانک ہو سکتا ہے سموئل، ایک بچی.... چھوٹی ہے..... باپ اسے دلار کر رہا ہے..... پیار کر رہا ہے، بڑی ہوتی ہے.... اسکول جاتی ہے..... بیل کی طرح بڑھتی ہے..... کونپل کی طرح پھوٹتی ہے..... گاہے بہ گاہے باپ کی نظریں اس پر پڑتی ہیں..... وہ اس سے بچنا چاہتا ہے۔..... بچنے کے لیے وہ شادی کی بات چھیڑتا ہے..... وہ کئی کئی طرح سے اسے رخصت کرنے کی بات سوچتا ہے..... اور بس چھپنا چاہتا ہے.... بچنا چاہتا ہے۔ پھر ڈرنے لگتا ہے اپنے آپ سے.... جیسے ایک نئی صبح شروع کرنے والے اخبار، اور اخبار کی خون اگلتی سرخیوں سے..."

تم ایک گناہ کی وکالت کر رہے ہو۔ سموئل پھر چیخا۔

نہیں۔ اس نے جھرجھری بھری۔ جنگ ہمیں تباہ کر رہی ہے سموئل..... اور کنڈوم ہمیں اپنی طرف کھینچ رہے ہیں.....

وہ جیسے ہی چپ ہوا، کچھ دیر کے لیے دونوں طرف خاموشی چھا گئی۔

اختتام

معزز قارئین، اگر آپ اسے سچ مچ کہانی مان رہے ہیں تو اس کہانی کا اختتام بہت بھیانک ہے..... بہتر ہے آپ اسے نہ پڑھیں اور صفحہ پلٹ دیں۔

مذاکرہ ختم ہوا تو دونوں اپنے معمول میں لوٹ آئے.....

اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی..... بدلی بدلی سی مسکراہٹ..... سموئل،

ہر مقدمے کا ایک فیصلہ بھی ہوتا ہے.....میں سمجھتا ہوں، تمہیں فیصلہ ابھی اسی وقت سنانا چاہیے...

یس یور آنر..... سموئل بے دردی سے ہنسا۔ ذرا توقف کے بعد اس نے ایک بوتل کھول لی۔ اس کی طرف دیکھ کر بولا.....دو پیگ بناؤں یور آنر.....

"فیصلہ کا کیا ہوا.....؟" اس کی آنکھوں میں مدہوشی چھا رہی تھی.....

سموئل نے دو پیگ تیار کر لیے۔ پھر جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک چیز نکالی۔ وہ اسے دکھا کر مسکرایا...یہ امریکن کمپنی کا بنا ہوا کنڈوم کا پیکٹ تھا...وہ مسکرایا..... تو یہ ہے فیصلہ یور آنر...وہ آچکی ہے... آواز لگاؤں..."

"تم ایسے ہر معاملے میں، بہت دیر کرتے ہو سموئل... کہاں ہے وہ...؟"

اس نے گلاس ٹکڑائے..... سموئل نے دروازہ کی طرف دیکھا۔ منہ سے سیٹی بجانے کی آواز نکالی۔ اسی کے ساتھ دروازے سے ایک لڑکی برآمد ہوئی.....

معزز قارئین! ذرا ٹھہرجائیے۔ اس انجام کے لیے میرا دل سو سو آنسو رو رہا ہے مگر..... اس لڑکی کو آپ بھی پہچانتے ہیں...!

○○

آجکل ---- ۹۶ء

آجکل۔ کتھا انعام یافتہ۔ ۹۶ء

ہنس (ہندی)--- ۹۶ء

باہر کا ایک دن

اس سے میرا تعلق دوسرے درجے کا تھا، لیکن اس میں چونکنے جیسی کوئی بات نہیں ہے۔ دراصل ہم میں سے زیادہ تر لوگ چہرے پر ایک خاص طرح کا ملمع چڑھائے رہتے ہیں، لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ ٹائی اور سوٹ کے باوجود اس کے چہرے پر ایسا کوئی ملمع نہیں ہوتا تھا، جسے کسی قدر پڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے میں مطمئن ہونا چاہتا تھا..... کہ ہونہ ہو، یہ بھی ہماری ہی قبیل کا ہے۔ وہ دوسروں سے بہت مختلف تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر کبھی بشاشت نہیں دیکھی۔ وہ کبھی خود پر مصنوعی خوشی تھوپنے کی کوشش بھی نہیں کرتا تھا۔ وہ جیسا تھا، بس ویسا ہی میرے سامنے ہوتا۔ اور اپنی کہانیاں لے کر بیٹھ جاتا۔

"میں رفتہ رفتہ مر رہا ہوں۔ حالانکہ مرنے کا مجھے کوئی شوق نہیں۔ مگر مجبوریاں، قرض اور چڑچڑی بیوی کی وہی پرانی جھڑکیاں ...۔ ایسا نہیں تھا کہ اس نوع کے مکالمے ادا کرتے ہوئے اس کی آنکھیں جھکی ہوتیں یا ندامت کے احساس سے کوئی بوجھل پن اس پر سوار ہوتا۔ نہیں، وہ انتہائی غور سے میرے چہرے کا تاثر پڑھ رہا ہوتا یا پھر پوچھ بیٹھتا..... "میری جیب میں گھر جانے تک کا بس کا کرایہ ہے۔ جلیبیاں کھلاؤ گے۔ بولو؟"

جلیبیاں، گرم گرم رس میں ڈوبی ہوئی جلیبیاں اسے بے حد پسند تھیں۔
بس ایک یہی لمحہ ہوتا جب وہ اپنے خول سے باہر نکل کر مسکراتا تھا۔۔۔۔ ہاں مزے کی
ہیں، اور میرا خیال ہے کہ جلیبیوں سے عمدہ کوئی چیز ہو ہی نہیں سکتی۔ تمہارا کیا خیال
ہے؟

وہ جب بھی ملتا، اس کی زبان پر بس دکھ کے تذکرے ہوتے۔ اپنی دو سال کی
دوستی میں، میں نے اس کے منہ سے دکھ کے سوا کبھی کوئی دوسری بات نہیں سنی
حالانکہ سوٹ اور ٹائی میں اسے دیکھ کر، دور سے یہ کہنا مشکل تھا کہ دکھ اس طرح کسی
پاپ (POP) گانے والی رقاصہ کی طرح اس میں متحرک ہوگا، مگر یہ سچ تھا۔۔۔۔۔۔ مل
بیٹھنے کے دوسرے ہی لمحے دکھ کے موتی اس کے ہونٹوں سے کسی آبشار کی طرح
پھوٹ بہتے تھے اور میں۔۔۔۔۔ اس درد بھری موسیقی میں اس لذت کے ساتھ ڈوب جاتا
تھا کہ اپنی چھوٹی چھوٹی حقیر خوشیوں اور چھوٹی چھوٹی کامیابیوں کے ذکر میں دکھ کے
کسی نہ کسی پہلو کو نکال لیتا۔

میں نے غور کیا تو پتہ چلا کہ یہ کیفیت میرے ساتھ پہلے نہیں تھی۔ بلکہ ادھر ہوئی
تھی، یعنی اس سے ملنے کے بعد۔ وہ ہر بار دکھ کے ایک نئے انجکشن کو اس خوبصورتی سے
مجھ میں پیوست کر دیتا تھا کہ پتہ بھی نہ چلتا۔ ہاں بعد میں پتہ چلتا کہ ارے میں کتنا دکھی
ہوں یا وہ مجھے کس قدر دکھی کر گیا ہے۔۔۔۔۔۔

دراصل حقیقت یہ ہے کہ ملنے ملانے کے معاملے میں ہم ایک دوسرے سے
اپنی اصلیت چھپا کر ملتے ہیں۔ اپنے بہت قریبی دوستوں اور شناساؤں سے بھی۔۔۔۔۔
خود کو چھپانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہوئے، چہرے پر مسکراہٹ کا ماسک لگائے۔
ہونٹوں پر دبیز خوشی، آنکھوں میں "سینس آف ہیومر" کی معنی خیز چمک چھپائے، جادو
بھرے لفظوں کی قلابازیاں دکھاتے۔۔۔۔۔ جو صرف باہر ہی جنم لیتے تھے۔ اور اندر کے دکھ
کو جیسے کسی جنکشن پر کچھ دیر کے لیے ٹھہرا دیتے تھے۔۔۔۔۔۔ اس لیے جب بہت زیادہ اس
سے اپنے تعلق کے بارے میں غور کرتا تو بس یہی پاتا۔۔۔۔۔۔ یہ تعلق بہت عام سا نہیں

ہے۔ یہ پہلا آدمی ہے جو میرے بارے میں اندر کی سب خبریں رکھتا ہے۔ اور جس کے بارے میں مجھے بھی سب پتہ ہے...... یا یوں کہنا بہتر ہو گا کہ ہم دونوں ہی، اپنی اپنی دکھوں کی کہانیاں ایک دوسرے کے سامنے کھول چکے ہیں۔

اس دن وہ اچانک ہوا کی تیزی کی طرح، لہراتا ہوا میرے سامنے پسر گیا.......

"سنو، آج میری اداسی کی دوسری سالگرہ ہے۔" وہ سنجیدہ تھا........ "تم ساتھ دو تو میں اسے سی لیبریٹ کرنا چاہتا ہوں......"

"اداسی کی دوسری سالگرہ؟"

"ہاں، وہ بغیر کسی ذہنی دباؤ کے بولا....... "آج سے دوسال پہلے میں اسی دن بیکار ہوا تھا۔ دوسال" وہ چبا چبا کر بولا...... "دوسال میں مزدور سو جگہ کام ڈھونڈ لیتے ہیں کاریگر ایک دکان چھوڑتے ہیں دوسری جگہ پکڑتے ہیں۔ ہر پیشہ میں یہ سہولت ہے۔ مگر میں پورے چھ فٹ کا آدمی۔ عمر پچاس سال۔ میری ڈس کوالیفیکیشن یہ ہے کہ میں ساہتیہ اور پتر کاریتا سے جڑا چڑی مار ہوں۔ اس لیے میرے لیے کوئی جگہ نہیں......"

وہ ٹھہرا تو مجھے احساس ہوا......وہ کچھ زیادہ ہی اداسی کی گرد پھیلانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نے اسے اوپر سے لے کر نیچے تک دیکھا۔ پھر کہا........

"دراصل اس کے ذمے دار خود ہم ہوتے ہیں۔"

"کیسے؟" اس نے میز پر پڑا پیپر ویٹ اٹھالیا۔ مجھے ڈر بھی لگا، سنک میں ایسے لوگ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ پھر جذباتی ہونے کا ماسک چڑھالیں گے۔ انٹلکچول جذباتی......

"ہم بہت آگے نہیں دیکھتے۔ صرف خوش فہمیوں پر بھروسہ کرتے ہیں اور ایک دن کنگال ہو جاتے ہیں۔"

"خوش فہمیوں پر بھروسہ........ "اس نے لفظ چبائے کچھ بولا نہیں۔

"میں نے پھر کہا........ "ہم آنے والے دکھ کو پہلے سے کیوں نہیں محسوس کرتے۔ دراصل ہماری لائن، کے زیادہ تر لوگ زندگی کے معاملے میں دور اندیش نہیں ہوتے۔ یعنی گھر بکھر جاتا ہے۔ اور گھر کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بھی جرم کا احساس

کھائے جاتا ہے۔'

اس نے میری طرف ایسی نظروں سے دیکھا جیسے میرے پوشیدہ دکھ کو دیکھ کر اس کی حوصلہ افزائی ہوتی ہو۔

وہ بولا۔ "کہتے رہو مجھے اپنا عکس نظر آرہا ہے۔" میرے ہونٹوں پر جھنجھناہٹ تیر گئی۔۔۔۔۔ چور چور کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ اداس آدمی اپنے ہی جیسے آدمی کا ساتھ پاکر۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اگر کچھ ہے بھی تو وہ اسے کیوں مل کر بانٹنے کا متمنی ہوتا ہے؟۔"

اس نے پیپرویٹ رکھ دیا۔ کرسی سے بوجھل سا کھڑا ہو گیا۔ مجھے لگا، اب وہ بغیر بولے اداسی کے خالی رستوں پر لوٹ جائے گا مگر وہ گیا نہیں۔ کھڑا کھڑا کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر ویسے ہی خالی خالی دیوار کی طرف دیکھتا ہوا کہنے لگا۔

"میں وائرس ہو گیا ہوں۔۔۔۔۔۔ وائرس۔۔۔۔۔ کمپیوٹر میں فیڈ میموری کو تباہ کرنے والا وائرس۔۔۔۔ میں خود نہیں جانتا، میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا ہے؟ میں اس مسئلے پر زیادہ نہیں سوچ سکتا۔ مجھے اپنا آپ بھاری لگنے لگتا ہے۔"

وہ آگے بڑھا تو دفتر کی سیڑھیوں پر رکھے، بونسائی کے پودے والے گملے سے ٹکرا گیا۔

میں نے سوچا۔ انسان سمٹتے سمٹتے کتنا سا ہو گیا ہے۔۔۔۔۔ دو سال سے وہ بیکار تھا۔ دو سال۔۔۔۔۔ گھر کی ذمہ داریاں پانے والے اس کلاس کے لوگوں کے لیے دو سال تو کیا، دو ماہ بھی قیامت سے کم نہیں ہوتے۔ اس سے پہلے اس کے پاس سب کچھ تھا۔ ایک اچھا خاصہ فلیٹ، ایک اچھی سی بیوی، ایک پیاری سی ہوا کے دوش پہ سوار بچی، اور ایک شاندار آفس۔۔۔۔۔ آفس میں اس کا علیحدہ کیبن تھا۔ کیبن میں قیمتی کارپیٹ اور خوبصورت صوفے کے ساتھ وہ سب کچھ تھا جسے دیکھتے ہی ایسے رتبے والے شخص کی قسمت پر رشک کرنے کو دل چاہتا ہے۔ مگر سکسینہ کو کامیابی اور ترقی کے اس زینے پر چڑھنے میں برسوں لگے۔ پورے ۴۳ برس۔۔۔۔۔۔ ان ۴۳ برسوں میں چھوٹی چھوٹی تنگ،

اوبڑ کھابڑ سیڑھیوں سے چڑھتے اترتے، پتھریلی چٹان سے موم جیسا نرم اور لچیلا بنانے میں برسوں لگے تھے۔ لیکن جہاں جہاں وہ سمجھوتہ کر سکتا تھا، بیوی نہیں کر سکتی تھی۔ سکسینہ اور مسز سکسینہ کی زندگی میں دراڑ یہیں سے نمایاں ہوئی...... پہلے کرائے کا چھوٹا سا کمرہ تھا، حبس گھٹن اور کراہیت سے بھرا، جیسے جیسے وقت پھرا، رہائش ہوا دار اور آرام دہ ہوتی گئی۔ خاص کر انڈین آبزرور کے شاندار آفس کو جوائن کرنے کے بعد۔ یہ ایک بڑے گروپ کا ہفتہ وار ہندی اخبار تھا، جہاں اسے دفتر کی طرف سے ایک خوبصورت مکان الاٹ ہوا تھا۔

نکیتہ اور مادھوی یہاں آکر ایسے خوش تھے جیسے ان کو ریل گاڑی کے تھرڈ کلاس ڈبے سے اٹھا کر پلین میں بیٹھا دیا گیا ہو۔ اس خوشی کو پچانے، میں اچھا خاصہ وقت لگا۔ تب سکسینہ کو آبزرور گروپ کی طرف سے ہینڈسم سیلری بھی ملتی تھی اور ایک نیلے رنگ کی جیپی کار بھی ملی ہوئی تھی۔

سکسینہ نے اس بارے میں بتایا تھا ....."جیسے ایک سپنا آیا تھا۔ ایک بہت سندر سجیلا سپنا۔ اور آنکھ کھل گئی۔ سات سال صرف سات سال کا سپنا تھا۔ آبزرور کی نوکری..... آبزرور بند ہو گیا۔"

میٹرو سٹی کی ہلچل رک گئی۔ آبزرور..... شاندار کیبن میں دانتوں تلے دبی سگار کو بجھے ایک زمانہ ہو گیا۔ دراصل اس پیشے میں کرسی پر بیٹھنے اور کرسی کھسکنے کے بیچ بس قسمت کی دھند ہوتی ہے.....

آبزرور کا بند ہونا ایک ایسا ڈراونا خواب تھا، جس کی دہشت سے کچھ نہ بچ سکا۔ گھر، کار اور آرام۔ سب کچھ بوتل والے جن نے واپس لے لیا۔ کہ بھیا بہت ہو گیا۔ میں تو چلا بوتل میں......"

سکسینہ نے ٹھنڈا سانس بھرا..... تو جن چلا گیا بوتل میں اور علاء الدین کو دھکے کھانے کے لیے چھوڑ گیا۔"

"آبزرور کے بعد کہیں اور کوشش نہیں کی؟"

میرا سوال سننے کے بعد کچھ وقفے تک وہ خاموش رہا۔ چہرے پر ایسے ہاتھ پھیرتا رہا جیسے عمر کی جھریاں گن رہا ہو پھر کہنے لگا۔ "۱۵ سال۔ تب میں ۱۵ سال کا ہو چکا تھا۔ انرجی کم ہو چکی تھی۔ زیادہ دوڑ بھاگ نہیں کر سکتا تھا۔ دراصل ایسے تھک گیا تھا جیسے مجھ پر فالج کا حملہ ہو گیا ہو۔"

وہ ٹھہر ٹھہر کر کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔۔۔۔۔۔ "اس دن پورے آفس میں گرما گرمی کا ماحول تھا۔ سب تیز تیز آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ میں دھم سے اپنے چیمبر کی کرسی پر کسی بے ہوش کی طرح گر پڑا۔ کنپٹی جل رہی تھی۔ پھر میں ٹھہرا نہیں۔ تیز تیز چلتا ہوا مسٹر سبرتو۔ کے کمرے میں آ گیا۔ یہ وہی شخص ہے جو آبزرور گروپ کا پرنٹر، پبلشر اور مالک تھا۔ اس وقت وہاں کمرے میں ایڈیٹر اور مینجمنٹ کے ساتھ اس کی بیٹھک چل رہی تھی۔ میں دھڑدھڑاتے ہوئے کمرے میں داخل ہو گیا۔ میں اتنے غصے میں پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ مجھے لگا میں سبرتو کا گلا پکڑ لوں گا۔ لیکن اس حد تک میں خود پر کنٹرول کرنے میں کامیاب رہا۔ لیکں غصے میں بھری ہوئی تیز آواز پر قابو نہ رکھ سکا۔ مجھے یاد ہے میں ہوش گنوا کر چیخ رہا تھا۔

"مسٹر سبرتو۔ سات سال۔۔۔۔۔ سات سال تک آپ کو اخبار چلانے کا کیا حق تھا۔ جب بند ہی کرنا تھا تو آپ نے نکالا کیوں۔۔۔۔۔ نہیں مارنے سے پہلے آپ اپنے شکار کو موٹا کرنا چاہتے تھے۔ کچھ لوگوں کا یہ بھی شوق ہوتا ہے۔ آپ نے بھی یہ شوق پورا کر کے دیکھ لیا۔۔۔۔۔۔ مجھے کھینچ کر ہٹانے کی کوشش کی گئی تو میں پھر گلا پھاڑ کر چلایا۔ سات سال پہلے ہی آپ کا ارادہ بند کرنے کا ہو گا مگر آپ اخبار کو سیاسی مہرہ بنا کر اپنا کام نکالنا چاہ رہے ہوں گے۔ میں آپ کو چھوڑوں گا نہیں مسٹر سبرتو۔۔۔۔۔۔"

مسٹر سکسینہ۔ مجھے یاد ہے میرے کلیگ نے مجھے ریلیکس کرنا چاہا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ میں غصے سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔۔۔۔۔۔۔"

"آپ بتا سکتے ہیں ہم کہا جائیں گے۔ آپ کے گودام اور آپ کے چپراسیوں والے کوارٹر میں بھی ہمارے لیے کوئی جگہ نہیں ہو گی۔"

"مسٹر سبر تو، پہلی بار سبر تو نے نارمل ہو کر مسکرانے کی کوشش کی تھی......

جرنلزم میں اتار چڑھاؤ تو آتے رہتے ہیں۔ اب آپ کوئی اردن شوری اور ایم۔ جے اکبر تو ہیں نہیں۔ سمجھ رہے ہیں نا......وہ دھیرے دھیرے جملے چپا رہا تھا۔ ہم فرسٹ ایشو سے ہی لاس میں آ گئے تھے۔ لاکھوں روپے کے دباؤ میں۔ یہ ہمیں جانتے ہیں کہ ہر ایشو میں لاکھوں کا گھاٹا برداشت کرتے ہوئے سات سال تک ہم اسے کیسے نکالتے رہے۔ سات سال تک آپ نے ہمارے یہاں کام کیا...... تنخواہ، بونس، پرکس، کبھی آپ کو تکلیف ہوئی"

"وہ مسکرا رہے تھے......"

مجھے لگا۔ میری حیثیت خشکی پر تڑپتی مچھلی سے زیادہ نہیں تھی۔ جسے مچھیرے نے اچانک جال سے نکال کر زمین پر پھینک دیا ہو۔ میری آواز لڑکھڑائی۔ ہونٹوں پر لعاب سمٹ آیا۔ زبان میں لکنت آ گئی۔ مجھے لگا، میں کہہ نہیں پاؤں گا...... تم کو ہمت کیسے ہوئی، اتنا لمبا سپنا دکھانے کی......"

"پھر اتنا یاد ہے، ریس میں ہارے ہوئے۔ تھکے ہوئے گھوڑے کی طرح میں کیبن سے باہر نکل گیا۔"

"اتنا لمبا سپنا۔" سکینہ نے گہرا سانس بھرا۔ میری عمر لڑتے لڑتے ہار گئی تھی۔ میری جگہ شاید کوئی دوسرا ہوتا تو ابزرور کے بعد اس کے برابر کا جاب پا سکتا تھا۔ مگر...... فرینڈ، میں تھک چکا تھا۔ بس ایک ہی بات بار بار محسوس ہو رہی تھی۔" اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔

"فرینڈ...... غور کرو...... ہم بھی مر رہے ہیں اور ادب بھی مر رہا ہے...... دیکھو...... دو سال میں کتنے بڑے بڑے گروپس نے اس میڈیا سے ہاتھ کھینچ لیے...... ان کی میگزینس، اخبارات بند ہو گئے......" وہ اپنی دھن میں کہتا جا رہا تھا...... "قلم، کتابوں سے اکتائی ہوئی پیڑھی کے جنم داتا ہوں گے ہم...... مجھے لگتا ہے آگے چل کر اکٹھے میں ان سب کا بدلا لوں گا...... کہ سالے سبر تو...... تیرے لڑکے روپیوں میں

کھیلیں گے اور لڑکیوں میں "او نگھیں" گے۔ تیرے بچے کتابوں میں زندگی تلاش کرنے کی لافانی خوشیوں سے محروم رہیں گے۔ وہ کیڑے مکوڑوں سے بدتر ہوں گے.....اور دیکھ لینا.....ان سب کو ایڈز ہو گا.....ایڈز ہو گا"

سکینہ نے جماہی لی.....نظریں جھکالیں.....بولنے کا سلسلہ ابھی جاری تھا.....

"اس دن گھر کا راستہ بہت لمبا لگا تھا۔ جیسے دفتر اور گھر..... ایک ہندوستان ہو اور دوسرا امریکہ۔ میں گھر پہنچا تو گھر کی ساری چیزیں ناچ رہی تھیں۔ بیٹی۔ ٹی۔ وی پر جھکی تھی۔ بیوی واشنگ مشین میں گندے کپڑے ڈال رہی تھی۔ وارڈروب سے لے کر فریج، کارپٹ، صوفے.....میں ہر چیز کو استعجاب کے دھندلکے سے دیکھ رہا تھا۔"

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو طبیعت خراب ہے؟" بیوی نے پوچھا تو جیسے چندرما سے گرہن ہٹا ہو۔

"اخبار بند ہو گیا....."

برف کی سل دو حصوں میں منقسم ہو گئی..... نہ چیخ ابھری، نہ گونج ہوئی .... ایک ٹھنڈی سی وحشت کے جھونکوں کی طرح اندر سما گئی.....میں نے دیکھا..... اس کی آنکھوں میں گہری نفرت اور حقارت تھی...... جیسے وہ روئیں جھڑے گلی کے کسی پلے کو تک رہی ہو۔

"بند ہو گیا.....؟" پھر سوال ابھرے ..... یہ چیزیں ..... ان سب کا کیا ہو گا؟ قسمت کی دکان میں تالہ لگ گیا۔ سب چیزیں دکان کے اندر ہی رہ گئیں۔

اس کا منہ پھلانا واجب تھا جبکہ گلے شکوے میں بھی کر سکتا تھا۔ مگر میں گونگا تھا۔ اس لیے نہیں کہ مجھے بولنا نہیں آتا تھا۔ اس لیے کہ میری حیثیت ہارے ہوئے کھلاڑی کی سی تھی۔ ہاں، میں پوچھ سکتا تھا کہ ان سات برسوں میں جو اس گھر میں عیاشیاں ہوئی ہیں کیا وہ روکی نہیں جا سکتی تھیں یا ان عیاشوں کو کم نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سات ہزار کی سیلری میں اگر پیسے نہیں بچے، بینک بیلنس نہیں رہا تو یہ کس کا قصور ہے؟ ان سات برسوں میں پچھلی غریبی کا کچھ اس طرح مذاق اڑایا گیا کہ اسے قیمتی نمائشی چیزوں

سے ڈھکنے کی کوشش کی گئی۔ کار پر گھومنا، سیر سپاٹے، دوستوں رشتے داروں میں رنگ جمانا۔ دعوتیں، پارٹیاں ان سب کے لیے تو سات ہزار بھی کم تھے......"

سکسینہ مدھم ہوا...... فرینڈ سچ بتانا، آج میں جیتے ہوئے ہم آنے والے کل کو کیوں فراموش کر دیتے ہیں؟"

"اس نے پھر بیقراری سے کہا۔ "سوچتا ہوں تو باطن میں سناٹا اتر آتا ہے...... مجھے لگتا ہے، میں جنم سے تنہا ہوں...... مجھے کسی نے پیدا نہیں کیا بلکہ بے حیا پودوں کی طرح ناجائز طور پر خود ہی اگ آیا....... میرا کوئی نہیں۔ باپ، ماں، بیوی، بچے ....سب اچھے دنوں کے ساتھی ہیں۔ میں نے ان کے لیے خواہش، خواب اور ارمانوں کی چھوٹی چھوٹی سیپیاں جمع کی تھیں........ ان سیپیوں کو جمع کرنے میں برسوں لگے تھے...... اب لگتا ہے ایک پوری زندگی ایسے لوگوں کے لیے وقف کر دینے کا مجھے کیا حق تھا........"

سناٹے کے آتش دان میں جیسے کوئی دہکتا ہوا انگارہ رکھ دے۔

وہ بولتے بولتے چپ ہو جاتا تو لگتا....... میرے اندر بھی آتش دان سلگ گیا ہے......

وہ چپ ہوتا، تو مجھے احساس ہوتا کہ اب میری باری ہے........ اور پہلے درویش کے قصے کے بعد دوسرے درویش کو بھی اپنے فرض کی ادائیگی کرنی ہے........ اب میرے دکھوں کے باہر نکلنے کی باری ہے.........

مجھے لگا..... دکھ، اسٹور میں بکھری چیزوں کی طرح میرے اندر بس یوں ہی پڑے رہتے تھے، باہر نہیں نکلتے تھے...... باہر نکلنے والا آدمی خوش مزاج، ہنس مکھ اور شان سے بھرا ہوتا تھا....... مگر۔ دادی اماں /بچپن میں/ ایک انوکھی چڑیا کی کہانی سنایا کرتی تھیں جو نمی میں ہی اپنا گھونسلہ بناتی تھی۔ دادی اماں اچانک دکھ اوڑھ کر کہتیں........ دکھ بھی بس ایسے ہی چپکے سے دل میں اپنا گھونسلہ بنا لیتا ہے........"

سکسینہ سے ملنے سے پہلے مجھے پتہ نہیں تھا کہ میرے دل میں بنا گھونسلہ اتنا بڑا ہو

چکا ہے۔ جہاں چڑیوں کے پنکھوں اور گھاس پھوس کے تنکوں جیسے انیک دکھ پڑے ہیں۔

پہلے میں صرف سنتا تھا مگر دھیرے دھیرے مجھے احساس ہوا، اندر بہتی ندی میں سکسینہ نے پتھر اچھا کر ہلچل سی مچادی ہو.......

پھر دھیرے دھیرے میں بھی اس کے سامنے کھلنے لگا.......

میں نے اسے بتایا...... دکھ نام کی چڑیا میرے پاس بھی ہے.....

میں نے اسے بتایا...... کہ خاموشی نام کا ایک تارا ہوتا ہے....... جو کبھی کبھی قہقہوں کی بھیڑ میں بھی چمک جاتا ہے۔ اور اداس کر جاتا ہے...... اور کبھی کبھی تنہائی میں اتنا تاریک ہو جاتا ہے کہ .... آسمان پر بھی اس کی موجودگی ڈراونی لگنے لگتی ہے.......

میں نے اسے بتایا...... کہ یہاں بھی ایک گھر ہے کرائے کا...... ایک بیوی ہے....... جو سمجھوتہ کرتے کرتے دکھی اور چڑچڑی ہونے لگی ہے۔ ایک چھوٹا سا بچہ..... ایک دفتر ہے....... اور دفتر میں ملی ایک ایسی ہی میز ہے جو کبھی بھی کھسکائی یا کھینچی جا سکتی ہے.....

میں نے اسے بتایا...... کہ ہم اخباری لوگ ہیں...... حقیقت سے زیادہ فرضی...... ڈر اور خوف میں جیتے ہوئے کیڑے، ورثے میں ملی ہوئی ایک زندگی بھی جس سے سنبھالی نہیں جاتی......

پھر میں نے اس سے پوچھا...... کہ اتنا دکھ کیوں ہے..... پہاڑ جیسا دکھ....... بدلی جیسی دھند اور اندھیرا...... آندھی جیسی آفت اور سمندر جتنا جوار بھاٹا.......

☆☆☆

پھر کئی دن گزر گئے...

یہ سلسلہ دراز ہوتا رہا۔ ہم ملتے اور اپنے اپنے دکھوں کی پوٹلی لے کر بیٹھ

جاتے......

پتہ نہیں، یہ اس سے لگاتار ملنے کا اثر تھا، یا کیا تھا کہ کئی دنوں سے بڑے عجیب عجیب خواب آرہے تھے۔ گھر میں کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا، میری بیوی ان باتوں کا نوٹس لے رہی ہے لیکن کچھ بول نہیں پا رہی ہے..... وہ دیکھ رہی ہے..... میرے چہرے پر ریکھائیں کھنچی ہوئی ہیں..... بچے کو دیکھ کر بھی میرے چہرے پر مسکان نہیں بکھرتی..... لیکن شاید وہ پوچھتے ہوئے ڈرتی ہے.....

ہاں، ان خوابوں کی تفصیل تو میں آپ کو بتانا بھول ہی گیا..... ایک کتا ہے جسے روئیں جھڑنے کی بیماری لگ گئی ہے..... وہ کلکلاتا ہوا دروازے دروازے مارا مارا پھر رہا ہے...... ہر دروازے سے اسے پتھر مار کر بھگا دیا جاتا ہے..... کبھی کسی دروازے پر بیٹھ کر وہ منحوس آواز میں رونا شروع کر دیتا ہے...... کتے کا چہرہ..... میرے اندر اچانک سرایت کر جاتا ہے.....

پھر میں دیکھتا ہوں استاد پانگلوس (والیٹر کی مشہور زمانہ کتاب کاندید کا ایک کردار) میرے برابر میں کھڑے ہیں..... اور اس واقعے کو اس طرح درست ثابت کر رہے ہیں کہ معلول بغیر علت کے نہیں ہوسکتا.....

"مگر کیوں نہیں ہوسکتا؟"

چونکہ آدمی ہے، اس لیے دکھ بھی ہے..... دکھ اسی لیے ہے کہ آدمی ہے..... آدمی نہ ہوتا تو دکھ کبھی نہ ہوتا....."

"مگر میری طرح سارے تو دکھی نہیں ہیں....."

دکھی سارے ایک طرح کے ہوتے ہیں۔ چونکہ ہر ایک کو سامنے والے کا دکھ پتہ ہے، اسی لیے تسلی ہے کہ وہ دکھی ہے تو سامنے والا بھی دکھی ہے....."

یعنی دکھ....."

استاذ پانگلوس مسکراتے ہیں..... کوئی معلول بغیر علت کے نہیں ہوسکتا.....

ایک صبح اسی خواب سے میں بیدار ہوتا ہوں تو بیوی میرے چہرے کو دیکھ کر

پوچھتی ہے...... طبیعت خراب ہے؟"

میں جواب دیتا ہوں..... "نہیں"

وہ خفا ہوتی ہے ...... "تو پھر یہ ہر وقت چہرہ کیوں لٹکائے رہتے ہو، ہنستے بولتے کیوں نہیں؟"

میں دھیرے سے کہتا ہوں...... ایک اداس آدمی سے مڈبھیڑ ہو گئی ہے، اس لیے....."

وہ رات میں مجھے خوش کرنے کے سینکڑوں حیلے کرتی ہے..... مگر وہی دکھ، وہی اضطرابی کیفیت، وہی رات، وہی کتا اور وہی استاد پانگلوس......

میری بیوی، ابھی ابھی جس سے آپ کا تعارف ہوا ہے، زینی کا تعارف ابھی تک جان بوجھ کر میں نے صیغہ راز میں رکھا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ زینی کا تذکرہ میں کرتا ہی نہیں، اگر وہ خوشگوار سا واقعہ یا حادثہ نہ ہو جاتا......

خوشگورا حادثہ...... اس دن صبح، بہت مسکراتے چہرے کے ساتھ وہ مسہری پر بیٹھ گئی۔ پھر چائے کا کپ میری طرف بڑھایا..... ہولے سے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔

پھر اس نے پوچھا...... "سچ مچ پریشان ہو۔" وہ ہنسی..... "چہرے پر جھریاں جمع کرنے کا شوق تو نہیں ہو گیا؟"

"جھریاں"

ذرا گنو تو سہی، چند دنوں میں ہی کتنے بوڑھے لگنے لگے ہو۔ اپنے تمام دوستوں سے زیادہ بوڑھے....."

وہ پھر ہنسی..... کچھ بتاؤ گے کہ کیا بات ہے؟"

پہلے سوچا انکار کر دوں ..... پھر دھیرے دھیرے ساری باتیں پھٹے کپڑے سے آنسو کی طرح گرتی گئیں۔

زینی سنتی رہی۔ سن کر مسکرائی۔ پھر بولی...... "چلو..... پہلے غسل کرلو......
تب تک میں ناشتہ لگاتی ہوں۔ اور ہاں..... میرا حکم ہے..... آج دفتر نہیں جاؤ گے...."
اس نے جاتے جاتے مڑ کر کہا..... "میرا حکم ہے۔" اتنا کہہ کر وہ اس بے نیازی سے کندھے جھٹک کر نکلی کہ میں چونک گیا۔ زینی مجھے شادی کے دوسرے روز والی زینی کی طرح کھلی کھلی لگ رہی تھی.....

میں نے چائے پی......

اس درمیان وہ لگاتار مجھ پر بچھی بچھی رہی۔

میں نے غسل کیا۔ دھلے ہوئے کپڑے پہنے۔ وہ ناشتہ لے کر تیار بیٹھی تھی۔

"سنو آج میں کھلاؤں گی۔" وہ پھر قریب آ گئی۔

بچے کے رونے کی آواز سن کر وہ ذرا دیر کو مچلی...... "بیٹا اٹھ گیا۔ جا کر لے آؤں؟" اس کا ہاتھ جھوٹے نوالے سے خراب ہو رہا تھا...... مسکراتے ہوئے نوالہ اس نے میرے ہاتھوں میں پونچھ دیا...... دو ایک نوالے میں نے خود توڑے اس درمیان زینی بیٹے کو لے کر آ گئی...... بیٹا اب چپ تھا..... اس کی گود میں مچلتا ہوا مسکرا رہا تھا.....

آنکھوں میں چمک لاتی ہوئی زینی بولی۔ آج چلونا باہر باہر گھومتے ہیں..... موڈ ہو گا تو فلم بھی دیکھیں گے....."

اس دن، پورا دن میں نے وہی کیا جو زینی نے چاہا۔ اس نے گھر سے باہر نکلتے ہوئے وہی امریکن جارجٹ کی ساڑی نکالی جو اسے ناپسند تھی لیکن مجھے بے حد پسند تھی...... وہی نیل پالش اور آئی برو استعمال کیا جو مجھے اچھا لگتا تھا..... بچے کو خوب صورت کپڑوں میں لپیٹا۔ پرس لٹکایا۔ اور بولی...... "چلو......"

پھر سارا دن گزر گیا.... ہم نے فلم بھی دیکھ لی..... خوشگوار بے حد خوشگوار دن کاٹ کر ہم گھر آ گئے۔

رات ہو گئی۔ کھانے پینے سے فارغ ہو کر زینی کمرے میں آ گئی۔ دروازہ بند کر

لیا۔ پھر بہت پیار سے بولی۔

"چلو۔ آج نائیٹی نہیں پہنوں گی۔" وہ ہنسی۔۔۔۔ ساڑی چور ضرور ہو جائے گی مگر آج اسی ساڑی میں تمہارے پاس رہوں گی....."

وہ اور قریب آ گئی۔ دھیرے سے میرے ہونٹوں کو چھوا۔ پھر بولی۔

"کیا اب بھی میں بری لگ رہی ہوں.....اتنی جتنی تم ذکر کیا کرتے تھے....."

میرے چونکنے پر وہ کھلکھلا کر بچوں کی طرح ہنسی....."کیا آج بھی کوئی برا سپنا آیا تھا....."

وہ دھیرے سے مجھ پر پھیل گئی....."سنو! درخت کے تنے میں جب کیڑے لگ جاتے ہیں تو اسے کھوکھل کر دیتے ہیں....."

میں حیران سا اسے دیکھ رہا تھا.....بارش کے بعد والی نہائی ہوئی صبح کی طرح.... سکینہ اور دکھ دونوں اس بیچ کہاں چلے گئے تھے۔ مجھے نہیں معلوم.....

پھر میں نے کچھ نہیں سوچا تیزی سے بارش میں چھلانگ لگا دی۔ یا یوں کہیں، غڑاپ ہو گیا۔

○○

---- ایوان اردو۔ ۹۵ء

حیران مت ہو سنگی مترا

باہر نکلتے ہی سنگی مترا کو ابھیتوش کی بات یاد آنے لگی۔ سب کچھ نہ بدلے، تب بھی کیا فرق پڑتا ہے؟

ہاں کیا فرق پڑتا ہے...

سنگی مترا جیسے اپنے آپ سے بدبدائی۔ دیکھا نا، بھول گئی کہ وہ کس لیے باہر نکلی تھی؟ کس کام سے؟ یہ غلط بات ہے۔ ذرا دیر میں وہ سب بھول جاتی ہے۔ حافظہ کمزور ہونے لگا ہے۔ کتنی بار وہ جسدیو سے کہہ چکی ہے۔ گڑے مردے بھی کہیں ایسے نہیں سڑتے جیسے وہ... بس یہیں آکر نال گڑا گئی۔ سڑنے کے لیے۔ سنتے ہیں زمین میں گاڑے جانے والے مردوں کی ہڈیاں بھی گھومتی رہتی ہیں۔ جغرافیہ میں کہیں بچپن میں پڑھا تھا۔ زمین گھومتی ہے، مگر اس کی تو نال گڑا گئی۔

کھڑ.... کھڑ.... کھڑ.... کھڑ....

پتلی سی سنکری گلی۔ ذرا سی نگاہ دائیں طرف چلی گئی کہ مشکل ... ماڈرن ٹیلر ... ناک سے بار بار پھسل جانے والے چشمے کو برابر کرتا کھوسٹ قدوس غور سے اس کی طرف دیکھتا ہے... "بائی، تم برابر والی گلی میں رہتا کیا؟"

"ہاں...."

"تم اچھا لوگ بائی۔ اکھا بمبئی میں اچھا لوگ ملتا کہاں بائی .....؟"

کھڑ کھڑ...... کپڑوں پر سرسراتی قینچیاں گھماتا کھوسٹ قدوس جب آگے کے ٹوٹے ہوئے پورے بارہ دانتوں کے ساتھ مسکراتا تو اس کے تن بدن میں جیسے آگ دوڑ جاتی۔ یہ کہاں آکر پھنس گئی ہو تم سنگی مترا۔ یہ تمہارا کلکتہ نہیں ہے، بمبئی ہے بمبئی.....

رحمت کباڑیا کے دیدے بھی اسے دیکھ کر یوں پھیل جاتے ہیں جیسے وہ سنگی مترا نہیں، گوشت کی تازہ ذائقہ دار بوٹی ہو۔ ہر وقت اپنے کباڑ میں سر دیے ترازو اور "باٹ کھڑوں" کے بیچ اپنی گنجی کھوپڑی کی نمائش کرتا... کلکتہ کی سڑکوں پر ایک بار اس نے ایک پھل فروش کو رام پھل بیچتے ہوئے دیکھا تھا۔ پتہ نہیں کیوں رحمت کباڑیے کو دیکھ کر اسے وہ پھل فروش یاد آجاتا۔

مگر وہ باہر کیوں نکلی تھی.....؟

کھوسٹ قدوس نے پھر اپنی "اٹھائیسی" دکھائی۔

"کہاں جاتا بائی۔ پن کو بول۔"

رحمت کباڑیے کا گنج چمک اٹھا۔ ترازو دھم سے زمین پر رکھتے ہی پاؤ پاؤ بھر کے دو پلڑے زمین پر لڑھکتے چلے گئے۔

"کچھ کام کیا بائی؟"

سنگی مترا نے منھ بنایا۔ اندر تک ایک آگ بھر گئی۔ پیر پٹکتی وہ آگے بڑھ گئی۔ دیر تک رحمت کباڑیا اور کھوسٹ قدوس کے قہقہے اس کا پیچھا کرتے رہے۔

جسدیو نے اسے طنز سے دیکھا تھا۔

"سنگی مترا، تمہاری ساری ترقی پسندی ایسے میں کہاں کھو جاتی ہے؟"

پھر جلے پر نمک چھڑکتے ہوئے ایک ساتھ کتنے ہی طنزیہ قہقہے وہ اس کے منھ پر اچھال دیتا۔

"شادی تو تم نے اپنی پسند سے کی ۔۔۔ کیوں؟ پھر بمبئی آنے میں تمہیں اعتراض کیوں ہوتا۔۔۔ ہوا بھی نہیں۔۔۔۔ مہانگر کا اپنا ہی گلیمر تھا۔ ہاں سوچا ہو گا۔۔۔ ویسا مکان، ہو گا جیسا بمبیا فلموں میں دکھائی دیتا ہے۔۔۔ آدمی چاہے معمولی ہو۔ سو روپلی کماتا ہو یا ہــزار۔۔۔۔ بمبیا فلموں کے مکان تو محل لگتے ہیں۔"

سنگی مترا کیا یہ سچ ہے۔۔۔ وہ چپ تھی۔۔۔۔ جسدیو کے ہنستے چہرے کو تک رہی تھی۔ جسدیو نے اسے اپنے پاس کھینچا۔

"کیوں سنگی؟ تم نے ایسے ہی کسی مکان کا تصور کیا تھا نا؟ اور نوکری کا۔۔۔۔ خواب ٹوٹ گئے کیا۔۔۔ کیا لگتا ہے تمہیں؟"

سنگی مترا ایک دم سے سنجیدہ بن گئی۔ آج کی سنگی کیسی دکھائی دیتی ہے تمہیں؟ بار بار تم سے جرح کرنے والی؟ سوال کرنے والی؟ یہاں سے پیدا ہونے والے ڈھیر سارے سوالوں کو تمہاری آنکھوں میں دیکھنے والی؟

سنگی نے سر اونچا کیا۔۔۔ "حافظہ کمزور ہے تمہارا جسدیو۔ یا تو سب بھول جاتے ہو یا کہیں دل میں اپنے آج پر تھوڑا سا افسوس ہوتا ہے۔۔۔۔۔"

"کیوں؟" جسدیو چونکا۔

سنگی مترا ہنس دی۔ "بس ایسے ہی۔ ورنہ تم اپنی سنگی سے یہ تو نہیں پوچھتے۔ ایسے پوچھتے ہو جیسے اسے جانتے ہی نہیں۔"

جسدیو ہنس دیا۔ لیکن پھر سنجیدہ بن گیا۔۔۔۔۔ "اکلوتے" کمرے کے بکھراؤ پر ایک نظر ڈالی۔ صفائی تھی۔ لیکن کباڑ اپنی جگہ تھا۔ چیزیں تھوڑی سی ہوں۔ مگر کمرہ ایک ہو تو بکھرا بکھرا سا لگتا ہے۔ سنگی کو اپنے گھر کا سجا ہوا بیڈ روم یا ڈرائنگ روم یاد آجاتا۔ چمچماتے فرش کو جب بھی چاہو" انگلی لگا کر دیکھ لو۔ ایک ذرا گرد کا نام و نشان نہیں۔

"پھر بھی سنگی! تھوڑا سا افسوس تو ہوتا ہو گا؟"

جسدیو نے پینٹ شرٹ دیوار پر گڑی کھونٹی سے لٹکادی۔ اس نے نظر اٹھائی

توجسدیو ہنس دیا۔

"یقین نہیں آتا تم وہی ہو۔ اپنے بمل مترا کی لڑکی سنگی مترا۔"

کھونٹی سے ٹنگے شوہر کے شکن آلود معمولی قسم کے کپڑوں کو دیکھ کر بھی کچھ ٹوٹتا نہیں کیا تمہارے اندر؟ ایک ہی کمرے میں گوہ سے موت تک کے سارے سامان ۔۔۔۔یہ کھولی بھی تو مشکل سے ملی ہے سنگی مترا۔

اس نے ایک بے مطلب سا قہقہہ اچھالا۔ یہاں سب کو لال اور ہری جھنڈیاں کھینچ لاتی ہیں سنگی۔ سپنوں کی لال اور ہری جھنڈیاں۔۔۔۔۔ لکھتا تھا نا؟ سوچتا تھا چانس تو بمبئی میں ہے۔ چھلانگ لگا دو اور سبھاش گھئی کو پکڑ لو۔۔۔۔۔ ایک ہٹ کہانی کا آئیڈیا سنا دو۔ اپنی بنگالی فلموں کا اتنا ڈیمانڈ نہیں ہوتا نا۔۔۔۔ بمبئی کی بات ہی اور ہے۔ ایک دم سے ایک ہی بار میں سپرہٹ۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔؟ بمبئی کے کتنے ہی ہیرو سپر اسٹار بننے سے پہلے ان ہی کھولیوں میں رہا کرتے تھے سنگی۔ این چندرا سے جیکی شیروف تک۔ اور یہاں آکر بارہ سو روپلی کی چکی پیس رہا ہوں۔

اس نے نظریں جھکالیں اور جیسے سنگی مترا کے بدن کو نظر کے ہر زاویے سے تول لیا۔ خوبصورت، پرکشش جسم، جسم پر معمولی نوعیت کی ساڑی۔ سانولا چہرہ۔ گہری اور اندر تک اتر جانے والی آنکھیں۔ بکھرے ہوئے بال۔ غضب کی سادگی۔

"دکھ ہوتا ہے۔"

سپنوں کی پتھریلی سڑک پر چلتے ہوئے تیرے ساتھ کیا کیا سوچا تھا۔

اور کیسے کیسے تصورات کے مکان آباد کیے تھے۔ ایسا ہوتا.... کاش ایسا ہوتا!

اور ہر ایسا ہوتا کے بعد ویسا ہوتا کا ایک لمبا سلسلہ۔۔۔ وہ قریب کھسک آئی۔ چہروں کے درمیان ہونٹ چھو لینے بھر کا فاصلہ رہا۔ آنکھیں آنکھوں کے پاس لہرائیں۔

سنگی مترا ہولے سے مسکرا دی۔۔۔۔ "سنو! تم وہی جسدیو ہو نا؟"

وہ شرارت سے ہنسی ..... یاد ہے تین چار ملاقاتوں کے بعد تم نے کیا کہا تھا؟ تم اتنی سجی ہوئی کیوں رہتی ہو سنگی مترا؟ سچ تو یہ ہے کہ سجنا مجھے کبھی پسند نہیں تھا۔ صرف تمہارے لیے، تمہاری آنکھوں میں بسنے کے لیے ..... بندی بھی لگالی تھی اور ..... یاد ہے تم نے کیا کہا تھا۔ مجھے تو سب کچھ بکھرا بکھرا پسند ہے۔ بکھری چیزیں، کمرہ، کتابیں اور بکھری بکھری سی عورت ..... یاد ہے؟ ..... دھت۔ دوسرے دن ہی میں ہمیشہ والی سادگی میں تمہارے سامنے تھی۔ تم ہنسے تھے۔ بس ایسے ہی رہنا سنگی ہمیشہ .....

سنگی چپ ہو گئی۔

جسدیو نے پوچھا۔ "یہ گزرا ہوا کیوں یاد آگیا تمہیں؟"

"تم نے سپنوں کی پتھریلی سڑک کی بات کی نا، اور دکھ کے کنکر چنے۔ اسلیے۔"

سنگی ایک بار پھر قہقہہ بار تھی۔ "سنو! ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھو....."

"اپنے آپ کو ترقی پسند کہتے ہونا، تم لوگ؟"

"کہتا ہوں کیا مطلب.....؟" جسدیو بگڑا "یہ تو آئیڈیلوجی کی بات ہے۔"

"بکواس ..... سب ڈھونگ ہیں تمہارے۔ کھانا نہیں بناؤں گی آج۔ بھوکے رہنا۔"

جسدیو نے اس کی چوٹی کھینچی۔ "سنگی کی بچی۔ کھانے کی بات چھوڑ۔ یہ آئیڈیالوجی پر چوٹ کیوں کی؟"

"آں پہلے چوٹی چھوڑو....." درد کی ہلکی سی شکن اس کے چہرے پر ابھری۔ سنگی اٹھ کھڑی ہوئی۔ کھانا نہیں بنا تو الٹا نقصان اسی کا ہے..... "چلو..... چلتی ہوں کھانا بنانے۔"

اس نے آگے بڑھنا چاہا تو جسدیو غصے میں آگے تن گیا۔

"سنگی کی بچی۔"

"بی۔ پریکٹیکل یہ ہر وقت کا جھگڑا اچھا نہیں لگتا۔۔۔"
سنگی نے ننگے پاؤں سے زمین کھجائی۔ جو کل تھا، جو کل کی باتیں تھیں۔ روزی، روٹی اور پریشانیوں کو آج سے جوڑتے ہوئے جب تم اس کل پر انگلی اٹھاتے ہو تو بہت چھوٹے لگتے ہو۔۔۔ اپنے قد سے بہت کم۔۔۔ جانے دو نا۔۔۔ بہت کام پڑے ہیں۔"

"نہیں۔۔۔"

برا نہیں مانو گے نا۔۔۔؟

"نہیں۔"

"لفظوں میں اور حقیقت میں فرق ہوتا ہے جسدیو۔۔۔ تم اور تمہارے دوست کبھی کبھی سب مجھے دوغلے لگتے ہو۔"

جسدیو نے حیرت سے دیکھا۔ مگر تب تک سنگی باتھ روم کا دروازہ بند کر چکی تھی۔

بارہ سو روپلی سے پہلے کلکتہ کی سڑکیں ناپتے ہوئے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ آنے والے دنوں میں کبھی حقیقت کے اس پل صراط سے بھی گزرنا پڑ سکتا ہے۔۔۔ نازک سی عمر۔۔۔ احساس اور جذبات کے نرم نرم روئی کے گالے۔۔۔ اور شعر و شاعری، جو جنم سے ورثے میں ملی تھی، جو آنکھ کھلتے ہی اس نے بنگالی تہذیب میں گھلا ملا پایا تھا۔ نازک سی عمر اور کالج کا زمانہ۔ کلکتہ کی مصروف ترین سڑکیں۔ ٹرام اور گاڑیوں کے شور۔۔۔ غریبی اور بے روزگاری کے قدم قدم پر کچلے ہوئے جسم اور۔۔۔ کلکتہ۔۔۔ رکشے میں جتا آدمی۔۔۔ بھیڑ میں پھنسا آدمی۔۔۔ اور ننگا سا کلکتہ۔۔۔ بے حال سا کلکتہ۔۔۔ جینس کا پینٹ، کھادی کا کرتا اور کندھے سے جھولا لٹکائے۔ تب سارا سارا دن وہ کلکتہ کی سڑکیں ناپ رہا ہوتا۔ تب اس نے پہلی کویتا (نظم) لکھی تھی۔۔۔ رکشے میں جتا ہوا بہاری۔۔۔ پھر اس نے ہوڑہ کے جوٹ ملس میں کام کرنے والے ایک بوڑھے مزدور سے متاثر ہو کر دوسری کویتا لکھی۔ یہ کویتا بھی بہت مقبول

رہی... پھر سنگی ملی تھی۔ سنگی مترا... تب درد کو نیانیا پالنے کا شوق ہوا تھا۔ گلیمرس۔ سامنے تمہاری پسند کی ایک خوبصورت لڑکی بیٹھی ہو۔ لڑکی پڑھی لکھی ہو... ذرا اس درد کو اچھی طرح الفاظ میں اتار کر تو دیکھو۔ آنکھیں بند کر کے... مسکرا کر... خوبصورت معنی خیز الفاظ میں اتار کر... وہ بہاری رکشے والا... جوٹ ملس کا وہ بوڑھا مزدور... سنگی مترا... مجسم مورت بنی اس کے لفظوں کے سحر میں کھوئی تھی۔

"آؤ سنگی..."

اس نے شام کے ڈھلتے سایوں میں اپنے سایوں کا عکس دیکھ لیا۔ "آؤ سنگی چلتے ہیں۔ اصل کلکتہ تو یہاں بستا ہے۔ جوٹ ملس کے اس مزدور میں۔ آدمی کو ڈھونے والے اس بہاری مزدور میں... سردی ہو، برسات یا گرمی۔ راتوں کو فٹ پاتھ آباد کیے لاکھوں بے گھر غریبوں میں، جنہیں کلکتہ واسی کہلانے کا کوئی حق نہیں۔"

سنگی جیسے حیرت زدہ تھی۔ اس نے غور سے جسدیو کو دیکھا۔ ایسے کہ میوزیم سے اٹھ کے جیسے کوئی شاہکار اس کے سامنے آ گیا ہو، یا پھر اس نئے زمانے میں اس نے کسی شخص میں اربندو گھوش یا ٹیگور کو دیکھ لیا ہو۔

"تم... جسدیو تم؟"

"سنگی... میرا ہاتھ تھام لو..."

شہر کی پرچھائیوں میں سمٹتے ہوئے اسے کتنی ہی بار محسوس ہوا۔ سنگی نے چند لمحوں میں جیسے اسے ہزاروں لاکھوں بار دیکھنے اور پڑھنے کی کوشش کی ہو...

خوابوں کے ہزار دروازے تھے اور خوشبوؤں میں ڈوبا ہر دروازہ بمبئی کی طرف کھلتا تھا۔

اس نے سنگی کی طرف دیکھا... "میری کویتا کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی ہے سنگی۔"

سنگی مسکرائی... "وہ کیسے؟"

"کل صرف آوارہ سڑکیں تھیں اور ملک کی غریبی ..... اب روز گار ہے اور میرا اپنا کیریئر" جسدیو ہنسا۔ "ایک بات کہوں ..... آدمی ڈھونے والے اس بہاری مزدور کا چہرہ بھی کچھ دھندلا سا پڑ گیا ہے اور جوٹ ملس والا بوڑھا اچانک کہیں غائب ہو گیا..... ایسا کیوں ہو رہا ہے سنگی؟"

سنگی مترا ہنسی نہیں۔ اس نے غور سے جسدیو کو دیکھا ..... بے جان بت کی طرح اس کے سینے پر بچھ گئی۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ "ایک آنکھ میں کتنی آنکھیں ہوتی ہیں جسدیو۔ ایک چہرے میں کتنے چہرے؟"

"سنگی!"

"خواب تو بس سیڑھی دیکھنے تک سہانا رہتا ہے جسدیو۔ جب سیڑھی دیکھ لی اور پہلی سیڑھی پر چڑھنے کی نوبت آگئی تو...... پچھلا سب باسی اور کوڑا لگنے لگتا ہے۔ ایسا ہوتا ہے نا .....!

بمبئی .....

کھولی کے دروازے تک جو گندھ پھیلی تھی ہمت اور حوصلے کے بیچ وہ گندھ اسے کہیں سے بری نہیں لگی تھی۔ ہاں برے لگے تھے تو آس پاس کے لوگ..... وہ بوڑھا قدوس اور وہ رحمت کباڑیا ..... "کہاں سے آنا ہوا بائی ..... کلکتہ ..... تمہارا ہسبنڈ کیا کرتا بائی ..... پھلم میں گانا لکھنے کو مانگتا ..... آئیں۔"

آئے دن کے ان تذکروں سے اندر ہی اندر زخمی ہوا تھا جسدیو..... وہ جیسے تسلی کے لیے لفظ جوڑتا۔

بس کچھ دن ..... کچھ ہی دنوں کی بات ہے سنگی.....

اسے لے دے کر بس یہی غم کھائے جاتا..... ایک کمرے کی کھولی، بکھرا ہوا سامان۔ آس پاس گندے لوگ ..... "سنگی! تمہاری کہیں اور شادی ہوتی تو؟" ..... وہ مسکرا کر کہتی ..... "جسدیو! ہم نے لو میرج کی ہے۔ یہ کیوں بھول جاتے ہو۔

تم سنگھرش کرو۔ سنگھرش کرنے میں شرم کیسی؟"

اس دن پہلی بار وہ ابھتوش سے ملی تھی۔ تذکرے تو جسدیو سے کافی سن چکی تھی۔ لیکن ملی تھی پہلی بار ۔۔۔۔ اور پہلی ہی بار میں ابھتوش نے یہ احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ اجنبی ہیں۔

"کیوں بھابی۔ بمبئی پسند آیا ۔۔۔۔؟"

ابھتوش ہنسا تھا۔ کچھ عجیب تو نہیں لگا۔ زندگی میں ہر طرح کے تجربے تو ہونے ہی چاہئیں۔ ان تجربوں سے گزر کر ہی انسان ہونے کا درد جاگتا ہے۔ پہلی بار جب بمبئی آیا تھا تو میرا ایک دوست یہاں ایک چال میں رہتا تھا۔۔۔ مجھے بھی جگہ مل گئی۔ کیوں؟ جسدیو تو پھر بھی مجھ سے بہتر تھا۔

پہلی بار میں ہی ابھتوش کا گہرا رنگ اس پر چڑھا تھا۔

ابھتوش روانی میں بول رہا تھا۔ "چال میں کیسے کیسے رنگ تھے اور کیسی کیسی دنیا آباد تھی۔ رشتوں کی نازک ڈال کے بیچ شرم و حیا کے زیور نہ تھے۔ وہاں ایک دوست بنا تھا رگھو۔ پانچ روپے کا ٹھرا پلا دو، پھر اس کا ٹیپ آن۔۔۔ کہتا تھا بیٹی بہو کی ننگی ننگی ٹانگیں دیکھے باپ۔ بہو بیٹے کا ملن بھی دیکھے ایسا اپنا چال۔ رہو وہیں، موتو وہیں... کھاؤ وہیں۔ وہی سنڈاس جیسا کمرہ اور دس دس افراد، یہی اپنا چال۔

سنگی مترا سناٹے میں تھی۔۔۔

"پہلی بار ۔۔۔ اپنے درست ہاتھ پیر دیکھ کر لگا تھا۔ بھابی، ہم کتنے خوش قسمت ہیں۔ یہاں تو جینے کو جانور بننا پڑتا ہے۔ ڈرین پائپ میں لیٹنے کا بھی ٹیکس لگتا ہے...

ابھتوش چلا گیا۔۔۔ سنگی اس پوری رات حیران و پریشان رہی۔ وہی بکھرا سا کمرہ۔ لیکن اس دن ابھتوش کے جانے کے بعد اس نے اطمینان کی ٹھنڈی سانس بھری۔ خوب خوب پیار کیا جسدیو کو۔

"ایسی کیا بات ہے، جسدیو حیران تھا۔ پھر وہ بتانے لگا: سیریلس بھی لکھنے

کے آفر ملنے لگے ہیں۔ کوکیز، ٹیلی فلم، مارننگ، آفٹر نون ٹرانسمیشن کے لیے .... وہ ہنسا۔
.... یہاں رائٹر تو بہت ہیں۔ اسکرپٹ رائٹر کم ہیں۔"

جسدیو نے سنگی کی آنکھوں میں جھانکا۔

سنگی جیسے خود سے بولی۔ "دھیرے دھیرے مجھے اس کمرے کی سیلن اور بدبو سے پیار ہوتا جارہا ہے۔"

اس دن شاپنگ کے لیے ابھتوش کے ساتھ وہ دو قدم چلی تھی۔ کھوسٹ قدوس اور رحمت کباڑیے نے دونوں کو دیدے نکال کر دیکھا۔

بائی ...

آواز جیسے جلتے سیسے کی طرح اس کے کان میں اتری۔

ابھتوش نے پلٹ کر اس کے چہرے کی شکن دیکھ لی تھی۔

"ان نفرت رنگوں کو وہیں چھوڑ دیا کرو بھابھی"

اس روز وہ سارا دن غصے میں رہی۔ کھولی اور آس پاس والوں پر غصہ آتا رہا۔ جسدیو خوب ہنستا تھا۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ یہ ہنسی کتنی مصنوعی تھی۔

جسدیو نے اس کا مذاق اڑایا۔

"سنگی مترا، یہ تمہاری پرواز کہاں کھوتی جارہی ہے۔"

لیکن اس بار چونکی نہیں سنگی مترا۔ طنز سے مسکرائی۔ " بچپن میں ایک کہانی پڑھی تھی جسدیو۔ شہزادی راستہ بھول جاتی ہے۔ راستہ بھول کر وہ غلطی پر غلطی کرتی جاتی ہے۔ تم جسدیو .... تم جیسے لوگوں کے پاس کوئی آئیڈیالوجی تھی بھی کیا؟ یا سب رومانٹیسیزم ....کوری رومانٹیسزم ...

وہ ہنسی ... پہلے تم یا تمہارا درد نہیں، کتابیں بولتی تھیں، اس لیے کہ بے کار تھے تم۔ اور ٹھوسنے کے لیے ایک گھر تھا تمہارے پاس۔ جیب خرچ کا بار اٹھانے کے لیے بابو جی تھے۔ اب اپنے لیے تم خود ہو جسدیو، تو تمہارا درد وہیں رہ گیا ہے۔

جوٹ ملس کے اس بوڑھے کے پاس یا رکشہ ڈھونے والے اس بہاری مزدور کے پاس۔"

جسدیو نے بات بدلی۔ "ڈیڑھ سال میں کتنا بڑا فرق آگیا۔ اب تم لڑنے بھی لگی ہو۔۔۔۔"

سنگھرش کے پاؤں اوبڑ کھابڑ زمینوں پر بڑھتے رہے تھے۔ جسدیو کو دھیرے دھیرے کام ملنے لگا تھا۔ اس بیچ صرف ایک بات ہوئی۔ دو ماہ کے لیے وہ اپنے گھر گئی تو اماں نے سرجو کو ساتھ کر دیا۔ سرجو کو۔۔۔ جو وہاں اماں کا سارا کام دیکھتی تھی۔ اماں کا ہاتھ پیر سب کچھ تھی۔ لیکن وہ۔۔۔ اماں کی پہلی لڑکی تھی نا۔۔۔۔۔ اماں کی دلاری ۔۔۔ اور اماں نے اس کے پیٹ میں دھیرے دھیرے چھوٹے چھوٹے پاؤں نکالتے بچے کا لمس محسوس کرلیا تھا۔۔۔۔ "حماقت مت کر سنگی۔۔۔۔ یہ آرام کا سمے ہے۔ جسدیو کو بھی سمجھا دینا۔"

"نہیں اماں۔۔۔۔۔؟"

اماں نے بات کاٹ دی۔۔۔۔ "جانتی ہوں سب۔۔۔ ایک کھولی ہے تمہارے پاس۔ ایک جن بڑھ جائے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

سرجو۔۔۔۔

عجیب سا لگتا ہے نا؟ پیٹ کا بچہ جب دھیرے دھیرے اندر پاؤں پسارتا ہے تو؟ عجیب سی گدگدی مچتی ہے پورے وجود میں۔۔۔۔ جسدیو۔۔۔۔ وہ گنگناتے ہوئے ذرا پاس سمٹ آئی۔۔۔۔ دیکھ نا، ہلتا ہے یہ۔۔۔۔ گھومتا ہے۔۔۔۔ ناچتا ہے۔۔۔ پورے پیٹ میں۔۔۔۔ دھت۔۔۔۔ اسے خود ہی شرم آگئی۔

"سرجو کہاں ہے۔۔۔۔ بالکنی میں۔۔۔ کمرے اور کچن کے بیچ نکلتی تھوڑی سی جگہ۔۔۔۔ اس دن رات کے وقت اچانک سامنے نکل کر کھڑی ہو گئی تھی سرجو...

۔۔ "میم سائب، بائی رے برشٹی پورچھے بھیتر وشوبو؟" (میم صاحب، باہر ٹپ

ٹپ ہو رہی ہے اندر سو جاؤں)

سنگی جلدی سے بولی۔ "سو جاؤ......"

سرجو کو حیرت تھی۔ "میم سائب۔ یہ کیسی جگہ تم آگیا۔ یہاں سب بائی بولتا۔

اس نے ڈانٹا...... "اپنے کام سے کام رکھو سرجو......"

ابھیتوش نے بھی سرجو کا سواگت کیا۔ تم نے تو کھولی کو محل بنا دیا بھابی۔ چلو اچھا ہے۔ جب تک تین نہیں ہو جاتے، باتیں کرنے کے لیے کوئی تو ہوگا تمہارے پاس۔"

"نا، میں نے بمبئی میں نہیں رہنا زندگی بھر....." سنگی مترا نے منہ بنایا.... ابھیتوش! یہاں تو صرف گدھ ہی گدھ نظر آتے ہیں مجھے۔"

ابھیتوش نے سرجو کی طرف دیکھا، جو دھیان سے ٹکٹکی لگائے اس طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کا لہجہ یکایک بہت سنجیدہ ہو گیا۔ "گدھ نہیں بھابی۔ یہاں وہ جانور بستے ہیں جو اپنے طور پر اپنی زندگی گزارنے کا حق نہیں رکھتے۔ پیسوں سے اپنی خوشی بھی نہیں خرید سکتے..... صرف تھکن..... وہی بیچتے ہیں، اوڑھتے ہیں، خریدتے ہیں، پیتے ہیں....."

"میں نے انہیں گدھ کہا ہے....." سنگی نے زور دیا۔

وہی تو کہہ رہا ہوں... تم جنہیں دیکھتی ہو اور جیسا سمجھتی ہو، ویسا نہیں ہے۔ یہ آنکھیں خوشی ڈھونڈتی پھرتی ہیں بھابی۔ یہ خوشی کسی بھی ہنستے چہرے میں مل سکتی ہے۔"

سنگی مترا نے قہقہہ لگایا... "بشرطیکہ چہرہ لڑکی کا ہو۔"

سرجو سبزی لے کر کچن میں چلی گئی۔

سنگی نے کچن کی طرف جاتی ہوئی ابھیتوش کی نظروں کا جائزہ لیا، جو اسی سنجیدگی بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "لیکن اس کے باوجود بھابی تم اسے بھوک نہیں کہہ سکتیں۔"

"ہنومت" سنگی نے منہ بنا لیا ... "کان ایسے پکڑو چاہے ویسے ... بھوک تو بھوک ہی ہوتی ہے۔ اپنی بیوی کے ہوتے دوسرے کی بیوی کی طرف جب گدھ جیسی نظر اُٹھتی ہے نا..."

ابھیتوش ہنسا ... "تم کیوں چاہتی ہو بھابی کہ سب کچھ بدل جائے۔ سب نہ بدلے تب بھی کیا فرق پڑتا ہے؟"

پتہ نہیں کیوں اسے محسوس ہوا جیسے سرجو سبزی کاٹنے کا بہانہ لے کر ایک ٹک ابھیتوش کو دیکھتی رہی ہو۔ اور ابھیتوش بھی باتوں کے درمیان سرجو سے باتیں کرنے کا جواز ڈھونڈتا رہا ہو .... "کیوں سرجو .... آج چپ کیوں ہو؟ طبیعت خراب ہے کیا؟ آج کیا بنا رہی ہو.... چائے نہیں پلاؤگی ....؟

ابھیتوش چلا گیا تو سنگی مترا نے سوچا۔ ایسا کیوں ہے؟ اس نے ایسا کیوں محسوس کیا؟ کہیں کوئی طلب تھی کیا؟

نا ...؟ پھر ... سرجو مستقل ابھتوش سے سٹ کر بیٹھی رہی تھی۔ کہیں کوئی برسوں سے ٹھنڈی پڑی آگ تھی کیا، جو ذرا سا بھڑکی تھی۔

اس دن تیز تیز بارش ہو رہی تھی۔ بالکنی سے ہو کر پانی کے چھینٹے اندر کمرے تک آگئے تھے۔ آج صبح سے ہی سرجو کچھ زیادہ تیز آواز میں بول رہی تھی۔ بات بات پر سلگ اُٹھتی تھی۔ غصہ ہو جاتی۔ "بنیا کے یہاں میں نہیں جاؤں گی میم سائب ..."
دو دنوں سے پانی بھی نہیں آ رہا تھا۔ نیچے ہینڈ پمپ تھا۔ جسدیو تو رات میں آتا تھا۔ سرجو نے ہاتھ پاؤں پھیلا دیے۔ کھانا کیسے بنے گا۔ "میں نہیں لاؤں گی پانی ...... اتنی اتنی سیڑھیاں طے کر کے نیچے جانا پڑتا ہے۔"

"سرجو ...."

اس نے سرجو کا جائزہ لیا۔ ساڑی کا آنچل ڈھلک گیا تھا۔ اس کا دودھیا پیٹ

اب نظروں کے سامنے تھا۔ سنگی نے غور سے دیکھا، چولی کے بٹن تک ٹھیک سے نہیں لگے تھے۔ سرجو کے بدن سے آگ کی جھاس اٹھتی ہوئی محسوس ہوئی اسے، گرم گرم بھاپ۔

"اے بھابے کے دیکھجن" (ایسے کیا دیکھتی ہو میم سائب) سرجو فوراً پلٹی۔ ایک بار اس نے ڈانٹا بھی۔ "تیز تیز آواز میں کیوں بولتی ہو سرجو۔ سیدھے منہ کیوں نہیں بولتی۔"

جسدیو آیا تو اس نے پوچھا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے جسدیو۔ ایسا کیوں ہے؟"

جسدیو کچھ زیادہ ہی تھک گیا تھا۔ بولا۔ "تم تھکی تھکی سی لگ رہی ہو سنگی۔ سو جاؤ۔"

"میں تھک گئی ہوں۔" سنگی نے جسدیو کے کھردرے ہاتھوں کو تھاما۔۔۔

"سب کچھ بدل رہا ہے جسدیو۔ اس گھر کا ماحول۔۔۔ اور بھی بہت کچھ۔۔۔ پتہ نہیں یہ صرف میں محسوس کر رہی ہوں یا تم بھی۔ اور بدلا ہے صرف۔۔۔"

جسدیو نے انگڑائی لی۔۔۔۔۔ "سرجو کے آنے سے۔"

وہ ایک دم سے چونکی۔ ابھتوش تو کہتا ہے سب کچھ نہ بدلے تب بھی کیا فرق پڑتا ہے۔۔۔۔ لیکن فرق تو پڑا ہے جسدیو۔ سرجو کے آنے سے کچھ تو فرق پڑا ہے۔

ابھیتوش کے بارے میں سنتی رہی تھی۔ سوشل ایکٹی وسٹ۔ صرف کہتا نہیں ہے کرتا بھی ہے۔ جسدیو اور اس میں اتنا فرق ہے۔ انقلاب صرف اس کے لیے بغاوت بھرا لفظ نہیں ہے، بلکہ اس لفظ میں جیتا ہے۔ جسدیو خالی ہوتا تو ابھیتوش کی تعریف لے کر شروع ہو جاتا۔ وہ بھی ابھیتوش کو دیکھتی رہی تھی۔ بمبئی آنے کے بعد، اس کھولی میں رہنے سے لے کر اب تک۔ اتنا پیارا دوست تو پردیس میں مشکل سے ہی ملتا ہے۔ جان چھڑکنے والا۔۔۔۔ ذرا سے درد پر بچھ جانے والا۔ انقلاب کے تیور تو وہ شروع سے ابھیتوش میں پڑھتی رہی تھی۔۔۔۔ اس کی سرگرمیاں۔ چال میں لڑائی ہوئی۔ چھونپڑیاں خالی کرانے آئے غنڈوں سے ہاتھا پائی کی نوبت آ گئی۔۔۔۔ ل

میں ہسٹرتال شروع کروادی۔ ابھتیوش خوب خوب ہنساتا، دنیا بھر کی باتیں لے کر بیٹھ جاتا، ان میں اپنے مسائل بھی ہوتے، دنیاوی خبریں بھی۔ روس میں لینن اور مارکس کی ہٹائی جانے والی مورتیوں کا بھی تذکرہ ہوتا۔

جسدیو کی رومانی، لچھے دار گفتگو کے تاج محل تو بہت پیچھے چھوٹ گئے تھے۔ وہ سوچتی۔ سچ کیا ایسا ہوتا ہے سنگی مترا.... وواہ (شادی) سے پہلے شوقیہ آنکھوں میں بسنے تک، لڑکی کے سامنے میل جیسے ادھیڑنے تک۔ ابھتوش بھی کل ....شادی کے بعد ویسا ہی ہوجائے گا جیسا جسدیو ہے .... کتنی بار بے خیالی میں اس نے جسدیو کی کچھے (انڈر ویئر) سے جھانکتی پتلی پتلی ٹانگیں اور دبلے پتلے جسم کو دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ "خوابوں کا بھرم کیوں ٹوٹتا ہے جی۔" جسدیو چونکا تو وہ ہنستی چلی گئی۔ "برا مت ماننا، وواہ نہیں ہوا تھا، تو تم سپنوں میں بار بار آنے والے ہیرو تھے میرے، جو شان سے لہراتا ہوا گھوڑے پر آتا ہے اور شہزادی کا دل جیت لیتا ہے .... تب یہ کچھے سے جھانکتی پتلی پتلی ٹانگیں نہیں تھیں تمہاری۔ تب صرف تمہارے لفظ تھے اور ان لفظوں سے بنا ہوا ایک خوب صورت سنسار .... مجھے لگتا ہے اس عمر میں سب مرد ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اب تمہارے بعد ابھیتوش کو پڑھ رہی ہوں۔

جسدیو ناراض ہوتا تو وہ اسے چڑھانے کے لیے بول دیتی۔

"بی پریکٹیکل ...."

ابھیتوش اور سرجو .... کبھی کبھی اسے لگتا، کھولی اور آس پاس کے ماحول نے اس کے من میں گندگی بھر دی ہے۔ ایسی ایسی باتیں کیوں سوچتی ہے وہ .... جن کا نہ سر ہوتا ہے نہ پیر .... دو دو باتیں کرلینے سے کوئی برا تو نہیں بن جاتا.... ...تو میں کیا سچ مچ کوئی مانگ جاگی ہے .... یا ابھیتوش نے اس مانگ کو محسوس کیا ہے۔ غلط کیا ہے۔ یہ مانگ یا اس کا ایسا سوچنا یا ابھیتوش کے چہرے سے اٹھتی نقاب۔ سنگی مترا، کچھ بدل رہا ہے .... وہ قد آدم مورتی ٹوٹ رہی ہے جو تمہارے

دلوں میں بستی ہے ۔۔۔۔ ٹوٹ رہی ہے نا۔ سرجو پوچھ رہی تھی۔ "آج جے دادا آچھے نا۔ اونار جو نو دوئی ماچھ بانا چھی۔" دادا وہ ابھیتوش کو کہتی ہے۔

سنگی چپ رہی۔ جواب نہیں دیا۔ دیوار گھڑی کی طرف دیکھا، جو ٹک ٹک کرتی، جسدیو کے آنے کے وقت کا اشارہ کر رہی تھی ۔۔۔۔ ٹک ٹک ۔۔۔۔ صبح سے ہی وہ پیٹ کے درد کو لے کر پریشان تھی۔ محبت کے ان لمحوں کو پیٹ میں چھپائے کتنے ماہ گزر گئے۔ اب تو وہ ایک سنسنی خیز موڑ ڈالی جذباتی سڑک پر کھڑی تھی۔ وہ اس کی آہٹ سنتی تھی۔ ننھے کومل سے سر کو محسوس کرتی تھی۔ جب وہ دھیرے دھیرے پیٹ میں ہاتھ پاؤں چلاتا۔

زمانہ کتنا بدل گیا بھابی۔ ابھیتوش نے اس دن ہنستے ہوئے اس کے پھولے پیٹ کو دیکھ کر گورکی (مشہور روسی ناول نگار میکسم گورکی) نے انسان کی پیدائش کا قصہ سنایا تھا۔ مزدور عورت ۔۔۔۔۔ تیز طوفان، بارش، وہ کسی نرسنگ ہوم میں نہیں گئی۔ کسی مڈوائف کا سہارا نہیں لیا۔ بلکہ وہ تو نیا انسان تھا۔ طوفانی ہوا، مزدوروں کے کھیتوں کے بیچ، موسلادھار بارش میں اس کا جنم ہوا تھا۔

لیکن وہ نیا انسان تو اس کے لیے بس خواب رہا ۔۔۔ اور کچے خوابوں کا بھی کیا ہے؟ وہ نیا انسان تو اندر ہی اندر ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گیا۔ کانوں میں کہیں بوڑھے کھوسٹ قدوس کا جملہ لہرایا ۔۔۔ "بائی تیرے کو تو اس وقت گھر میں ہونا تھا بائی ۔۔۔ وطن میں ۔۔۔ یہ تو گیر ملک ہے ۔۔۔ کھیال رکھنا۔"

رحمت کباڑیا بھی ہنستا تھا۔ "کب مٹھائی کھلاتا بائی؟"

گندگی صرف ذہن میں ہوتی ہے کیا۔ سوچنے میں ۔۔۔ اس دن بھی تیز موسلا دھار بارش ہو رہی تھی ۔۔۔ سرجو پریشان سی اس کے سامنے تھی ۔۔۔ میم سائب ۔۔۔۔ پلکیں مندنے سے پہلے اسے لگا، ابھیتوش اس پر جھکا ہے۔ سرجو، ابھیتوش میں دھیرے دھیرے کچھ باتیں ہو رہی ہیں، جسدیو تم کہاں ہو۔ ایک گھنے اندھیرے کا

جنگل تھا ۔۔۔۔ وہ ڈوبتی جا رہی تھی۔ نیا انسان ۔۔۔۔ اسے لگا ہولے ہولے پر نکالنے والے بچے نے اندر لمبی خاموشی اوڑھ لی ہو۔ پھر ایک تیز درد اٹھا۔ درد سے کراہتے ہوئے وہ ہاتھ کو اندر نائیٹی میں لے گئی اور جب ہاتھ باہر آیا تو ۔۔۔۔

سنگی مترا ۔۔۔۔ جیسے یکایک خوف سے نہا گئی ۔۔۔۔ منہ سے تیز چیخ نکل گئی۔ اس کے دونوں ہاتھ نئے انسان کے خون سے سنے تھے۔

بارش کب کی رک گئی۔ سنگی نے آنکھیں کھولیں تو پاس میں لگ بھگ جذبات سے کانپتا ہوا جسدیو کھڑا تھا ۔۔۔۔ سنگی۔۔۔۔!" اس کی آواز کمزور تھی۔ وہ منہ چھپا کر وہیں بیٹھ گیا۔ سنگی نے بے من سے دونوں ہاتھ اس کی طرف بڑھائے۔ تبھی جیسے ایک چھنا کا سا ہوا۔ اس نے چونک کر دیکھا۔

سرجو کپڑے کی گٹھری لیے اس کے سامنے کھڑی تھی۔ آنکھوں میں بغاوت کے سرخ ڈورے تیر رہے تھے۔

"میم سائب، آمی جا چھی ۔۔۔ آمی باڑی جا چھی ۔۔۔۔ آمی پھیر وت جا چھی ۔۔۔"

سنگی نے اٹھنا چاہا۔ رات کے دھندلکے میں سارا منظر سامنے تھا۔ پتھر جیسے چہرے سے اس نے سرجو کو گھورا ۔۔۔۔

"ابھیتوش کب گیا ۔۔۔ کہاں گیا؟"

سرجو غصے سے دہاڑی ۔۔۔۔ "او آبے نا۔ کی لکھنے آبے۔"

سنگی بت بن گئی تھی۔

سرجو زار وقطار رو رہی تھی۔ "میم سائب ۔۔۔۔ جار سامی نیئ، سے ویشیا۔ جن کے پتی نہیں ہوتے کیا وہ رنڈیاں ہوتی ہیں میم سائب ۔۔۔۔ دو بات کرنے کا مطلب کیا شریر سے کپڑا الگ کرنا ہوتا ہے۔ امی تو او کے مہا پرش سمجھے بی چھلاح ۔۔۔۔ میم سائب ہم تو کھوس ہوتے تھے بابو کتنا پڑھا لکھا آدمی ہے ۔۔۔۔ لیکن سب کہتے ہیں میم سائب ۔۔۔۔ سب کو گوشت کی بوٹیاں چاہئیں۔ ماش رٹکرڈ اور دیر لکھے چھڑے پھیلو۔

آسول چہرہ بھیڑیے اسے۔"

اس نے سرجو کو روکا نہیں۔

سرجو کو جانا تھا، سرجو چلی گئی۔ سنگی پہلے پھوٹ پھوٹ کر نہیں روئی تھی۔ اس نے محسوس کیا تھا، بچے تو وہ اور پیدا کرلے گی۔ ابھی تو جسدیو کو خوش رکھنے کی ضرورت ہے، مگر بے وقت آئی آندھی نے اسکے وجود کے قلعے کو ہلاکر رکھ دیا تھا۔

ایک ہفتہ کے اندر سب کچھ معمول پر آگیا۔ لیکن اندر کے بکھراؤ کو روکتے روکتے سنگی اپنے چہرے کی سپیدی کو چھپا نہ سکی۔ اس دن کام پر جاتے ہوئے اس نے خود ہی جسدیو کے کپڑے نکالے، ناشتہ تیار کیا، جوتا آگے رکھا، کپڑوں کے بٹن لگائے۔ جسدیو حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا ۔۔۔۔ ہاتھ میں بریف کیس تھماتے ہوئے سنگی نے اپنی دونوں وحشت زدہ آنکھیں اس کی آنکھوں میں اتار دیں۔

"سنو جسدیو۔"

اس کے لہجے میں کپکپاہٹ تھی۔ کچھ پوچھنا چاہتی ہوں تم سے ۔۔۔۔" جیسے وقت کی سوئی ٹھہر گئی۔ جسدیو کے چہرے پر برف جیسا کچھ جم سا گیا ۔۔۔۔

"اوہو۔۔۔۔ ڈرو مت جسدیو۔۔۔۔"

اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اور اندرونی چنگاریوں کو ایک ایک کر کے نکالنا شروع کیا۔ "میں پاگل ہو رہی ہوں جسدیو ۔۔۔۔۔ جو پوچھتی ہوں اس کا خیال مت کرنا۔ صحیح صحیح جواب دینا۔۔۔۔ دیکھو میری خاطر کچھ چھپانا نہیں۔ تم مردوں سے وشواس اٹھتا جا رہا ہے میرا ۔۔۔۔۔ پھر بھی یقین دلاتی ہوں میں ۔۔۔۔۔ برا نہیں مانوں گی ۔۔۔۔ عام زندگی میں تم کتنی عورتوں سے ملے ہو۔ ان سے تمہارے رشتے کس حد تک رہے ہیں۔ تم بس میں سفر کرتے ہو نا۔ بس میں لڑکیاں تم سے ٹکراتی ہوں گی۔ تم بھی ٹکراتے ہوگے۔ ان کے انگ چھوتے ہوں گے۔ کبھی میرے سوا کسی اور کی مانگ نے جنم لیا ہے تمہارے اندر؟۔۔۔ جسدیو یقین کرو، میں ہرگز ہرگز برا نہیں مانوں گی

.... کبھی کسی کو دیکھ کر سوئی ہوئی بھوک لہرائی ہو۔ رات دن لڑکیوں سے سامنا ہوتا رہتا ہے تمہارا۔

اس پر ہذیان طاری تھا۔

"بولو جسدیو۔ سچ تو یہ ہے کہ ساری ترقی پسندی ایک طرف۔ مردوں کے لیے ہم صرف گوشت کی بوٹیاں ہیں۔ مجھے بوٹیاں نہیں بننا جسدیو۔ میں مردوں میں تمیز نہیں کر پا رہی .... اصول اور آدرش کی ساری کتابیں مجھے جھوٹی لگ رہی ہیں اور ان کے لکھنے والے بھی۔"

وہ اب تک اس کا گریبان پکڑے ہانپ رہی تھی .... "میری تسلی کرادو جسدیو۔ سچ میں برا نہیں مانوں گی جسدیو .... میں برا نہیں مانوں گی۔"

○○

... آجکل (اردو)

حالانکہ یہ سب سچ نہیں ہے

(۱)

خیالوں پر کائی کی طرح دھند جم گئی تھی۔

دھند اس وقت چھٹی، جب کال بیل جھنجھناتی ہوئی کمرے میں گونج گئی۔

سدیپ نے سوچا، ضرور ترلو ہوگی۔ بیل پر دیر تک انگلی رکھنا اسی کی عادت تھی۔ اس نے کتنی بار سمجھایا تھا..... "ترلو! بیل پر دیر تک ہاتھ رکھنے سے بجلی کے شارٹ سرکٹ میں آگ لگ سکتی ہے۔ نادان لڑکی....."

رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ دروازہ کھلا تو بجلی کی طرح لہراتی ہوئی ترلو کمرے میں داخل ہو گئی۔

"سو رہے تھے کیا؟"

"نہیں تو؟"

"پھر، دروازہ کھولنے میں دیر کیوں ہو گئی؟"

لہراتی ہوئی ترلو فریج کے پاس جاکر ٹھہری۔ بوتل نکال کر غٹ غٹ پانی حلق میں انڈیلا۔ پھر بولی۔ "کچھ بنایا ہے کیا؟ بھوک لگی ہے۔"

خالی بوتل فریج کے اوپر رکھ کر وہ جھٹ رسوئی میں داخل ہو گئی۔ پھر دو منٹ میں ہی واپس لوٹ کر پیر پٹخنے لگی۔ "اتنا بھی نہیں ہوتا کہ بیوی دیر سے گھر آئے تو اس

کے لیے کچھ بنالیا جائے۔ پرانے پتّیوں (شوہر) جیسے ہوتے جارہے ہو تم.....“

ترلو طنزاً ہنسی، پھر پیشانی پر بکھرے ہوئے بالوں کو ہٹاتی ہوئی بولی......“ اب آئینہ لانا ضروری ہو گیا ہے۔ معلوم، دوردرشن میں آج کتنے لوگوں نے ٹوکا۔ کتنی موٹی ہو گئی ہو تم.... ایک سال سے کیا کر رہی تھیں۔ کہاں تھیں تم.... میں نے کہا، بچے پیدا کر رہی تھی۔ صوفیہ بولی.... بس بچے ہی پیدا کرو۔ ایک سال میں کتنا کام کر لیتیں تم.....“

سدیپ چونکا۔ ”صوفیہ ملی تھی کیا؟“

”ہاں۔ ریسپشن پر ہی ٹکرا گئی تھی۔ تمہیں بھی یاد کر رہی تھی۔“

”مجھے؟“

”ہاں، کہہ رہی تھی، تمہارا والا سیریل لگ بھگ پاس ہو چکا ہے۔ فون کرنے کو بول رہی تھی۔“ وہ ذرا ٹھہری ..... ”اف مائی گاڈ، صوفیہ کتنی موٹی ہو گئی ہے۔ اب بھدی لگنے لگی ہے..... پورے بدن پر چربی ہی چربی چڑھ گئی ہے......“ ترلو بنا تھکے بولے جا رہی تھی... ”اب دوردرشن میں ہم جیسی لڑکیوں کا کام کرنا مشکل ہو گیا ہے سدیپ! وجنیتا اور صوفیہ جیسی لڑکیوں نے پورا ماحول ہی خراب کر دیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے پروگرام کے لیے بھی وہاں کے افسر لڑکیوں کو عجیب عجیب سی نگاہوں سے دیکھنے لگے ہیں۔ آج دوردرشن میں ایک نئے پروڈیوسر سے لڑائی ہو گئی۔ وہ بولا، ترلو تمہارا پروجیکٹ پاس نہیں ہوگا تو کس کا ہوگا۔ میں نے بھی غصے میں خوب اناپ شناپ سنایا۔ اس نے پھر معافی بھی مانگ لی۔... دراصل..... صوفیہ جیسی لڑکیوں نے..... تم سن رہے ہو نا.....“

☆☆

خیالوں پر کائی کی طرح دھند جم گئی تھی......

اسی رات، بستر پر سدیپ کے پور پور میں اترتی ہوئی ترلو اس سے پوچھ رہی تھی.... ”سدیپ، میں سب کچھ تم سے کہہ دیتی ہوں۔ تمہیں برا تو نہیں لگتا؟“

”نہیں۔“

وہ سرگوشیوں میں مسکرائی۔ "اپنی بیوی پر اعتماد رکھنا سدیپ۔ تمہارے علاوہ کوئی مجھے چھو بھی نہیں سکتا....."

سدیپ کے اندر جیسے سنسناہٹ سی اتر گئی تھی...... جیسے اندر کا کوئی پھوڑا پھٹ گیا ہو۔ ترلو کے بدن سے الجھے ہاتھ کچھ دیر کو ٹھہر گئے..... ہاتھ سن پڑ گئے تو ترلو چونک گئی.....

"کچھ برا مان گئے کیا؟"

"نہیں تو....." اندھیرے میں سدیپ کی مسکراہٹ کہیں کھو سی گئی۔ "مگر ایک بات ہے ترلو! دفتر، دفتر ہوتا ہے۔ کیا ضروری ہے کہ باہر کی ہر بات آکر گھر بتائی جائے..... پرپرش، غیر مرد، انجان لوگ..... باہر کی باتیں باہر ہی بھول کر کیوں نہیں آتیں تم.....؟"

اس نے آوارہ ہوتے ہاتھوں کو پھر سے متحرک کرنا چاہا..... "سدیپ! تم سے کچھ بھی چھپا کر نہیں رکھنا چاہتی۔ کوئی سی بھی بات۔ ہاں، اپنی بیوی پر سے کبھی اعتماد مت کھونا؟"

(۲)

ترلو اڑن کلی تھی... اڑن کلی۔ بچپن میں یہ نام اسے جس نے بھی دیا ہو، لیکن یہ نام اس پر پورا پورا فٹ بیٹھتا تھا۔ سانولی رنگت میں ڈھیر ساری رعنائیاں سموئے۔ تب سینے کے آس پاس اس نے ڈینوں کو اگتا ہوا پایا تھا..... چڑیوں کی طرح پھڑپھڑانے والے ڈینے..... اڑکر آکاش کی گہرائیوں میں آنکھ مچولی کھیلنے کی خواہش..... پاپا ممی کے لیے بھی اڑن کلی تھی وہ.....

ممی ہنس کر کہتیں۔ "اپنے پتی کا جینا دشوار کر دے گی یہ اڑن کلی۔"

پاپا کہتے "جس گھر میں جائے گی، اجالا بکھیر دے گی۔"

اونچے اونچے سپنے.....اور سپنوں کے شکھر تک چلی جانے والی سیڑھیوں کی قطار

.... ترلو تو چڑیا تھی۔ کبھی اس ڈالی تو کبھی اس ڈالی۔۔۔۔ چین تو اس کی فطرت میں تھا ہی نہیں۔ ایک دم باولی تھی ترلو۔۔۔۔ کسی نٹ کھٹ بچے کی طرح۔۔۔۔

سدیپ اس کے سانسوں کی ڈور میں شامل ہونے والا پہلا مرد تھا۔ تب ترلو سوچتی تھی، زندگی کے ہر فیصلے پر پاپا ممی کی رضا مندی کیوں ضروری ہے۔۔۔۔ ایک عجیب سے جذباتی رشتے سے بندھا ہوا سدیپ تب گھر آنے لگا تھا۔ اس نے کئی موقعوں پر پاپا کی آنکھوں میں ناگواری کے ڈورے بھی پائے۔

ممی کہتی تھیں۔ "اڑن کلی اب کچھ زیادہ ہی اڑنے لگی ہے....."

پاپا کہتے.... "اس کے پنکھ کاٹ دو۔"

شرمیلا سا سدیپ۔ خود میں ڈوبا ہوا۔ زندگی کو اپنے مخصوص رومانی فریم کی عینک سے دیکھتا ہوا۔ کچھ بکھرا بکھرا سا۔ آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ اور ہونٹوں پر معصوم سی مسکراہٹ۔۔۔۔ زندگی کا سب سے اہم فیصلہ لیتے ہوئے سدیپ نے اپنے بارے میں سب کچھ کھل کر بتایا تھا۔ "ایک کھنڈر بچا ہے.... اور بچی ہے گھر کے در و دیوار پر عجیب سی ویرانی.... بس یہی کچھ ہے۔ تم ساتھ دوگی تو کچھ دن تک دھوپ کی سختی جھیل کر مرجھا جاؤ گی۔"

پھر دیکھتے ہی دیکھتے دو سال گزر گئے۔ ترلو نے بھلا مرجھانا کب سیکھا تھا۔ وہ تو اڑن کلی تھی.... سدیپ کے ساتھ اڑی اور اڑ کر دلی پہنچ گئی۔۔۔۔ شادی کے بغاوت بھرے فیصلے کو گھر والوں نے تھوڑی بہت ناراضگی کے بعد قبول کر لیا۔ تب سدیپ کی ایک ہندی رسالے میں معمولی سی نوکری تھی۔ اور ایک چھوٹا سا کرائے کا فلیٹ تھا۔ اپنی مسکراہٹ، اپنی باتوں سے ترلو اس چھوٹے سے گھر کو سجانا تو چاہتی تھی، مگر کبھی کبھی.... سدیپ کی مجبوریاں اور آنکھوں میں اتری نراشا اسے بوجھل کر دیتی۔۔۔۔

سدیپ اسے پہلی ہی نظر میں جینئس لگا تھا۔ سو کالڈ جینئس مگر رومانٹک۔ اس کی باتیں، اس کی گفتگو اور بہت کچھ کر گزرنے کی خواہش۔ شام میں تھکا ہارا گھر لوٹنے والا سدیپ اب اسے پہلے والا سدیپ نہیں لگتا تھا۔ اعتماد اور مضبوطی سے بھرا۔ کبھی ایسا

بھی ہوتا جب کسی مرجھائی ہوئی بیل کی طرح جھول کر، کھلائے لہجے میں وہ اس سے سوال کر بیٹھتا.....

"ترلو، مجھ سے خوش نہیں ہو، نا....."

"تمہیں کیا لگتا ہے....؟"

"مجھے یہی لگتا ہے........ میں تمہیں خوش نہیں رکھ سکا۔ تم شاید کہیں اور زیادہ خوش رہتیں" وہی بوجھل فلسفہ......"ترلو، سچ بتانا، کبھی اپنے فیصلے پر افسوس تو نہیں ہوتا، نا۔؟"

وہ پورے وجود سے مسکرا کر کہتی۔ "سدیپ! تم مجھے کبھی نہیں سمجھو گے۔ میں عارضی خوشیوں پر فخر کرنے والی لڑکیوں میں سے نہیں ہوں۔ تم مجھے میری نظروں میں چھوٹا کیوں کر دیتے ہو.....؟"

بس وہی پست قد..... پست احساس۔ نا امیدی .... خوش فہمیوں کے ٹوٹتے گھونسلے.... اور غم زدہ کر دینے والا بوجھل پن ۔۔۔۔"بہت زیادہ اعتماد رکھنے کا بھی کبھی کبھی یہ نتیجہ نکلتا ہے ترلو..... میں سوچتا تھا، کروڑوں کی آبادی میں شاید میں اپنے ڈھنگ کا پہلا آدمی ہوں..... جسے دوسروں سے زیادہ، بہت زیادہ اور بہت کچھ چاہنے اور رکھنے کا حق ہے۔ مگر.... اب کیا ہے.... خود پر اور زمانے پر غصہ برسانے والا اپارچنسٹ.... اور ایک خبطی PREJUDICE ..... ایک عجیب سی اداسی ہے جو مجھے کھائے جا رہی ہے.... ترلو، جو مجھ سے کہتی ہے.... پوچھتی ہے..... کہ میں تمہیں لایا کیوں؟ جب تمہیں اسی حال میں رکھنا تھا۔ مجھے لگتا ہے.... تم بھی اسی احساس سے دو چار ہو، مگر زبان سے کہتے ہوئے شرماتی ہو۔"

"پاگل ہو".... ترلو زور سے ہنسی۔ "اچھا سنو، ایک بات کہوں، ناراض تو نہیں ہو گے؟"

"ہو بھی گیا تو تمہیں کیا؟" سدیپ نے نارمل ہونے کی کوشش کی۔

ترلو اس پر نچھتے ہوئے بولی۔ "میں بھی کچھ کرنا چاہتی ہوں.... کرنے دو نا..

تمہیں اکیلے اتنا کچھ کرتے دیکھ کر اچھا نہیں لگتا۔ میں کچھ کروں تو... تمہیں برا تو نہیں لگے گا......؟"

ترلو نے دیکھا، سدیپ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ جیسے اپنے آپ سے لڑتے ہوئے اسے کافی تکلیف ہو رہی ہو.... پھر اس نے ایسے سر جھکا لیا۔ جیسے خود کی داستان میں شکستگی کا ایک اور باب جوڑ لیا ہو....

(۳)

دور درشن کے اندر کی دنیا شروع شروع میں ترلو کے لیے ونڈر لینڈ کی طرح تھی۔ اسے پتہ نہیں تھا کہ بچپن سے بوند بوند کر کے جو خواب وہ اپنے اندر جمع کرتی آئی ہے، اس کا ایک دروازہ یہاں سے کھلتا ہے۔ چھوٹے سے شہر میں پلی بڑھی ترلو کے لیے یہ سب کچھ حیرت زدہ کرنے والا تھا۔ مگر اس نے سدیپ کا ساتھ دینے کو کہا تھا۔ مسٹر فریرا، مسٹر ناگارجن، مسٹر سبھروال.... دور درشن کی بڑی بڑی کرسیوں پر عہدوں اور رتبوں کی چمکتی نیم پلیٹ لگائے آفیسر اس سے اتنے پولائٹ اور مہذب انداز میں گفتگو کرتے کہ اس کا سارا HESITATION جاتا رہا۔ وہ صبح ہاتھ میں پرس لٹکا کر نکلتی اور شام کو واپس آنے پر سدیپ کو اپنے سارے تجربے سناتی۔

وہ JONATHAN SEAGULL کی طرح اڑان کی حد کو توڑ کر آکاش کی اننت سیماؤں کو چھو لینے کی خواہش مند تھی۔ ہاں کبھی کبھی ترلو کو ڈر بھی لگتا تھا۔

جیسے اس دن سدیپ نے مذاق میں کہا تھا...... "جانتی ہو ترلو، جناتھن سی گل کو لمبی اڑان کا انعام کیا ملا...... اسے OUT CAST کر دیا گیا۔"

وہ ایک دم چونک کر اس کی طرف پلٹی۔ "کہیں تم میں ایک غیرت مند شوہر تو نہیں پل رہا ہے؟"

"شٹ...... ایسا ہوتا تو میں تمہیں باہر کام کرنے کی اجازت ہی کہاں دینے والا تھا..."

سدیپ نے اس کی گردن کی ڈھلان اور سینے کی پہاڑیوں کے پاس KISS کرتے ہوئے کہا۔۔۔ "میں نے دوسروں کی بات کی۔۔۔ہمارے بیچ آیا ہوا ہر آدمی دوسرا ہے۔ AN OTHER MAN ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یہی دوسرا آدمی پھر ایک دن تم پر سوار ہو جاتا ہے۔ ایسے"۔۔۔۔ اس نے گھوڑا بن کر دکھایا۔۔۔۔ "اور پیچھے پیچھے تمہاری کھلی اڑاتا ہے۔ SWINE-BREAD ۔۔۔۔"

"سدیپ! دوسرے آدمی کی یہ FEELING تمہاری اپنی تو نہیں ہے۔۔۔" ترلو اپنے چہرے کو سدیپ کے چہرے کے بالکل پاس لے آئی۔۔۔ "سچ بولنا، چپکے سے تمہارے اندر آکر بس جانے والا ایک مرد۔۔۔ جسے تشویش کی کھجلی ہونے لگی ہو۔۔۔۔ اس کی بیوی۔۔۔۔۔ اور پرایا مرد۔۔۔۔"

بھرا بھرا چہرہ۔ دمکتے گال اور پھولے ہونٹوں کی ہر چیز کو اسرار میں ڈبوتی ہوئی۔ ترلو کی انگلیوں نے حرکت کی۔۔۔ "دور درشن اور فلم۔۔۔۔۔ یہاں قدم رکھنے والی ہر لڑکی کو پہلے پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کے بھوت محل سے ڈرایا جاتا ہے۔۔۔۔ ربش۔۔۔۔ ایسا کچھ نہیں ہے وہاں۔۔۔" ترلو اس پر جھکتی چلی گئی۔۔۔۔۔ "میرے سدیپ، کم از کم میں ایسی نہیں ہوں۔۔۔۔ اتنا یقین تو میرے بارے میں تم رکھ ہی سکتے ہو۔۔۔۔"

دور درشن ریسپشن پر پہلی بار اس سے ٹکرائی تھی صوفیہ۔۔۔ کشمیر کی حسین وادیوں سے دلی تک کے سفر کے بیچ ۳۲ سال نکل گئے تھے۔۔۔ ۳۲ بہاریں اور ۳۲ خزائیں۔۔۔ دبلی پتلی اور لمبی سی۔۔۔ پہلے کلکتہ ٹی وی کیندر سے جڑی تھی۔ کچھ پروگرام بھی بنائے۔ پھر وہیں ایک لڑکے، ذوالقرنین بٹ کے ساتھ بھاگ کر دلی آئی۔ صوفیہ فلمیں بناتی تھی اور ذوالقرنین ڈائریکٹ کرتا تھا۔ ان کے بیچ سینڈوچ کی ایک کڑی تھا۔۔۔۔۔ رنگنا تھن۔ صوفیہ کو انگریزی نہیں آتی تھی، مگر دور درشن میں اپنے پاؤں پھیلانے کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب اس کے پاس تھیں۔ پہلی ہی ملاقات میں صوفیہ اس سے کھل گئی۔ اس نے بتایا کہ وہ ایک کامیاب پروڈیوسر بننا چاہتی ہے۔۔۔۔ اس نے ترلو سے پوچھا۔

"تم اسکرپٹ لکھ سکتی ہو؟"

"وہائی ناٹ۔"

"میرے ساتھ جڑ جاؤ۔ ساتھ مل کر فلمیں بنائیں گے۔"

یہیں اس نے لمبی لمبی ڈینگیں مارنے والے ذوالقرنین بٹ کو دیکھا تھا۔ پیڑ کے کھکھل کی طرح..... جیسے عرق عرق چوس لیا گیا ہو۔ عمر ۳۰ کے آس پاس مگر جاذبیت نام کو نہیں۔ ہالی وڈ اور بالی وڈ کے فلم میکرس کی ایک ہی بار میں چھٹی کر دینے والے بٹ کے بارے میں اسے کئی اہم باتیں معلوم ہوئیں۔ جیسے دونوں ایک ہی ساتھ رہتے ہیں۔ ایک ہی فلیٹ میں۔ ایک چھت کے نیچے.....

صوفیہ اسے ایک شاداب ندی کی طرح نظر آئی اور ذوالقرنین اس ساحلی مٹی کی طرح، ندی کی لہریں جس سے ٹکرا کر واپس لوٹ گئی ہوں.... اور مٹی کی نمی سوکھتے سوکھتے اس میں گڑھا بنا گئی ہو۔

پھر اسے رفتہ رفتہ صوفیہ کے بارے میں کئی باتیں معلوم ہوئیں۔ سبھروال صاحب یعنی ڈی جی کی KEPT .... آکاش وانی کے ریسیپشن کے کاؤنٹر پر بیٹھنے والے دتا نے بتایا تھا.... "ترلو اس سے ملنا بھی مت.... صوفیہ فلمیں نہیں بنائے گی تو کون بنائے گا...؟"

مگر صوفیہ جب سامنے آتی تو وہ کہیں سے بھی میلی کچیلی یا گندی نہیں لگتی.... وہ ہر بار مصروف نظر آتی۔ بھاگم بھاگ میں.... ہاتھوں میں یومیٹک کیسٹیں لیے.... کوئیکیز (QUICKIES) ، ڈکومینٹری، فیس ان دی کراؤڈ کے نئے نئے پروگرام کے ساتھ.... ہاں ہر بار وہ پچھلی ملاقات سے زیادہ بھری بھری اور پھیلی لگتی۔ جیسے ہر بار پمپ کے ذریعے ہوا بھر کر اسے تھوڑا سا پھلا دیا گیا ہو۔ وہ ہر بار جلدی میں ہوتی۔ مسٹر سبھروال سے ملنا ہے، مسٹر فریرا سے .... تیہاڑی سے اور.... علاء الدین کے جن کی طرح وہ آناً فاناً نظروں سے غائب ہو جاتی....

"یہ میڈیا".... ایک بار اس نے سدیپ سے کہا تھا.... "لوگ غلط نہیں

ہوتے، صوفیہ جیسی لڑکیوں نے اس میڈیا میں گندگی پھیلا رکھی ہے..... کبھی کبھی خواب کے پیڑوں پر پکے پھل کو توڑنے کے لیے اس سطح پر بھی جایا جاتا ہے۔ صوفیہ نے ہی کہا تھا۔ کیا ایسا ہوتا ہے سدیپ؟"

"ابھی تم نئی نئی ہو" سدیپ نے ٹالنے کی کوشش کی۔

"لوگ بدن کیسے بدلتے ہیں.... ایک دوسرا بدن...... پرایا بدن.... غیر مرد کا بدن..."

سدیپ کو لگا، وہ پوچھے........ ترلو، آخر تم ان نفسیاتی گرہوں کو کھولنے کی اتنی فکر مند کیوں ہو؟ گرہیں کھولتے ہوئے بھی ایک دن جائز ناجائز کی دیواریں ٹوٹ جاتی ہیں...... تب.... پتہ نہیں رشتے قائم رہتے ہوں گے بھی یا نہیں۔ رہتے ہوں گے۔ مگر وہ ایسے رشتوں کو بھلا کب ماننے والا تھا...

ترلو خود میں سمٹی ہوئی، بولے جا رہی تھی... یقین کرو، بھیڑ میں کوئی مجھ سے ٹکرا بھی جائے سدیپ! تو میں سہم جاتی ہوں.... کسی سے انگلی بھی مس کر جائے تو .... تو میرے اندر زہر سا گھل جاتا ہے۔ لوگ اس سطح پر... اور بھی بہت سے کام ہیں...... اگر کوئی ناخوشگوار واقعہ ہو جائے تو....؟"

ترلو کہتے کہتے چپ ہو گئی۔

رات کافی ہو گئی تھی۔ سدیپ نے بتی بجھا دی۔ ترلو کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔ سدیپ نے اسے چھوا تک نہیں۔ وہ بس، بستر پر ترلو سے اپنا فاصلہ ناپتا رہا۔ ایک کمزور سا آدمی، اس کی ایک ہلکی سی جیب اور دہلی مہانگر کی تیز رفتاری کا ساتھ دینے والی ترلو۔ کیا اسے بہت کچھ سہتے جانا ہے ابھی ...... اسی طرح .... کیا سچ مچ؟

(۴)

ڈی ٹی سی (ڈائرکٹر آف ٹیلی ویژن سینٹر)، پروگرام کنٹرولر اور ڈائریکٹر جنرل

کے کمروں کی سیڑھیاں ناپتے ناپتے ترلو کی جھولی میں کئی پروگرام آ گرے.......

ترلو کے سامنے ایک نیا جہان آباد تھا۔ تصور میں خود کو بہت خوشحال دیکھنے کی آرزوئیں قید تھیں... سب سے پہلے اسے کمیشن کے پروگرام ملے..... یعنی دور درشن کے لیے اسے پانچ پانچ منٹ کی کچھ QUICKIES بنانی تھیں.. جہیز، پٹرولیم کی بچت، لڑکیوں کی تعلیم اور پیڑ پودے اگاؤ جیسے موضوعات پر اسے چھوٹی چھوٹی اچھی اسکرپٹ کی ضرورت تھی۔ سدیپ نے اس کا ساتھ دیا... اب ضرورت تھی ایک چھوٹی موٹی یونٹ کی... کیمرہ مین کے لیے صوفیہ سے اس کی بات ہو چکی تھی۔ صوفیہ نے اسے رنگناتھن کا نام سمجھایا تھا... اور رنگناتھن سی پی سی سے وقت نکال کر مکمل دو دن اسے دینے کو راضی ہو گیا تھا... رنگناتھن نے ہی اسے کریڈٹ پر EQUIPMENTS وغیرہ کا بھی بندوبست کرا دیا تھا..... آرٹسٹ، ساؤنڈ ریکارڈسٹ، یہاں تک کہ اسپاٹ بوائز، ایکوپمنٹس، اسٹوڈیو سے شوٹنگ اسپاٹ لانے اور لے جانے والی ٹیکسی وغیرہ کی ساری سہولتیں رنگناتھن نے فراہم کرا دی تھیں.....اب کمی تھی تو صرف چاند چھو لینے تک کی.....

بالکل ہی نیا تجربہ....... شوٹنگ شروع ہوئی۔ رنگناتھن نے اپنے اسسٹنٹ کے سہارے کیمرہ سنبھال لیا.... پھر مانیٹر پر ترلو کو سین کی پوزیشن سمجھا دی...... اس کے بعد رنگناتھن نے پوچھا.......

"آپ مطمئن تو ہیں نا میڈم؟"

اسے سب کچھ نیا نیا اور اچھا لگ رہا تھا۔ اس نے اشارہ کیا....... روشنیاں جھلملائیں...... اسپاٹ بوائے ادھر ادھر بھاگتا رہا۔ آرٹسٹ ریہرسل اور شاٹ دینے میں مصروف رہے.... اور.....

ترلو کو بس یہی افسوس رہا کہ اس دن سدیپ نہیں آیا تھا۔ پتہ نہیں کن جذبوں کے تحت وہ سارا دن شوٹنگ میں الجھی رہی رات گئے شوٹنگ پوری ہونے کے بعد ٹیکسی سے EQUIPMENTS لے کر اسٹوڈیو واپس گئی.... وہاں سے گھر

لوٹنے میں رات کا ایک بج گیا تھا۔ اس روز وہ کافی پرجوش تھی۔۔۔۔ اسے یقین تھا، سدیپ کو جب وہ اپنے نئے تجربے کی تفصیل سنائے گی تو وہ حیران رہ جائے گا۔۔۔ اور کہے گا۔

"ترلو۔۔۔۔ رئیلی آئی لو یو۔ یو آر گریٹ۔۔۔۔۔۔"

مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ دروازہ کھولنے والا سدیپ خود سے کافی لڑا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔۔۔۔۔۔ "اتنی دیر کیسے ہو گئی؟"

وہ حیرت سے بولی۔۔۔۔۔۔ "سدیپ، دیر ہو جاتی ہے۔ شوٹنگ معمولی چیز تو نہیں۔۔۔۔۔۔ تمہیں تو خود ساتھ چلنا چاہیے تھا۔"

"پھر بھی اتنی رات گئے"۔۔۔۔۔۔ سدیپ تھوڑا نارمل ہوا۔۔۔۔۔۔ مسکرانے کی کوشش کی۔۔۔۔۔ "خیر چھوڑو۔ بتاؤ کیسا رہا؟"

تب تک ترلو بجھ چکی تھی۔ وہ کتنا کچھ بتانا چاہتی تھی۔ ایک ایک شاٹ کی تفصیل۔۔۔ کہاں یہ تھکا دینے والی مقروض زندگی۔ ہر ہر پل کا حساب کتاب۔۔۔۔ اور کہاں شوٹنگ کا دن۔۔۔۔ وہ پورا دن مہارانی کی طرح ناچتی رہی تھی۔۔۔۔ میڈم میڈم کی آوازیں۔۔۔ شوٹنگ دیکھنے جمع ہو گئے لوگوں کی حیرت زدہ آنکھیں۔۔۔۔ اسپاٹ بوائے سے لے کر رنگناتھن تک کی، سب کی آنکھیں اس کے اشارے کی محکوم تھیں۔۔۔۔۔۔ مگر اسے افسوس ہوا، اتنا چاہنے والے سدیپ نے اس کے سارے ولولوں کا رنگ زرد کر دیا تھا۔

ترلو نے محسوس کیا، پانچ منٹ کی فلم بنانا بھی کیا مشکل کام ہے۔ رف کٹس، پھر ایڈیٹنگ، میوزک ڈالنا، کتنی کتنی بھاگ دوڑ۔۔۔۔ ایڈیٹنگ روم میں بیٹھنا کتنا بور کام ہے۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔۔ ترلو تو اڑن کلی تھی۔۔۔۔۔ وہ بڑی بن گئی تھی۔ اپنے اور سدیپ کے گھر والوں کی نظر میں۔ ملنے جلنے والوں کی نگاہوں میں۔۔۔۔۔ مگر وہ کتنی بڑی بنی تھی۔۔۔۔۔۔ یہ بات تو صرف وہی جانتی تھی۔

(۵)

دہلی کی بھاگتی دوڑتی زندگی کا ایک حصہ بنتے بنتے بھی، ترلو جہاں تھی وہیں رہی۔ یہ الگ بات ہے کہ اس میں خود اعتمادی تو آئی تھی مگر قدم قدم پر پھیلے مسائل اسے پھر سے وحشت کے اسی بھنور میں کھینچ کر ڈال دیتے جہاں سے وہ نکلنے کا راستہ تلاش کر رہی ہوتی۔۔۔ چھوٹی چھوٹی QUICKIES اور ڈکومینٹری بنانے سے زندگی کے مسائل کہاں حل ہونے والے تھے؟ اس بیچ سدیپ کی بیماری بھی تھی۔۔۔۔۔۔ جب تب سدیپ ایک عجب طرح کا بوجھل پن اوڑھ کر سب کچھ چھوڑ کر گھر بیٹھ جاتا۔ اسٹوڈیو، آرٹسٹ .... کیمرہ مین، ساؤنڈ ریکارڈسٹ وغیرہ کا حساب کرتے کرتے وہ پھر وہیں آجاتی جہاں سے SEA-GULL نے اپنی اڑان شروع کی تھی۔

اس بیچ سدیپ نے کپڑوں کی طرح مکان بدلے۔۔۔۔۔۔ اندر لوک، لودی کمپلکس، گول مارکیٹ، گپتا کالونی، لنک روڈ، اسٹائل آف لیونگ میں تھوڑی بہت تبدیلی تو آئی مگر زندگی سمٹ کر اسی مرکز پر محدود رہی جہاں سے وحشت سر نکالتی ہے اور مسائل برچھیوں کی طرح گھائل کرتے ہیں۔

اور ہر بار ۔۔۔۔ شوٹنگ، دور درشن کی دنیا سے باہر نکل کر وہ سدیپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھتی "سدیپ! کبھی مجھ پر شک تو نہیں کرتے ہو تم؟"

سدیپ بجھا ہوتا تو وہ جھگڑنے پر آمادہ ہو جاتی۔۔۔ "اتنے بجھے سے کیوں رہتے ہو۔۔۔۔ اس عمر میں۔۔۔ پہلے تو ایسا نہیں تھا۔"

وہ غور سے سدیپ میں داخل ہونے کی کوشش کرتی تو لگتا، سدیپ میں ضرورت سے زیادہ سمجھ دار ایک بوڑھا داخل ہو گیا ہے۔۔۔ جس کے تصور کی اپنی دنیا ہے اور جہاں حیات و ممات کے فلسفے قید ہیں ۔۔۔ جس نے دوسروں کے زاویے سے الگ، زندگی کے بارے میں اپنا الگ ہی، نظریہ حیات بن رکھا ہے۔۔۔ جو کبھی کبھی لطف و انبساط کی کیفیت سے باہر نکل کر ایک جھکی، غصہ ور بوڑھا بن

جاتا ہے... ہاں وہی سدیپ جسے شادی کے کئی برس بعد بھی اس نے بچوں جیسا شرارتی پایا تھا... مگر اب، وقت کے ساتھ زمانہ اور روایت پسندی کی دھول اس کے چہرے پر سمٹتی جارہی تھی...

اس افراتفری اور بھاگ دوڑ کے نتیجے میں ترلو نے اپنا زیاں زیادہ کیا... وہ دوبارہ ماں بننے والی تھی اور دونوں ہی بار مصروفیت اور بے احتیاطی نے اسے ماں بننے کے سکھ سے محروم رکھا.... دکھ کا اپنا موسم اور اپنی کیفیت ہے... ترلو جب اپنا محاسبہ کرتی تو دکھ کی تفصیل سکھ کے مقابلے میں زیادہ پاتی.... ہاں وہ ٹوٹنے لگتی تو سدیپ کی بانہیں اسے سہارا دینے کو موجود ہوتیں اور ایک غمزدہ آواز....

"ترلو! ذہانت، مطالعہ اور تجربوں سے زیادہ ضروری ایک شے ہے ...... قسمت .... جو ہمارے پاس نہیں ہے۔"

ترلو کو لگتا، سدیپ سچ کہتا ہے۔ لیکن قسمت سے بھی کوئی بڑی چیز ہے، جو صوفیہ کے پاس ہے.... اور صوفیہ جیسی بہت سی خواتین پروڈیوسر کے پاس، جو بیورو کریٹس کی بیویاں ہیں، جن کی پہنچ آئی اینڈ بی کے منسٹر سے لے کر سارے پاور فل لوگوں تک ہے.... اور جو کام یہ کر سکتی ہیں، وہ نہیں کر سکتی .... وہ ان کے ساتھ کمرہ بک نہیں کر سکتی۔ بیڈ شیئر نہیں کر سکتی... ان کے ساتھ کافی ہاؤس یا کسی قیمتی ریستوران میں ایک شام نہیں گزار سکتی... ایک کپ کافی نہیں پی سکتی...

اس بیچ صوفیہ نے ذوالقرنین بٹ کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا تھا۔ اب اس کا سب کچھ رنگنا تھن تھا۔ وہی سی پی سی کا کیمرہ مین ...... صوفیہ کے سامنے بھیگی بلی کی طرح کھڑا .... سہما سہما سا اور ..... صوفیہ پھیلتی جارہی تھی.... اب وہ پہلے کی طرح دبلی پتلی نہیں تھی .... ان برسوں میں اس نے اپنے جسم میں خاصی چربی اکٹھی کرلی تھی۔ اب وہ چوڑی ہوئی شے تھی...... گوشت کی ایک بے ڈول، فربہ عمارت....

صوفیہ نے کئی بار اس سے کہا۔

"ترلو، سوچتی کیا ہو، مجھ سے جڑ جاؤ۔"

وہ بس مسکرا کر رہ جاتی۔

"دوسرے راستے سے آؤ گی تو بہت وقت لگ جائے گا۔"

"میرے لیے یہ دوسرا راستہ ہی ٹھیک ہے۔"

اب صوفیہ ٹوٹی پھوٹی انگلش بھی بولنے لگی تھی ..... پہلے سے کہیں زیادہ قیمتی ملبوسات اور زیور اس کے جسم پر نظر آنے لگے تھے ..... اس نے گاڑی بھی خرید لی تھی۔ گھر پر دو دو فون لگ گئے تھے ..... اور ادھر ترلو تھی۔ شوٹنگ کے لیے آرٹسٹ، ایکوپمنٹ وغیرہ کے فون کرنے کے لیے بھی اسے گھر سے نکل کر ٹیلی فون بوتھ تک جانا پڑتا تھا۔ وہ بس میں سفر کرتی تھی، یعنی وہی رفتار بے ڈھنگی، اور اس پر کبھی کبھار سدیپ کے حملے بھس میں چنگاری کی طرح کام کرتے۔

"جانتی ہو، تمہیں اتنا کام کیوں کر ملا؟"

وہ فخر سے کہتی "یہ میری اپنی کوششیں تھیں۔"

"غلط۔ اس لیے کہ تم لڑکی ہو۔"

"تم JEALOUS ہو۔"

"نہیں۔ میں اسکرپٹ یا پروجیکٹ لے کر جاؤں تو چار سال میں بھی بغیر APPROACH کے یہ کرسی والے مجھ سے دو منٹ بات بھی نہیں کریں گے ..... اس دنیا میں ایسا ہی ہوتا ہے ..... لڑکی ہونا اپنے آپ میں ایک بہت بڑا کریڈٹ ہے ..... اور تمہیں اسی کا فائدہ پہنچ رہا ہے۔"

"یہ تم کہہ رہے ہو سدیپ ....." وہ بجھ گئی۔ "میری ساری بھاگ دوڑ، کوششوں کو محض ایک لفظ میں صابن کے جھاگ کی طرح اڑا دے رہے ہو....."

اس رات وہ جھگڑا کر کے الگ لیٹ گئی ..... سدیپ اس سے اس کیڑے کی طرح نظر چرا رہا تھا، جو بار بار بھگائے جانے پر بھی اس کے بدن پر ہلہ بول رہا ہو .....

اس کی انتھک محنت ..... بھاگ دوڑ .... کیڑا اس کے بدن پر پھیل رہا تھا .... شوٹنگ، ڈائریکشن ..... ایڈیٹنگ ... چھوٹے شہر سے مہانگر کی اڑان ..... کیڑا بدن پر چپکے چپکے اپنے پاؤں گڑا رہا تھا .... معصوم گھریلو لڑکی سے کچھ بننے کی لگن میں غیر مردوں سے ملنا، اس آفس سے اس آفس، کمرے کمرے چکر کاٹنا ..... چپل گھسنا .. ...دو دو معصوم جانوں کا زیاں ہونا .....

کیڑا بدن پر لگاتار اپنے پاؤں گڑائے جا رہا تھا۔

(۶)

بات کافی پرانی تھی لیکن ترلو کو یاد رہ گئی تھی۔

اس دن محلے میں ایک حادثہ ہو گیا تھا۔ ہاں، حادثہ کہنا ہی ٹھیک ہو گا۔ اس کے گھر سے آٹھواں مکان چھوڑ کر نواں مکان ہے .... سونا جیولرس کا .... اس کی لڑکی نے پولیس میں کمپلین لکھوائی تھی کہ اس کا باپ اس کے ساتھ زبردستی کرتا ہے .... نہیں مانو تو پیٹتا ہے .... سونا جیولرس کے مالک یعنی سونا رام کی بیوی کو مرے ہوئے زمانہ گزر چکا تھا۔ لے دے کر اولاد کے نام پر یہی لڑکی بچی تھی۔ پتہ نہیں یہ سلسلہ کب سے شروع تھا .... پولیس جس وقت سونا رام کو گرفتار کر کے لے گئی، اس کے محلے والے اس پر تھو تھو کر رہے تھے۔

"اپنی لڑکی کے ساتھ .... ہے رام .... کیسا زمانہ آگیا ہے۔"

شاید اس سے زیادہ ذلیل اور شرمناک کوئی دوسری بات نہیں ہو سکتی تھی .... اس رات اس حادثہ کا عکس سدیپ کے چہرے پر بھی تھا ....

کھانے کی میز پر ترلو نے پوچھا .... "سدیپ، کیا تمہیں نہیں لگتا کہ ایسے باپوں کو .... مطلب ہے جیسا سونا رام نے کیا، کیا اسے زندہ رہنے کا کوئی حق پہنچتا ہے۔"

سدیپ چپ رہا۔

ترلو پھر بولی .... "ذرا سوچو۔ اس کی لڑکی نے ہمت تو کی .... پر اس کا کیا

ہو گا۔۔۔ آتے جاتے لوگ کیا اس کا جینا دو بھر نہیں کر دیں گے۔۔۔ پتہ نہیں ذہنی و جسمانی اذیت جھیلتے ہوئے وہ زندہ کیسے رہی۔"

سدیپ کے اندر جیسے کوئی لاوا کھول رہا تھا۔ وہ بولا۔۔۔ "باپ بیٹی، یعنی مقدس رشتوں پر قائم ہونے والے جنسی رشتے ۔۔۔ ابھی اس موضوع پر ریسرچ کی ضرورت ہے۔۔۔ سونارام کی بیوی عرصہ ہوا مر چکی تھی۔ بوڑھے کے اندر آگ تو دبی ہوگی نا، ترلو۔۔۔۔"

ترلو ایک دم سے چونک پڑی۔ "تو اس کے لیے اس کی اپنی لڑکی رہ گئی تھی کیا؟"

"نہیں۔ اپنی لڑکی سے ایسے رشتے کے بارے میں جائز، ناجائز کا اسے بھی پتہ ہو گا۔۔۔ اونچ نیچ جانتے ہوئے بھی بہت سی باتیں ہو جاتی ہیں۔ آگ کا رہ رہ کر بھڑکنا، ایک جوان لڑکی کے کپڑوں، خاص کر اندر پہنے جانے والے کپڑوں کا بے ترتیبی سے ادھر ادھر پڑا ہونا۔۔۔ باپ کا اپنی نظروں میں اقبال جرم کی طرح امتحان لینا۔۔۔ بیٹی سے نظریں بچانا، اس کی آنکھوں سے، اس کے پھیلتے جسم سے۔۔۔ اور اندر پہنے جانے والے کپڑوں سے۔۔۔۔ کیا لگتا ہے تمہیں؟ دوسرے باپ ایسے مناظر سے بچ پاتے ہوں گے ترلو۔۔۔۔؟"

ترلو چیخی۔ "سدیپ، کیسی باتیں کر رہے ہو تم؟"

سدیپ سنجیدہ تھا۔۔۔ "میرے بارے میں جلد بازی میں سوچ رہی ہو تم۔۔۔ میں کہہ رہا تھا۔۔۔ اس کے باوجود۔۔۔ یعنی ان سب کو دیکھتے ہوئے بھی، اندر ذہن میں کوئی گندگی پیدا نہ ہو، ایک باپ اس کے لیے تیار رہتا ہے۔۔۔ مگر سونا رام۔۔۔۔ کسی ایک لمحے کی کمزوری اسے کھا گئی ہوگی۔۔۔ اور رشتے چٹخ گئے ہوں گے۔۔۔۔ بس ایک بار کا چٹخنا کافی ہوتا ہے۔ اس کے بعد بے نام تسلیوں کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔"

اس کے چہرے پر عجیب سا روکھا پن تھا۔ دانت آپس میں سٹ گئے تھے۔ چہرے پر ایک خاص طرح کا غصہ چھپا تھا۔

"وہ لڑکی پولیس میں کمپلین کرنے سے پہلے مر کیوں نہیں گئی۔ یا اپنے باپ کو

شوٹ کیوں نہیں کیا؟۔۔۔۔ کیا اسے لذت مل رہی تھی۔۔۔ نہیں ترلو! مجھے اس طرح غصے سے مت دیکھو۔۔۔ ترلو، رشتے یہاں ٹوٹتے ہیں۔۔۔۔ ایک بے حد کمزور سے لمحے میں۔۔۔ جسے ہم سمجھ نہیں پاتے۔۔۔۔"

"اسے کیا کرنا چاہیے تھا" ترلو چیخی۔۔۔۔"زندہ رہنا بس تم مردوں کو ہی آتا ہے۔۔۔۔ مجبوریاں۔ کون کس مجبوری سے بندھا ہے، تم کیا جانو۔ اس کی ہمت کی داد نہ دو مگر۔۔۔ جو وہ سہتی رہی اس پر الزام تو نہ رکھو۔۔۔"

"نہیں۔ میں الزام نہیں لگا رہا۔ کچھ اور سوچ رہا تھا۔ دراصل جب کل سے آج کا موازنہ کرتا ہوں تو لگتا ہے، جہاد نفس کی ہم سے بہتر کوئی مثال نہیں۔ کل پولی گیمی (POLYGAMY) کا چلن تھا۔ کوٹھے پر آنے جانے میں شان سمجھی جاتی تھی۔ عام طور سے رکھیل یا لونڈیوں کو رکھا جاتا تھا۔ دیوتاؤں اور اوتاروں کی کہانی دیکھ لو۔ LESBIAN اور HOMO مرد کل بھی ہوتے تھے۔ آج تہذیب کے سمٹتے سمٹتے کبھی کبھار اس طرح کا حادثہ ہو جائے تو زیادہ رنج مت پالو۔۔۔۔ مہذب ہوتے ہوئے بھی کہیں ایک سویا ہوا جنگلی پن سب میں موجود ہے۔۔۔"

سدیپ اس کے ہاتھوں کو سہلا رہا تھا۔۔۔۔ ترلو خیالوں کی کسی انجان سی ترائی میں اتر گئی تھی۔ ایک بہت کمزور لمحہ۔۔۔ کسی ایک لمحے میں یہ کمزوری سمٹتی ہی کیوں ہے۔۔۔ اور سمٹتی ہے تو۔۔۔۔ بڑے بڑے بوجھل لفظ۔۔۔۔ منطق۔۔۔ اور تسلی جیسی چیزیں کیوں ہوتی ہیں۔۔۔۔ حیرت ہے، سدیپ جیسا آدمی بھی ان پڑھ اور جاہلوں کی طرح کیسے سوچنے لگا۔۔۔

سونا جیولرس کی بات آئی گئی ہو گئی۔ وہ بھول بھی گئی۔ دوردرشن کی بھاگ دوڑ سے اتنی فرصت ہی اسے کہاں ملتی تھی۔ زیادہ تر اسکرپٹ لکھنے کا کام سدیپ ہی کرتا تھا۔ اس بیچ سدیپ ہندی کی کئی پتریکاؤں سے جڑا۔ پھر جہاں انا آڑے آئی، چھوڑتا چلا گیا۔ کئی کئی دن بیکار بیٹھنا ہوا۔۔۔۔ اتنی تسلی تھی کہ دوردرشن کا پروگرام تو ہے ہی۔۔۔۔ وہ چڑھاتی بھی تھی۔ "دیکھ لینا پروگرام ملتا رہا تو، تمہیں کچھ بھی کرنے کی

ضرورت نہیں ہے۔ بس آرام سے گھر بیٹھ کر لکھتے رہنا۔۔۔۔" سدیپ کی آنکھوں میں طنز کا شعلہ لپکتا۔۔۔ "تاکہ لوگوں کے طعنے جھیل سکوں۔ کماؤ بیوی کی روٹیاں توڑ رہا ہے۔"

وہ حیرت سے سدیپ کو دیکھتی۔۔۔ "کیا تم ایسا ہی سمجھتے ہو؟"

"تم نے بھی آخر مجھے کیا سمجھ رکھا ہے؟۔۔۔ میں ایک دم سے نٹھلا اور بے کار تو نہیں ہوں۔۔۔ جہاں انا آڑے آجاتی ہے، وہاں سمجھوتہ نہیں کرسکتا۔ بس یہی غلطی ہے میری۔۔۔"

کبھی کبھی دوردرشن میں ملتے جلتے اسے دیر ہوجاتی تو دیکھتی، سدیپ ناراض ہوگیا ہے۔ وہ اسے دیر تک سمجھانے کی کوشش کرتا ۔۔۔ "کبھی کوئی کمزور لمحہ ہمارے بیچ آیا تو۔۔۔ میرے پاس۔۔۔ تمہارے پاس۔۔۔ سمجھو اسی دن سے ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے مرگئے۔"

وہ خود کو فرینک ثابت کرنے کی کوشش کرتا۔ مان لو میرے ہی ساتھ ایسا ہو۔ کوئی لڑکی پسند آگئی۔ تب؟ کیا کوئی جھجھک ہوگی میرے اندر، تم سے کہنے کے لیے۔ ہوئی بھی تو نہیں ہونی چاہیے اور یہی بات اگر تمہارے ساتھ ہوئی تو۔۔۔؟ ایک پوری زندگی کسی کے ساتھ زبردستی بندھنے اور بوجھل ہونے کا احساس ہمارے بیچ نہیں ہونا چاہیے۔"

ترلو محسوس کرتی، سدیپ کے اندر کنفیوژن کی بڑی عجیب و غریب دیوار کھڑی ہے۔ وہ اس سے محبت بھی کرتا ہے۔ بے انتہا محبت۔ وہ اس سے ڈرتا بھی ہے۔ وہ اس کا کام کرنا پسند کرتا ہے۔۔۔ اور دل سے قبول بھی نہیں کرتا۔۔۔ وہ خود سے بھی گھبراتا ہے۔۔۔ اور لفظوں سے خود کو بار بار سیکولر اور فرینک ثابت کرنے کی مہر بھی لگانا چاہتا ہے۔ اور اس لیے کبھی بے نام سی وحشت اوڑھ لیتا ہے۔۔۔

ایسے موقع پر وہ کسی چھتنار برگد کی طرح اس پر چھاجاتی۔۔۔ اسے سمیٹ لیتی اور قطرہ قطرہ اس وحشت کو اس میں سے نکالنے کی کوشش کرتی۔

(۷)

خیالوں پر کائی کی طرح دھند جم گئی تھی۔۔۔

پچھلے کئی دنوں سے لگاتار بارش ہو رہی تھی۔ بادل کی کڑک، بجلی کی چمک اور گرج، اور موسلا دھار بارش۔۔۔ چھجے سے گرتی ہوئی پانی کی دھار۔۔۔ کھڑکی پر کھڑی ہو کر دھلی دھلی سڑک اور سڑک پر تالاب کی طرح جمع پانی کو دیکھنا اسے بے حد پسند تھا۔۔۔ آسمان میں جیسے سیندھ لگ گئی تھی۔ بارش رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ ایسے موسم میں ترلو رومانٹک ہو جاتی۔ پھر فوراً بجھ جاتی۔ سدیپ تب باہر نکلا ہوتا۔۔۔ گھر پر خالی سا بوجھل سناٹا جھول رہا ہوگا۔ سدیپ جب گھر واپس آتا، تب بھی برسوں کا بیمار لگ رہا ہوتا۔ وہ جتنی رومانٹک ہونے کی کوشش کرتی، سدیپ اتنا ہی زیادہ چڑچڑا ہو اٹھتا۔۔۔

"ہٹو بھی۔ یہ کیا پاگل پن ہے ترلو۔"

وہ مچلتی تو سدیپ اسے ڈانٹتا۔۔۔ "شادی کے بعد عورتوں میں کچھ زیادہ ہی سیکس آجاتا ہے۔۔۔ تم MANIAC تو نہیں ہو رہی ہو۔ باہر رہتی ہو۔ ڈر لگتا ہے۔"

"نہیں، تم مذاق تو نہیں کر رہے ہو سدیپ"

سدیپ کسی ایذارساں کی طرح ہنستا۔۔۔ "عورت میں سارے مرد ایک خاص طرح کا جنگلی پن کیوں ڈھونڈتے ہیں ترلو؟"

"میں کیا جانوں۔۔۔" ترلو برف کی طرح سرد ہو جاتی۔۔۔ چہرے پر آئے احساس کو چھپا نہیں پاتی تھی۔ اسے بجھا دیکھ کر سدیپ منانے کی کوشش کرتا "ترلو، میں تو یونہی مذاق کر رہا تھا۔۔۔"

ترلو غصے میں کہتی۔۔۔ "اپنے آپ کو سدھارو سدیپ۔۔۔ تمہارے احساسات کسی گندے اور دیہاتی گنوار کے میلے تلووں کی طرح ہوتے جا رہے ہیں۔۔۔ چیک یور سیلف۔"

☆☆

بارش ہو رہی تھی۔ کمرے میں آنے کے بعد لگا، اس کے اندر بھی موسلادھار بارش ہو رہی ہو۔ کڑک اور گرج کے ساتھ۔ جس دن بارش شروع ہوئی تھی اس دن وہ دور درشن میں ہی تھی۔ دوردرشن اسٹاپ پر بس سے اترتے ہلکی ہلکی بارش شروع ہو چکی تھی۔ منڈی ہاؤس کا چوک پار کرتے ہوئے وہ تھوڑی بھیگ گئی تھی۔ پرس سے رومال نکال کر اس نے اپنا چہرہ پونچھا۔ خود کو ٹٹولا۔ اس وقت وہ سرخ کلر کی ساڑھی میں تھی۔ اوپر سے بلاؤز کا حصہ پانی میں بھیگ کر جسم سے چپک گیا تھا۔۔۔ بلاؤز سے نیچے پیٹ ناف اور آس پاس کے مقام سب بھیگے تھے۔ اس نے سوچا۔۔۔۔

"وہ ملے یا نہیں ملے۔"

لیکن آج ملنا ضروری تھا۔ ڈائریکٹر جنرل مسٹر سبھراول نے اسے آج ہی کا وقت دیا تھا۔ وہ جس پروجیکٹ کے سلسلے میں ملنا چاہتی تھی وہ ایک ٹیلی فلم تھی۔ "ایڈونچر آف فارسٹ"۔۔۔۔۔۔۔انوائرمنٹ پر ۴۰ منٹ کی ٹیلی فلم۔۔۔۔۔۔۔ یہ پروجیکٹ اس نے قریب ۳ سال پہلے جمع کیا تھا۔ تین سال میں زبردست تبدیلیاں آئی تھیں۔ اس کی اپنی زندگی میں بھی اور دور درشن میں بھی۔ اس کے دہلی، ایل پی ٹی کے لیے جمع کیے گئے سارے پروگرام رد کردیئے گئے تھے۔۔۔۔۔۔ دور درشن نے کمیشن کا پروگرام بھی بند کردیا تھا۔ اس دوران وہ جو رائیلٹی کا پروگرام بناتی رہی تھی اس پر بھی روک لگ گئی تھی۔۔۔۔۔۔۔ ترلو نے کافی پروگرام بنا رکھے تھے۔ وہ اچانک بڑے خسارے میں آگئی۔ EQUIPMNETS ، آرٹسٹ، اسٹوڈیو وغیرہ کے پیسے بھرتے بھرتے بینک بیلنس بھی خالی ہوچکا تھا۔۔۔۔۔۔۔ اور گھر پر تھا اپنی انا اور وحشتوں کا اسیر سدیپ، جنینیں۔۔۔۔۔۔۔ مستقبل کا نوبل پرائز ونر۔۔۔۔

"نہیں ترلو۔ اس پروجیکٹ کو تو نکلنا ہی ہوگا۔۔۔ وہ بھیگ گئی ہے تو کیا ہوا؟ آج وہ بغیر ملے نہیں جائے گی۔"

ترلو نے رومال سے بدن پونچھا۔۔۔ پھر تیز قدموں سے ریسپشن کی طرف بڑھ گئی۔ انٹری فارم پر دستخط کرنے کے بعد وہ مسٹر سبھروال کے کمرے کی طرف بڑھی۔۔۔۔ یہ محض اتفاق تھا یا بارش کا کرشمہ کہ سبھروال نے اسے فوراً بلوالیا۔

اسے لگا، اندھیرے کمرے میں تیزی سے بجلی چمکی ہو۔۔۔ مسٹر سبھروال کے سامنے وہ ننگی ہوتی بچی ہو۔۔۔۔

وہ دھیرے سے مسکرائی۔ "سر، بارش میں تھوڑی بھیگ گئی۔"

"بارش تو ہوتی ہی اس لیے ہے۔۔۔۔"

اس نے دیکھا۔ سبھروال ضرورت سے زیادہ ہی مسکرا رہے تھے۔۔۔ بھیگ کر تم زیادہ اچھی اور سندر لگتی ہو"

"جی۔۔۔۔ سر۔۔۔۔؟"

"ہاں میں کہہ رہا تھا۔۔۔ تم نے فلموں میں کوشش کیوں نہیں کی؟"

"فلموں میں۔۔۔۔؟"

"اس میں برا کیا ہے۔ وہ بھی تو لڑکیاں ہی ہوتی ہیں۔"

اس نے حلق میں کچھ پھنستا ہوا سا محسوس کیا۔ مشکل سے اپنے اعتماد کو دوبارہ بحال کیا۔

"ساری سر۔ ایکٹنگ وغیرہ میں میری دل چسپی نہیں۔۔۔؟"

اس نے ٹھہر کر پوچھا۔۔۔۔ "ایڈونچر آف فارسٹ کا کیا ہوا سر۔۔۔۔؟"

سبھروال ہنسے۔۔۔۔ "تمہارا کام تو ہو ہی جائے گا ترلو۔ نہ ہونے کا سوال نہیں لیکن۔۔۔۔" سبھروال نے ایک سگار سلگایا۔۔۔۔ "میرا کام بھی تو ہونا چاہیے نا۔ کیوں ترلو۔۔۔؟"

"پارڈن سر۔۔۔۔" وہ ناسمجھی سے بولی۔

باہر بادل گرج رہے تھے۔ بجلی ایک بار پھر چمکی۔

سبھروال نے پوچھا۔ "ترلو، آج شام میں خالی ہو۔ ایک ایک کپ کافی۔۔۔۔"

باہر زور سے بجلی چمکی۔ بادل اتنے زور سے گرجے کہ وہ ڈر گئی۔ اچانک تھر تھر کانپتی ہوئی وہ کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ساری سر۔ میرے کپڑے بھیگ گئے ہیں۔ گھر پر میرے ہسبینڈ انتظار کر رہے ہوں گے۔"

پھر اس نے کچھ نہیں سنا۔ وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔ بارش میں بھیگتے ہوئے اس نے بس پکڑی، اور اسی حال میں پانی سے شرابور وہ گھر لوٹ آئی تھی۔

گھر لوٹنے کے بعد اس دن یہ بات اس نے سدیپ کو جان بوجھ کر نہیں بتائی۔

☆☆

اس دن سے بارش کا جو سلسلہ شروع ہوا تو اب تک جاری ہے۔ دو تین دنوں تک اس واقعہ کے بعد اس کا موڈ ٹھیک نہیں تھا۔ ایک کش مکش سی اندر چلتی رہی کئی طرح کی کش مکش۔ مستقبل میں اسے ایک بچہ بھی چاہیے بچے بنا گھر سونا سونا لگتا ہے۔ کوئی تو ہونا چاہیے بولنے، بکنے والا۔ کوئی ہو تو جس سے گھر گلزار نظر آئے۔ سدیپ، جو انا کی آڑ میں کئی کئی دن چپ سا گھر میں بیٹھ جاتا ہے۔ سبھروال اگر پروگرام نہیں دے گا تو نہ دے، وہ صوفیہ جیسی لڑکیوں کی طرح بیڈروم کے دروازے سے فلم میکنگ کے میدان میں نہیں آنا چاہتی تھی۔ پھر لگتا، اس نے سبھروال کو ناراض کر دیا تو؟ اس کو اپنا لہجہ SOFT رکھنا چاہیے تھا.... اسے کہنا چاہیے تھا... کہ سر.... میں ایسی لڑکی نہیں ہوں۔ ممکن تھا سبھروال سمجھ جاتے۔ اس نے سبھروال کو ناراض کر کے اچھا نہیں کیا۔

بجلی چمکتی رہی، بادل گرجتے رہے۔ ان تین چار دنوں میں وہ ذہنی پریشانی اور الجھنوں کے کنویں سے باہر نکل سکی تھی۔ آج بھی صبح سے بارش کا یہی رنگ تھا۔ ترلو سب کچھ بھلا کر رومانٹک ہو رہی تھی۔ اس نے خود کو سمجھا لیا تھا۔ ڈیر ترلو... یہ بھی

زندگی ہے۔ سبھروال نے جو کچھ کہا، وہ زندگی کے رنگوں میں سے ایک ہے۔۔۔۔ یہ رنگ تو زندگی میں آتے جاتے رہتے ہیں۔ ایسے رنگوں کو اوڑھ کر زندگی بھاری اور بوجھل تو نہیں بنائی جاسکتی۔

صبح سے وہ موڈ بحال کرنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ من ہی من میں گنگناتی ہوئی وہ کچن میں کھانا بناتی رہی۔ آٹھ بجے کے لگ بھگ سدیپ بھی آگیا۔ تب تک اندھیرا پھیل چکا تھا۔۔۔۔ سدیپ نے چائے پی۔ پھر ادھر ادھر کا حال سناتا رہا۔ کہاں کہاں بارش کی وجہ سے بس جام ہوگئی۔ کہاں کہاں پانی ڈباؤ بھر ہے۔۔۔ آفس میں کام نہیں ہوا۔ لوگ کم آئے۔۔۔ بسیں کم چلیں۔۔۔

رات ہوتے ہوتے اس نے کھڑکی سے جھانکا۔۔۔ اندھیرے میں سڑک پر اسے کافی پانی بھرا ہوا محسوس ہوا۔ لیکن بارش تھوڑی کم ہوگئی تھی۔۔۔۔ وہ کمرے میں آئی تو بستر پر لیٹے لیٹے سدیپ کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ چہرے پر تناؤ تھا۔ آنکھوں میں فکر تیر رہی تھی۔

"سدیپ ! تمہیں میرے لیے گھر رہنا چاہیے" وہ خود سپردگی کی حالت میں تھی۔۔۔ وہ دھیرے دھیرے اس کے بدن پر بچھ رہی تھی۔۔۔ "آج دن بھر تم بہت یاد آئے۔۔۔ بہت۔۔۔۔"

اس نے پوچھا۔۔۔ "کیا بات ہے؟ کچھ پریشان سے ہو سدیپ۔۔۔۔"

"وہی ٹینشن" سدیپ نے ہونٹ پچکایا۔ "کل تک ہم نے زندگی کو کتنا سہل سمجھ لیا تھا۔۔۔ یوں چٹکی بجاتے منزل مل گئی۔ اور اب۔۔۔ ٹینشن جھیلو بیٹا۔۔۔"

اس کا لہجہ کڑوا اور بازارو ہوگیا تھا۔۔۔۔

"چھوڑو۔ موڈ کیوں خراب کرتے ہو؟ اچھی اچھی باتیں کرو۔"

اس کی گول گول آنکھیں ناچ رہی تھیں۔۔۔۔ "کئی دن سے پریشان تھی۔ تم نے پوچھا نہیں، کیوں پریشان تھی؟"

"کیوں پریشان تھی؟"

"یہ دنیا۔ یہ لوگ۔۔۔" وہ روہانی ہوئی جارہی تھی۔۔۔ "بتاؤں۔ ناراض تو نہیں ہوگے، نا۔۔۔؟" سدیپ نے سینے پر رینگتے ہوئے اس کے ہاتھ کو دھیرے سے جھٹکا۔۔۔ "صاف صاف بولو۔۔"

"اس دن بارش میں بھیگ گئی تھی۔۔۔ صوفیہ جیسی لڑکیوں نے۔۔۔ معلوم، مسٹر سبھروال مجھ سے کیا کہہ رہے تھے۔۔۔ اولڈ مین۔ میں کتنا شریف سمجھتی تھی۔۔۔ جو کہانیاں ان کے تعلق سے سنی تھیں، مجھے کسی پر یقین نہیں تھا۔ دفتر میں سناٹا تھا۔ وہ مجھ سے پہیلیوں میں باتیں کر رہے تھے۔"

سدیپ چونکا۔ "پھر کیا ہوا؟"

وہ دھیرے سے مسکرائی۔۔۔ "سدیپ، اپنی بیوی پر کبھی شک مت کرنا۔ میرے اعتماد کو کبھی دھچکا مت پہنچانا۔"

وہ پرانا کیسٹ آن کر رہی تھی۔۔۔ "تم جانتے ہو۔۔۔ ایسے موقع پر میں کیا کر سکتی ہوں۔ پرپوزل جائے بھاڑ میں۔۔۔ ہر لڑکی صوفیہ تو نہیں ہے۔۔۔" وہ کہتے کہتے رک گئی۔۔۔ "میں غصے میں اٹھ کھڑی ہوئی اور اسی وقت وہاں سے چلی آئی۔"

رینگتے رینگتے اس کے ہاتھ ٹھہر گئے۔

سدیپ کا چہرہ گہرے تناؤ میں تھا۔ آنکھوں میں الجھنوں کے چھوٹے چھوٹے بھنور بن رہے تھے۔ پھر یہ بھنور لمبی خاموشی کے ساتھ ٹوٹ گئے۔۔۔ سدیپ نے لفظ اکٹھا کیے اور تھرتھراتے لہجے میں بولا۔۔۔

"ترلو۔۔۔ آخر ایک کپ کافی پینے میں۔۔۔ اتنا اچھا پروپوزل۔۔۔" وہ اٹک رہا تھا۔۔۔ "ادھر کی پریشانیاں۔۔۔ وہ ناراض ہو گئے تو۔۔۔"

وہ آنکھیں جھکائے شاید ایک نئی طرح کی کشمکش میں الجھ گیا تھا۔۔۔

ترلو اب کچھ نہیں سن پا رہی تھی۔۔۔

باہر پٹاخے چھوٹ رہے تھے۔۔۔

نہیں۔۔۔ بجلی چمک رہی تھی۔۔۔ بادل گرج رہے تھے۔۔۔ مگر بارش تو کب کی رک چکی تھی۔۔۔ شاید اگلی بارش کے لیے۔۔۔ یا اس سلسلہ کو دراز رکھنے کے لیے بجلی ایک بار پھر چمکی ہو۔۔۔۔۔

اور بادل نے کڑک کر اگلے پل ہونے والی بارش کا اعلان سنایا ہو۔۔۔۔۔۔!

○○

بادبان ۔۔۔۔۔ شمارہ (۱)
علم و ادب ۔ دسمبر ۹۵

نور علی شاہ
کو
اداس ہونے کے لیے کچھ چاہیے

جو سچ تھا، وہ تواریخ کے پنوں میں چھپ گیا۔ نہیں، چھپادیا گیا۔ تواریخ کے گدلے نالے میں... اور نالے سے اٹھتی ہوئی بدبو سونگھنے والے بھلا کیسے سوچ پائیں گے کہ کبھی سلطنت اور شہنشاہیت کے گذرے قصوں میں ان کی بھی ساجھے داری رہی ہوگی۔ نہیں نور علی شاہ۔ اس جھانسے سے کام نہیں چلے گا۔ جو کبھی تھا، وہ گزر چکا ہے، اور جو ہے وہ اس گندے نالے سے بھی بدتر ہے، جس کے ارد گرد جانے سے بھی لوگ کتراتے ہیں، دور بھاگتے ہیں۔

چار کھمبے والی گلی۔ گلی کے اندر ایک چھوٹا سا ٹوٹا سا مکان۔ کبھی اپنا بھی مکان ہوتا۔ یہ آرزو دل کی دل میں رہ گئی۔ زندگی کٹ گئی تو اسی کرائے کے اصطبل میں۔ باہر دروازے پر ٹاٹ کا جھولتا ہوا پردہ۔ بہت تھک جاتے تو آلتی پالتی مار کر دروازے پر ہی بیٹھ جاتے۔ دروازے کے سامنے زیادہ تر کبنجڑے، قصابوں کے گھر تھے۔ جن کے آوارہ بچے دن بھر ادھم مچاتے ہوئے گلی کا ستیاناش کیے رہتے۔ بچوں کے چیخنے، ہنگامے کرنے کی آواز انہیں زیادہ پریشان کرتی تو وہ گلیوں سے بارہا سنی گالیوں کی تھال لیے غصے میں بچوں کو مارنے دوڑ پڑتے... مادر... حرامیوں... ماں باپ نے سکھایا نہیں کہ گلیوں میں کیسے کھیلتے ہیں۔ تمیز و تہذیب سے دور کا بھی

واسطہ نہیں۔ اور واسطہ رہے بھی کیسے، یہ سب چیزیں تو خاندانی ہوتی ہیں۔ خون میں تہذیب دوڑ رہی ہوتی تو جانتے کہ اچھے گھرانوں کے بچے زندگی کس طرح گزارتے ہیں۔"

بہت زیادہ غصے میں آجاتے تو فراٹے دار گالیاں بکتے ہوئے ہاتھ میں اینٹ یا پتھر اٹھالیتے اور گلی کے کسی مقام پر کھڑے ہوکر بچوں کے ماں باپ کی ساتھ پشتوں کی فضیحت کر بیٹھتے۔ اس بیچ بچوں میں سے کسی کی جان پہچان والا آجاتا تو سمجھیے مہابھارت شروع ہوگئی۔ اگر کوئی نہیں آتا تو بچے خود ہی ہلے رے۔۔۔رے۔۔۔ کرتے ہوئے نور علی شاہ کو دوڑا دیتے۔ بچوں میں سے کوئی دبی آواز میں منہ بنا کر بولتا۔ بیٹیا ۔۔۔ اور نور علی شاہ سرپٹ بھاگ رہے بچوں کو مغلظات گالیاں بکتے ہوئے "رگید" دیتے۔ کمبخت، کمینے۔۔ آگئے نا اپنی اوقات پر۔۔۔ نور علی شاہ کو بیٹیا کہنے کی جرات کرتے ہو۔۔۔۔ جس کا خاندان نواب امجد علی شاہ کے گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ کم بختو، میرا مذاق اڑاتے ہو، ہے ہے۔ افسوس اب ہمارا زمانہ نہیں ہے۔ ورنہ مصاحبوں سے کہہ کر خانہ بدوشوں کی طرح یہاں سے نہ اٹھوادیا ہوتا تو پھر میرا نام بھی بدل دیتے۔۔۔۔ نا اہلو ۔۔۔۔ بدبختو۔۔۔۔"

ایک بار جو گالیوں کی برسات شروع ہوئی تو پھر کہاں تھمنے والی تھی۔ اس بیچ اسلم کو اس کی خبر لگ جاتی تو وہ جبراً انہیں کھینچتا ہوا اندر لے آتا۔ نور علی شاہ جھٹکے سے ہاتھ چھڑا کر پھر دروازے پر آجاتے اور باقی بچی گالیوں کی تھال پروسنے میں لگ جاتے۔ اسلم، یعنی اسلم علی شاہ۔۔۔۔

تب بڑی مشکل سے سر پر آنچل ڈالے، بڑی بی دروازے پر آتیں، نمودار ہوتیں۔ بے پردگی کا مظاہرہ ہی ان کے احتجاج کی آخری کڑی ثابت ہوتا۔ لو بہت ہوگیا۔ اب اندر بھی آجاؤ۔ ذرا پرانے وقتوں کی لاج رکھیو۔ امجد علی شاہ کے خاندان پر رحم کریو۔۔۔۔! ذرا سوچیو۔ ان کی روحیں قبروں میں اس منظر کو دیکھ کر کیسے تڑپتی ہونگیں۔

بڑی بی کو دیکھتے ہی نور علی شاہ کے بدن میں اضطرابی کیفیت چھا جاتی۔ ارے تم کیوں آ گئیں۔ چلو اندر جائیو۔۔۔۔ گرد و غبار میں ڈوبی ہوئی تیز آندھی جیسے ایک جھٹکے میں تھم جاتی۔ بدن میں تہذیب اور اخلاق کے گرگٹ تھرکنا اور کانپنا شروع کر دیتے۔ وہ بغیر رکے جھٹ سے اندر چلے آتے۔ اور گالیوں سے کوسنے کی طرف دن کا دوسرا حصہ بھی ڈھلنے لگتا۔ وہ بڑبڑاتے رہے۔۔۔۔ "لو دیکھو۔۔۔۔ دیکھو بھائیو۔۔۔ امجد علی شاہ کے خاندان پر کیا بدنصیب وقت آن پڑا ہے۔۔۔ اب وہ پالکیاں کہاں کہاں کے کہار۔ زنانیاں نامحرموں کو شکل دکھانے باہر نکلنے لگی ہیں۔۔۔۔ ہے ہے۔۔۔ زمین پھٹ جائے پاک پروردگار۔۔۔ اب کون سا دن دیکھنے کو یہ آنکھیں باقی ہیں۔

دن بھر کے اَن سنائے قصوں میں یہ سارے منظر روز کا حصہ تھے۔ لیکن ابھی ایک اور منظر بچ رہا ہوتا۔ منحنی سا اسلم لاکھ ضبط کے بعد بے قراری کے عالم میں ابا کے سامنے، ہوا کے زور سے ہلتی کمزور دیوار کی طرح تننے کی کوشش کرتا۔۔۔ ہڈیوں کے ڈھانچے میں جیسے کرنٹ بہنا شروع ہو جاتا۔ اٹھنگا سا پائجامہ اور کرتا پہنے اسلم اپنی پتلی پتلی بینت جیسی ٹانگوں پر کھڑا ہو جاتا۔

"ابا بہت مذاق بن چکا ہمارا۔ ایسا کیوں کرتے ہیں آپ؟"

وہ ایسے دیکھتا جیسے ایتھنز کے خداؤں کو نہ پوجے جانے کے جرم میں سزائے موت کے طور پر زہر کا پیالہ پینے کی تجویز رکھنے والوں نے سقراط کو دیکھا تھا۔ اور سقراط آنکھیں جھکا کر اپنے بدصورت پیروں کو تکنے لگا تھا۔ اور خوش ہوا تھا کہ اس کا انتہائی بدصورت ٹنڈمنڈ پیر بیوقوفوں اور نا سمجھوں کے چہرے سے زیادہ چمک رہا تھا۔

نور علی شاہ نے ٹھیک ایسے ہی جھک کر اپنے پیروں کو دیکھا اور بس دھیرے سے مسکرا دیئے۔ پھر چپ سے اٹھے اور اپنے بیٹھکے میں آ گئے۔

بیٹھکے میں آنے تک وقت ٹھہر چکا ہوتا۔ حال سے اوقات کی سنکری گلیوں میں داخل ہونے تک وقت کا مارا خبطی بوڑھا دوسروں کی نظر بچا کر کب کا ان میں

پورا کا پورا اتر چکا ہوتا۔

ایسے بھی دن ڈھلتا ہے کیا؟ راتیں آسمان پر ٹمٹماتے ستاروں کی طرح اتنی چھوٹی کیوں ہوتی ہیں، بچپن سے، اماں کے ہاتھ سے بیلن چوکی چھین کر بنائی گئی ٹیڑھی میڑھی چھوٹی چھوٹی روٹیوں کی طرح.... عمر کے پاؤں پاؤں چل کر تواریخ کے گلیارے میں احساس اور جذبات سے دھینگا مشتی کرتے ہوئے گزرا وقت چہرے پر گہری جھریاں چھوڑ گیا تھا..... ان جھریوں میں بیتے دنوں کی خلش موجود تھی..... اب نقاہت سما گئی تھی۔ سانسیں تھمنے اور ٹوٹنے لگی تھیں۔ زندگی میں حاصل کے نام پر بس شونیہ کی خالی خالی یاترائیں تھیں..... اور سنہرے ماضی کے آبشار کے شور تھے کہ بس ابھی ابھی تو سلطنت، جاگیریں اور شہنشاہیت کے قصبوں سے نکل کر ٹرین جمہوریت کے بے حال اسٹیشن تک پہنچی ہے..... آنکھوں میں آنسو نہیں ہوتے بس..... سوکھی سی گرد ہوتی جو وقت کو گالیاں اچھالتے وقت چپکے سے آنکھوں میں پڑ گئی ہوتی۔ آنکھوں کو صاف کرتے۔ پائجامہ تھوڑا سا اوپر چڑھا کر، اکڑوں بیٹھ کر دونوں پاؤں کے پنجوں کو برابر برابر پھیلا دیتے۔... غور سے پنجوں کو دیکھتے۔

ہاں اسے کہتے ہیں خاندانی پیر..... محراب نما انگوٹھا اور مسجد کے ستونوں کی طرح ایک دوسرے سے جڑی تنی تنی لمبی لمبی انگلیاں، خوبصورت عورت کے سینے کے گداز کی طرح ابھرا ہوا تلوا، تلوے سے انگوٹھے کی طرف جاتی ہوئی خمیدہ فلائی اور کی طرح چمکتی سڑک۔ اسی پر تو وہ جان نثار کرتے تھے۔ اور ابا مرحوم لیاقت علی شاہ فخر سے بتایا کرتے تھے کہ نور علی شاہ دھیان سے سن، خاندانی لوگ اپنے ہاتھ اور پاؤں سے بھی پہچانے جاتے ہیں..... خوبصورت، سانچے میں ڈھلے ہوئے۔... واللہ کیا کہنے۔... ہم تو خیر نوابوں کے خاندان سے ہیں۔ ہماری برابری بھی کیا ہے۔

نواب اور نوابوں کا خاندان..... بدلتے وقت کے سانچے میں نہیں ڈھلے تو بس اسی وجہ سے کہ قدم قدم پر یہ نوابی ہونا ریڈ سگنل کی طرح انہیں روک دیتا تھا۔ زندگی میں کچھ بھی نہیں کیا تو بس اسی لیے کہ نوابی خاندان پر حرف نہ آجائے۔ اللہ

اللہ نوابی خاندان کے زوال کے بعد بھی ان کی نسلوں نے اس نوابیت کی لاج تو رکھی تھی ..... ابا میاں لیاقت علی شاہ نے بھی کیا کیا، بس زندگی بھر اسی کفن کو اٹھائے ڈھوتے رہے۔ نوابوں کی یادگار کے نام پر بس ایک صندوق تھا جو نسل در نسل ہوتا ہوا اب ان کے پاس تھا۔ خدا کی مار، کہ اب اس شاہی صندوق کو بھی اس کباڑ نما دو چھوٹی چھوٹی کوٹھریوں والے دربے میں کون سی جگہ ملی تھی۔ پائخانہ جانے والے راستے کے پاس اسٹور کے استعمال کے لیے تھوڑی سی جگہ تھی۔ جہاں گھر کی بیکار چیزیں بے قرینے، پھینک دی جاتیں، وہیں کنارے۔ یہاں چار کھمبے والی گلی میں مکان ملنے کے بعد بس اس صندوق کو یہی جگہ نصیب ہوئی تھی۔ صندوق کا پھیلاؤ اتنا تھا کہ کوٹھریوں میں رکھنے کے بعد جگہ اور بھی تنگ ہو جاتی۔ آخر سوچ سمجھ کے بعد انتہائی صبر اور آہ کے ساتھ تعفن کو جانے والے راستوں پر صندوق کو رکھ دیا گیا۔ پائخانہ آتے جاتے نور علی شاہ اس موروثی صندوق کو درد انگیز نظروں سے دیکھتے اور وقت کی بے مروتی، بے رحمی پر گیلی لکڑی کی طرح نم ہو جاتے۔ ماضی کی بھول بھلیاں میں گم ہونے کی خواہش ہوتی تو افسردگی سے صندوق کا تالہ کھولتے۔ صندوق کی گرد صاف کرتے ہوئے کرتا پائجامہ دھول میں اٹ جاتا۔ کہتے ہیں صندوق قیمتی صندل کی لکڑیوں کا بنا تھا۔ کئی پشتوں تک صندل کی خوشبو نسل در نسل اپنی مہک کی خیرات بانٹتی رہی بالآخر یہ خوشبو بھی وقت کے سانحے میں کھو گئی۔ اب ناک لکڑی میں گھسا کر بھی رگڑ لیے تو کم بخت خوشبو نہیں بلکہ ایک عجیب سی بدبو ناک کے ذریعہ منہ میں داخل ہو جاتی۔ لیاقت علی شاہ نے مرنے سے پہلے صندوق کی تالہ کنجی نور علی شاہ کے ہاتھوں میں سونپی تھی۔ لے بیٹا، بس یہی تیرے خاندانی ہونے کی نشانی ہے۔ اسے سنبھال کر رکھیو۔ انہوں نے تالہ اچھی طرح بند کر کے دیکھا، کنجی جیب میں رکھی، پھر ابا کی طرف مڑے تو ابا جگ سے منہ موڑ کر انتہائی آرام کی نیند سو چکے تھے۔ جیسے بیٹے کو جاگیر سونپتے ہی چین وقرار آ گیا ہو۔

لیاقت علی شاہ کے چہلم سے فارغ ہو کر پہلی بار نور علی شاہ نے تجسس اور

بیقراری کے عالم میں صندوق کے تالہ کو کھولا تھا۔ صندوق اور پرانی نشانیوں کے بار ہا ذکر نے ان کے بدن میں کپکپی طاری کر دی تھی۔ لیکن علی بابا کے کھل جا سم سم کہتے ہی سارا طلسم ٹوٹ گیا۔ تجسس میں کھوئی آنکھیں بوسیدہ اور فرسودہ ریشمی کپڑوں میں کم خواب اور نیلم کے ذکر کو ٹٹولتی رہیں مگر انکھیں تھیں کہ خواب نگر جاکر واپس لوٹنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔ ایک زنگ آلود تلوار تھی۔ دو چار طلائی برتن تھے۔ سرکاریں چھن جانے کے ڈر سے بچائی ہوئی امجد علی شاہ کی عبا اور پگڑی تھی۔ اور تاج نما کوئی شے تھی جس میں نہ ہیرا تھا نہ یاقوت، نہ نیلم تھا نہ کوہ نور۔ یہاں تک کہ سونا اور پیتل کا پانی تک نہ تھا۔ سو نور علی شاہ نے پرکھوں کی اس آخری یادگار کو خوف سے دوبارہ اس کے مقام تک رکھ دیا۔ ہاں سوچا طلائی برتن پہلے بھی برے دنوں میں کام آئے ہوں گے اب بھی برے دنوں میں ساتھ نبھائیں گے۔ ہاں ان شاہی ملبوسات کو دوبارہ ان کے مقام پر رکھتے ہوئے ان کے ہاتھوں میں عقیدت کی وہ کنکپنی نہ تھی، جو صندوق کھولتے وقت ان کے ہاتھوں میں خود بخود پیدا ہو گئی تھی۔ دھڑام سے تالہ بند کرتے ہوئے انھوں نے سوچا۔ نور علی شاہ، کافی وقت گزر چکا ہے.....اب بیوی ہے، بچے ہیں اور گھر کی ذمہ داری ہے۔ سو سوچو کہ اب آگے کیا کرنا ہے۔ پشتینی صندوق میں مستقبل کی جامہ تلاشی کے بعد تہی دست ہونے کا احساس اچانک انھیں حال کی پتھریلی سڑکوں تک کھینچ لایا تھا۔

لیاقت علی شاہ کو حکومت ہند کی طرف سے کل جمع ۸۰ روپیہ شاہی بھتہ ملتا تھا۔ بھتے کی رقم میں بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ نہ کمی آئی نہ زیادتی۔ بس یہ بھتہ بندھا رہا۔ یہ بھتہ ان کے خاندان کو مل رہا تھا۔ زندگی ٹھکانے لگانے کے لیے اسی بھتہ کا گزارا تھا۔ کبھی کبھی نئی سرکاریں بدلنے کے دوران اس بھتہ کے ملنے میں مشکلیں بھی پیش آئیں۔ کورٹ کچہری کے دس چکر لگے تو یہ بھتہ پھر جاری ہو گیا۔ کبھی کبھی کوئی بڑا سرکاری افسر اچانک ان پر ترس کھا اٹھتا، "اوہ، اتنے بڑے خاندان سے ہیں آپ۔ لگتا نہیں ہے، جیسے ان کی خستہ، بے گور و کفن لاش میں وہ اس دور کی نوابیت

تلاش کر رہا ہو۔ پھر ایک طنزیہ ہنسی۔ وہ اس ہنسی کو اچھی طرح پہچانتے تھے۔ جی حضوری کے وہ قائل تو نہیں تھے مگر مجبوری تھی۔ اور نتیجہ میں بھتہ اب ۱۵۰ روپیہ پہنچ گیا تھا جس میں ۵۰ روپیہ تو مکان کا کرایہ ہی نکل جاتا۔ آسودگی کے نام پر محض نواب گھرانے کے ہونے کا احساس تھا اور وہ اس احساس کو پورے طمطراق سے نسل در نسل ڈھوئے جا رہے تھے۔

پڑوس میں ہی مختار بنیے کی دکان تھی۔ جب تب اسی دکان کا آسرا تھا۔ لیکن جہاں کمائی کا کوئی راستہ نہ ہو وہاں اکیلا بنیا بے چارہ کہاں تک سودہ سامان ادھاری دیتا رہتا۔ سو ایک دن غصے میں آکر نور علی شاہ کا ادھاری کھاتہ بند کر دیا۔ پڑوسی ہونے اور نوابی شان، سب واسطہ دھرا کا دھرا رہ گیا۔ مختار کی اکڑ اور ہٹ میں پیٹ کی دوزخ پگھل پگھل گئی۔ گھر میں دو روز سے فاقہ تھا۔ جام شہادت قبول کرنے کا وقت آچکا تھا۔ وہ جیسے پہلی بار مختار کے آگے سرنگوں ہوگئے۔

"لو ننگے آیا ہوں۔ اب بولو۔ امجد علی شاہ کے خاندان کا کوئی آدمی خواب میں بھی کبھی اس طرح ننگا نہ ہوا ہوگا میاں جیسے میں ہو رہا ہوں، تمہارے سامنے۔ چاہو تو مجھے گروی رکھ لو۔ میرا تماشہ بنالو۔ مگر ادھاری مت بند کرو۔"

اور مختار نے جیسے قربانی کے جانور کو ذبح کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔

"ٹھونگا بنا سکتے ہیں آپ۔ میاں جی ٹھونگا بنائیے۔ ہم خریدیں گے۔ آس پاس کی کئی دکانوں میں بھی بات کرا دیں گے۔ ہر طرح کے چھوٹے بڑے۔ کیلو دو کیلو والے۔ دام مناسب ملیں گے۔"

تب سے وہ ٹھونگا ہی تو بنا رہے ہیں۔ شروع شروع میں گھر میں رکھی پرانی کتابیں اور کاپیاں اس کام میں آگئیں۔ پھر سڑکوں سے بیکار پڑے کاغذ اٹھا اٹھا کر گھر لائے جانے لگے۔ بیوی بچے سارا دن روزی کے تلخ نوالے گلے سے اتارنے پر مجبور تھے۔ مہینے میں ۲۵۰۔ ۲۰۰ روپے تک کے ٹھونگے بن جاتے۔ مختار نے دو چار جگہوں پر بات کرا دی تھی۔ شروع شروع میں تو ٹھونگے پہنچانے وہی جایا کرتے تھے پھر اسلم

بھی جانے لگا۔ ہاں کبھی کبھی دل سے آہ اٹھتی تو زور زور سے چیخنا چلانا شروع کر دیتے۔۔۔۔۔۔ ہے ہے۔۔۔۔ دیکھو لوگو۔۔۔۔ کیا نازک زمانہ آگیا ہے۔۔۔۔۔ امجد علی شاہ کے خاندان والے اب ردی کے ٹھونگے بھی بنانے لگے ہیں۔"

سب کچھ حسب معمول چل رہا تھا کہ ایک چھوٹا سا واقعہ ہو گیا۔ ممکن ہے دوسروں کی نظر میں اس کی بہت اہمیت نہ ہو مگر نور علی شاہ کے لیے اس کی اہمیت اتنی تھی، جتنی سمندر میں بھٹک رہے جہاز کے لیے قطب تارہ کی۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر ہکسلے اپنی کتاب کے سلسلے میں ہندوستان آئے ہوئے تھے۔ دراصل وہ ہندوستان کے شاہی گھرانوں اور ان کے زوال پر ایک اہم کتاب ترتیب دے رہے تھے۔ اس سلسلے میں پورے ملک میں گھوم گھوم کر انھوں نے کافی مواد جمع کر لیے تھے۔ پروفیسر ہکسلے کو جب نواب امجد علی شاہ کے گمنام خاندان کا پتہ چلا تو وہ خود کو ملنے سے روک نہیں پائے۔ چار کھمبا کی گندی گلی میں کار کے داخل ہونے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے کار باہر ہی کھڑی کرنی پڑی۔ پروفیسر ہکسلے کے ساتھ ان کا ایک انڈین فرینڈ بھی تھا۔ جس سے ان کی پرانی خط و کتابت تھی۔ کتاب سے متعلق مواد کی فراہمی میں اس نے خاصہ مدد کی تھی۔

تنگ گلی میں گورے چٹے انگریز کو دیکھتے ہی چہ مگوئیوں کا بازار گرم ہو گیا۔ بچوں کے علاوہ مختار کی دکان پر بھیڑ لگانے والوں نے بھی حیرت سے گورے چمڑے والے کو دیکھا۔ یقیناً ان کی حیرت کی اس وقت انتہا نہ رہی، جب اس کے ساتھ والے شخص نے کسی سے نور علی شاہ کے بارے میں دریافت کیا۔

مختار نے گردن اچکا اچکا کر نو وارد کو کسی آٹھویں عجوبے کے طور پر دیکھا اور پاس کھڑے گاہک سے طنزیہ لہجے میں بولا۔۔۔۔ "یہ انگریز سالے تو بھارت سے چلے گئے تھے، پھر واپس کیسے آگئے۔؟"

"نور علی شاہ کو پوچھ رہا ہے۔"

"نور علی شاہ" مختار کی ہنسی چھوٹتے چھوٹتے رہ گئی۔ جیسے اچانک اس نے نور علی شاہ کے سراپا میں ان کے بنائے ٹھونگوں کا عکس دیکھ لیا ہو۔ اور حیرت یہ کہ اس وقت بھی اس کے ہاتھ میں وہی ٹھونگا تھا جو نور علی شاہ کے یہاں سے بن کر آیا تھا اور وہ اس میں کسی گاہک کا سودا پیک کر رہا تھا۔

پروفیسر بکسلے اور ساتھ والا حیدر آبادی چھوٹے چھوٹے گندے بچوں کی فوج پار کرتے ہوئے نالے پر بنے مکان پر چڑھ گئے، جہاں دروازہ پر بھورے رنگ کا ٹاٹ کا پردہ گرا ہوا تھا۔ کسی محلے والے نے دروازہ کی کنڈی ہلا کر بانگ لگائی۔ "نور علی، ودیش سے کوئی ملنے کو آئے با۔" نواڑ کی پلنگ سے، دھب سے کودے نور علی شاہ، پائجامہ کا ازار بند بند کرتے ہوئے دروازہ کی طرف تیزی سے دوڑ گئے۔ سچ مچ سامنے ایک خوش شکل ۴۵۔۴۰ سال کی عمر کا ایک گوری چمڑی والا انگریز کھڑا تھا۔

"ٹوم نور علی شاہ" اس نے بے انتہا نرمی اور ملائمیت سے ہاتھ بڑھایا....

حیدر آبادی نے شستہ اردو میں مکالمہ جڑا۔ "یہ آکسفورڈ سے آئے ہیں۔ آپ سے خصوصی طور پر ملنے کے متمنی تھے۔ در اصل آپ کے شاہی خاندان کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔"

اس نے محسوس کیا، بکسلے بھی ٹوٹی پھوٹی زبان آسانی سے بول پا رہا تھا۔

نور علی شاہ کا چہرہ کھل اٹھا۔ "آئیے ....باہر کیوں کھڑے ہیں۔ اندر آجائیے —"

مگر اندر کون سی جگہ تھی، بیٹھنے بیٹھانے کے لائق۔ دنیا بھر کے کپڑے پھیلے ہوئے تھے چھوٹے سے برآمدے میں الگنی میں پسرے کپڑوں سے پانی اب بھی چو رہا تھا۔ وہیں ایک طرف اسلم اور فاطمہ بیٹھے ٹھونگے بنا رہے تھے۔ بڑی بی سر جھکائے گندے برتنوں کو انہماک سے دھونے میں لگی تھیں۔

غصہ جیسے چڑیے کی طرح اچانک نور علی شاہ کی ناک پر بیٹھ گیا۔

"یہ دیکھیے نوابوں کا خاندان، شاہی خاندان..... مگر ٹھہریے۔ میری عورتیں پردہ کرتی ہیں...."

انھوں نے غصے میں ڈانٹ کر بیوی اور لڑکی کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ غصے میں اپلاتے ہوئے چیخ پڑے۔ اب ہماری قدر کہاں۔ قدر تو انگریز جانتے تھے۔ آپ جانتے تھے۔ اور بھارت سرکار نے ہماری بولی لگائی ہے صرف ڈیڑھ سو روپے "جس میں سرکاری افسر کے لیے ایک اچھی سی شراب تک نہیں آسکتی۔"

پروفیسر بکسلے نے ان کے کندھے پر پیار سے ہاتھ رکھا۔ ہم کو معلوم۔ یہی تو جاننے اور پوچھنے ہم آیا....

اس نے پیار سے، بے حد معصوم دکھنے والی نیلی نیلی آنکھوں سے کسی بچے کی طرح ان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے گردن ہلائی۔ تب تک مختار بیننے کا بھیجا ہوا لڑکا دو بینت کی کرسیاں لے آیا تھا۔ بکسلے اور حیدر آبادی ان کرسیوں پر بیٹھ گئے نیواڑی کی پلنگ پر نور علی شاہ پیروں کو لٹکائے سوچ میں گم ہوگئے۔ یہاں ان کے ملک سے تو کبھی ایک چڑیا بھی ان کی کھوج لینے نہیں آئی اور یہاں باہر سے ...... باہر والوں کی بات ہی نرالی ہے۔

"کوئی تکلف نہیں۔ ہم صرف کچھ پوچھنے آئے ہیں۔" حیدر آبادی نے ٹائی کی ناٹ درست کی۔ ترچھی نظروں سے گھر کا جائزہ لیا۔ اڈگی کواڑ سے سہمی ہوئی نظریں ادھر ہی دیکھ رہی تھیں۔ اس بیچ ایک بچہ دو گلاس اسپیشل چائے لے کر آگیا۔ حیدر آبادی کو گلاس تھامتے ہوئے تھوڑی سٹر پٹراہٹ بھی ہوئی مگر گوری چمڑی والے نے آسانی سے شکریہ کہتے ہوئے گلاس تھام لیا۔ اور دھیرے دھیرے چسکی لینے لگا۔

"ہاں امجد علی شاہ کے بارے میں..... ٹوم جو بولے گا، ہم لکھے گا۔ اس کے لہجے میں وہی ملائمیت تھی۔ پھر جیب سے نوٹ بک نکال کر، خالی گلاس نیچے رکھ کر وہ ہمہ تن گوش ہوگیا۔

تواریخ کی سبز وادیوں کی یادگار پر گرد جم چکی تھی۔ نور شاہ دھیرے دھیرے اس گرد کو صاف کر رہے تھے۔ سب کچھ تو وقت نے چھین لیا۔ کیسی ریاستیں اور جاگیریں.... پرانے قصوں کے پٹارے کھل گئے تھے۔ راجہ مہاراجہ کی شان و شوکت

کی انوکھی البیلی کہانیاں، عیش و عشرت کی عجیب داستانیں وہ سناتے رہے...
بتاتے رہے۔ سب کہانیاں وقت کی تحویل میں دفن ہوتی رہیں۔ ہندوستان تب دو
پاٹ نہیں ہوا تھا لیکن نواب امجد علی شاہ کے پرپوتوں کے نصیب کو گھن لگ چکا
تھا۔ ریاست ختم ہو چکی تھی۔ جاگیریں حکومت نے چھین لیں۔ جو محل تھا، شاہی
اصطبل تھا، وہ سب حکومت نے بطور میوزیم اپنی نگرانی میں لے لیے۔ اب ٹورسٹ
آتے ہیں، جاتے ہیں، لاکھوں کے وارے نیارے ہیں اور یہاں یہ بندہ بیراگی جسے
نواب امجد علی شاہ کا وارث بتاتے ہوئے بھی شرم آتی ہے، بھوک سے بے حال
ہے، کپڑوں سے ننگا ہے، اور اس پھٹے حالی میں صرف داستان گو بن کر رہ گیا ہے....
آہ.... امجد علی شاہ کا اصطبل دیکھیے جہاں شاہی گھوڑے بندھتے تھے، وہ آج کے عالی
شان عمارتوں اور کوٹھیوں سے بھی بہتر ہیں.....

وہ سناتے رہے۔ انگریز بیچ بیچ میں روک روک کر کچھ سوال کرتا۔ حیدر آبادی
دھیمے سر میں کچھ جواب دیتا۔ انگریز سر ہلا کر پھر لکھنے میں محو ہو جاتا.....

دوپہر کا سورج منڈیروں سے کچھ دور چلا گیا تھا۔ آنگن میں کچھ بدلی سی چھا گئی
تھی۔ نور علی شاہ پھر سے اسی زمانے میں پہنچ گئے تھے۔ شدت جذبات سے آواز کبھی
لڑکھڑا جاتی تھی۔ گلوگیر ہو جاتی۔ اچانک وہ ٹھہرے آنکھوں میں گزرے وقت کی گرد
پڑ گئی تھی۔ "نشانی..... آپ نشانی پوچھتے ہیں۔"

"ہاں۔ یس"..... انگریز نے متاثر کن انداز میں سر کو دوبارہ جنبش دی۔ اور
بے قراری میں اٹھ کھڑا ہوا۔ گردن سے جھولتا ہوا کیمرہ نکالا اور معصومیت سے بولا...

نور علی شاہ ہم ایک پوز چاہتا..... جھٹ سے فلیش چمکا.....اور نور علی شاہ۔ جھب
سے کیمرے میں سما گئے۔

لیجیے لیجیے.... آواز شدت جذبات سے بھاری تھی.....اس مرغی کے دربے کی
بھی تصویریں لیجیے۔ جہاں ہم رہتے ہیں۔ مگر نہیں معاف کیجیے گا۔ یا یوں کہہ لیجیے کہ

عزت کی اتنی پاسداری ہے کہ خواتین کو آپ کے سامنے حاضر نہیں کر سکتا۔ نہیں۔ بیشک نہیں۔ کبھی نہیں۔ آپ ادھر ادھر کی جتنی مرضی تصویریں لیجیے۔

انگریز کے کیمرے کی فلیش گھر کی خستہ حالی پر کئی بار چمکی۔ اس کی آنکھوں میں شکریہ کا مفہوم چھپا تھا۔ حیدر آبادی نے شائستہ لہجے میں پوچھا۔ کوئی نشانی جو محفوظ رہ گئی ہو......؟"

"ہاں ہے تو سہی...." ان کے دل سے سرد آہ نکل گئی۔ "آئیے۔ چلیے۔ آپ بھی دیکھیے۔"

وہ رندھے قدموں سے پائخانہ جانے والے راستوں کی طرف بڑھے۔ پھر تھم سے گئے تعفن کا ایک تیز ریلا کھلے سنڈاس سے نکل کر ہوا میں گھل مل گیا تھا۔

"یہ ہم ہیں...." وہ چبا چبا کر بولے۔ گوہ اور موتر میں نہائے ہوئے۔ دن رات اسی تعفن کو برداشت کرتے ہیں اور جیتے ہیں۔ بس۔ انہوں نے اسلم کو آواز لگائی۔ اسلم جو کواڑ کے پیچھے چھپ کر کھڑا تھا۔ تیزی سے آیا۔ انگریز اور حیدر آبادی کو جھٹکے سے سلام کیا۔ اور ابا کی آنکھوں میں جھانکا۔

یہ صندوق.... اسے باہر نکالیو.... انہوں نے پھیلے کباڑ کی طرف اشارہ کیا۔ پھر انگریز کی جانب توجہ سے دیکھتے ہوئے بولے۔ اس کے اندر جو کچھ بھی ہے وہ ناقابل دید ہے نہ آپ کے کسی کام کی..... مگر نشانیاں تو ہیں۔ اور دیکھیے تو سہی۔ ان نشانیوں کو کیسی جگہ نصیب ہوئی ہے۔

انگریز کے فلیش چمکتے رہے۔ تالہ کھلنے پر بھی۔ صندوق کے اندر سے گرد و غبار کا ایک تیز جھونکا اٹھا۔ انگریز نے متجسس ہاتھوں سے ان نشانیوں کا لمس محسوس کیا۔ بے آن، بے رنگ، بے رونق اور اپنی آب کھوتی نشانیاں....

اس نے پھر ایک تصویر لی۔ اس کا چہرہ مسکرا رہا تھا، دوسرے ہی لمحے اس کا ہاتھ اپنی جیب میں گیا اور کچھ کرنسی نوٹ اس نے مضبوطی سے نور علی شاہ کے ہاتھ میں پکڑا دیے۔ دھیرے دھیرے ان کے ہاتھوں کو تھپتھپایا اور حیدر آبادی کا ہاتھ پکڑ

کر باہر نکل آیا۔

وہ کب گئے، گاڑی کب روانہ ہوئی، انہیں کچھ پتہ نہیں۔ وہ بس بے خبری میں کھوئے رہے ایک عجیب سی آگ تھی جو اچانک ان کے اندر بھٹی کی طرح روشن ہو گئی تھی۔ بدن تپ رہا تھا۔ سر پھٹا جا رہا تھا۔ نشانیاں.... وہ صرف نشانیوں کے بارے میں غور کر رہے تھے.... نواب امجد علی شاہ کے خاندان کی آخری نشانی.... اب اس نشانی کو دیکھنے کے لیے بھی لوگ آیا کریں گے۔ پھر جاتے جاتے دیکھنے کا ٹیکس بھی ادا کریں گے...."

وہ بار بار بھڑک رہے تھے.... بار بار پروفیسر ہکسلے کے کیمرے کا فلیش ان کی آنکھوں میں چمک رہا تھا۔

وہ دیکھ رہے تھے.... وہ کھڑے ہیں.... گندہ سا، اٹھنگا سا پائجامہ اور اس پر چور مچور شکن آلود کرتا.... چہرے پر پڑی ہوئی جھائیاں اور ابھرائے بال.... ان کا دبلا پتلا جسم....اور فلیش چمک رہا ہے....

سنڈاس کے پاس کباڑ کے ڈھیر میں پڑا تواریخی صندوق.... صندوق میں پڑی بوسیدہ، گرد و غبار میں ڈوبی صدیوں پرانی نشانیاں اور.... فلیش چمک رہا ہے.... زمین پر چھترائے ہوئے برتن، الگنی پر سوکھتے ہوئے کپڑے.... اور فلیش چمک رہا ہے...

نور علی شاہ! وہ بہت دھیرے سے مردہ لہجے میں بڑبڑائے.... تم محض نشانی رہ گئے ہو....اپنے پرکھوں کی آخری یادگار۔

زمین پر دونوں پاؤں کو جوڑ کر وہ غور سے دیکھتے رہے.... ایک عجیب سی کراہیت ان کی نس نس میں بس چکی تھی۔ وہ بہت غور سے جھکے ہوئے اپنے پاؤں کو دیکھ رہے تھے مگر اب سب کچھ انہیں ٹیڑھا میڑھا لنج پنج نظر آ رہا تھا....

○○

... تشکیل (پاکستان) ۹۶ء

... رنگ خاص نمبر... ۹۶ء

مادام ایلیا کو جاننا ضروری نہیں

فیروز اور مادام ایلیا کے درمیان ایک بے ربط مکالمہ

"دو نالی بندوق اور ڈریسنگ گاؤن" اس نے حامی بھری۔ سر کو ایک ذرا سی جنبش دی۔ گو ویسا کرتے ہوئے اس کے چہرے کی جھریاں کچھ زیادہ ہی تن گئی تھیں اور گول گول چھوٹی چھوٹی آنکھوں کی سرخیاں کچھ ایسے پھیل گئی تھیں، جیسے گرمی کے دنوں میں انڈے کی زردیاں پھیل جاتی ہیں۔

ہاں، اتنا کافی ہے۔ زندہ رہنے کو اس سے زیادہ اور کیا چاہیے، اس نے ہونٹ ہلائے اور سوکھے ہونٹوں پر جمی پپڑیوں کے درمیان شگاف بنتے چلے گئے۔

"مگر میرے پیارے بوڑھے فوجی تمہیں کچھ اور بھی چاہیے۔ بوڑھی مادام ایلیا کے لہجے میں دردمندی تھی، بہت زیادہ کچھ۔ میرے پیارے بوڑھے فوجی، اس عمر میں تو چاہنے کی طلب بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ سمجھ رہے ہو نا تم.....؟"

فیروز راہب، وہ معمر مرد جو اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ دھیرے دھیرے بندوق گھماتا رہا۔ جیسے، ایسا کرتے ہوئے مادام ایلیا کے چبھتے الفاظ کی ناپ تول کر رہا ہو۔

"آہ تم نے محبت بھی نہیں کی۔ جب کہ موقع تھا تمہارے پاس، مادام ایلیا کے

لہجے میں ناراضگی تھی۔ اچھے بچوں کی طرح چپ چاپ بیٹھے رہو میرے پیارے بوڑھے فوجی۔ چپ چاپ۔ سمجھ رہے ہو نا تم۔ جبکہ محبت کے مواقع تھے تمہارے پاس، مگر تم نے وقت گنوا دیا۔ تمہیں محبت کرنی چاہیے تھی۔ اس عمر میں پرانی محبت کا خیال؟ تم نہیں جانتے۔ اس سے عمدہ تو وہ مشروب بھی نہیں ہوتی، جسے تم اب اپنی زندگی سے زیادہ پیار کرتے ہو۔ نہیں پیارے ایسے مت دیکھو... ایک سینڈوچ اور مل سکتا ہے؟"

"نہیں اب سینڈوچ نہیں ہے۔"

معمر عورت ٹھٹھا کا لگا کر ہنسی۔ "میرے پیارے بوڑھے فوجی۔ مجھے پتہ ہے۔ سینڈوچ اور نہیں مل سکتا۔ ذرا ٹھہرو۔ ایک بار چیک تو کر لوں....."

وہ بمشکل اپنی جگہ سے اٹھی۔ اٹھ کر، کیکردان کی بنی الماری تک گئی۔ الماری کی خالی ریک میں کچھ دیر تک اپنی آنکھیں گھما گھما کر کچھ دیکھتی رہی۔ پھر بلاوجہ ہنسی۔

"افسوس۔ نہیں ہے۔ مگر کیا ہوا۔ سینڈوچ تو دوبارہ آسکتے ہیں۔ مگر میرے پیارے فیروز....." اس بار اس نے بوڑھے کو اس کے نام سے پکارا تھا..... مگر..... تم تو نہیں آسکتے۔ اور سنو۔ مات کھانا تو مرنے سے بدتر ہے۔ کیا تم مر گئے ہو۔ سینڈوچ کی طرح زندگی دوبارہ تو نہیں مل سکتی۔"

بوڑھے فیروز نے دو نالی کا رخ اپنی طرف کیا۔ پھر نال اپنی پیشانی سے سٹالی۔ "بزدلی۔ آہ! حال سے بیزاری اور مستقبل کا نشہ ختم ہو جائے تو..... آہ تم سمجھ رہے ہو نا، زندہ رہنے کے لیے......"

وہ اپنا مکالمہ ادھورا چھوڑ کر اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

بچپن کے واقعات اور تذکرہ پہلی گولی کا

ان دنوں فیروز بہت چھوٹا تھا اور سچ پوچھیے تو بچپن میں ایسے خیالات پیدا نہیں

ہوتے ہیں، جیسا کہ اس کے دل میں پیدا ہوتے تھے۔ ان دنوں زیادہ تر وہ ایک چرمی واسکٹ پہنتا تھا، جو اس کے باپ نے اسے امتحان پاس ہونے کی خوشی میں تحفے میں دیا تھا۔ اور وہ اسے پہن کر خوش ہوتا تھا کہ اس سے زیادہ خوبصورت شے دنیا میں اور کوئی نہیں۔ جاڑا ہو، گرمی یا برسات، وہ اسے اتارنے کا نام نہیں لیتا۔ ہاں پہلی بار چرمی واسکٹ اس نے اپنے بدن سے تب الگ کیا جب اس نے سنا کہ.....

وہ جاڑے کے دنوں کی ایک رات تھی۔ روشنی کئی دنوں سے نہیں تھی۔ کمرے میں بھبھکتا ہوا ایک لالٹین جل رہا تھا۔ باہر کتے بھونک رہے تھے، اور اس نے دیکھا، لالٹین کی دھیمی روشنی میں اس کے باپ کا چہرہ سیاہ پڑا ہوا تھا۔ باپ سہما سا ماں کے چہرے پر جھکا ہوا تھا۔

"تم سن رہی ہو نا... جنگ ہونے والی ہے۔ آہ! جنگ، جو ہمارے لیے تباہی لائیگی، شی...." اس نے ماں کی آواز سنی۔ دھیرے بولو۔ ماں کی آواز لڑکھڑا رہی تھی...

"یہ جنگیں ختم نہیں ہو سکتیں۔؟"

"اس نے باپ کے خوفزدہ چہرے کا عکس دیکھا، جو گہرے سناٹے کی طرح شانت تھا۔ نہیں۔ جنگیں ایک بار شروع ہو گئیں تو.... پھر نہیں رکتیں۔ ہاں بیچ بیچ میں سیز فائر.... مگر...."

"سیز فائر"... ماں چونک گئی تھی۔

"جنگیں ایک خاص مدت کے لیے بند کر دی جاتی ہیں۔" باپ ٹھہر ٹھہر کر کہہ رہا تھا.... تم سمجھ رہی ہو نا...... یہ ایک طرح کا معاہدہ ہوتا ہے.... مگر جنگیں جاری رہتی ہیں.... سیز فائر اس لیے ہوتے ہیں کہ.... جنگ میں لذت پیدا کی جا سکے۔"

ایلیا اس سے دو برس بڑی تھی۔ صبح کھانے کی میز پر اس نے دیکھا، اس کا باپ کچھ زیادہ ہی رنجیدہ تھا۔ اس نے ایلیا کو قریب بیٹھنے کے لیے کہا۔ پھر باری باری سے سب کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کا انداز ایسا تھا، جیسے وہ لام پر جا رہا ہو۔ سب کو چھوڑ کر۔

پھر باپ نے نظر نیچی کر لی..... مگر...... وہ دھیرے دھیرے کہہ رہا تھا.... آہ!

ایلیا.... تم جانتی ہو نا، بلیاں کتے اپنی دیکھ بھال کرنا اچھی طرح جانتے ہیں مگر.... ہم انسان ...۔ وہ اٹک رہا تھا.... مان لو.... کل سے اس میز پر ایک آدمی کم ہو جائے تو.... ؟.... وہ ٹھہرا اور اتنی دیر میں باپ نے اپنے حواس بحال کر لیے ...۔ یعنی میں...." وہ مسکرا رہا تھا...۔ "گھر کی چھت سے سیاہ بادل لٹک رہے ہیں میرے جان۔ یہ بادل کسی بھی وقت کمرے میں آسکتے ہیں۔"

فیروز نے ماں کو دیکھا۔ ماں کی آنکھوں میں نہ تعجب کا اظہار تھا نہ ہمدردی کا۔ اس کے برخلاف ماں نے چندھی آنکھوں سے باپ کو دیکھا اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر۔ بولی۔ "شی... دیواروں نے سن لیا تو..."

"بلیاں اپنی حفاظت کرنا۔ کتے اور دوسرے جانور بھی..."

فیروز نے اپنے چمڑے کی واسکٹ پر اپنا ہاتھ پھیرا۔ اس نے ایلیا کو دیکھا جو اچانک باپ سے لپٹ گئی...

"تو کیا یہ سیز فائر ہے۔؟"

"ہو سکتا ہے۔ جنگ ابھی رکی ہوئی ہے میری جان۔ اس کے بعد..... کبھی بھی شروع ہو سکتی ہے..."

پھر سب خاموش ہو گئے۔

دوسرے دن جب باپ جانے کو ہوا تو سب نے مخالفت کی۔ مگر باپ اپنی ضد پر اڑا ہوا تھا...."جب بلیاں اپنی دیکھ بھال کرنا جانتی ہیں تو..."

اس پورے دن باپ نہیں آیا۔ ماں خاموشی کے ساتھ حجرے میں رہی۔ ایلیا بار بار دروازہ کمرہ ایک کرتی رہی۔ رات کے پچھلے پہر دروازے پر دستک گونجی۔ اس نے دیکھا۔ دو چار لوگ اس کے باپ کے مردہ جسم کو لیے کھڑے ہیں۔

"یہ باہر ملا ہمیں۔ باہر راستے میں۔ کسی نے اسے گولیوں سے..."

اس نے دیکھا، ماں سوگوار لباس پہن کر باپ کی لاش کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

ایلیا نے روتے چیختے سارا گھر سر پر اٹھالیا۔ اس کے کانوں میں باپ کی آواز آتی رہی۔
..... یہ سیز فائر ہے..... آہ، بلیاں، کتے اپنی دیکھ بھال کرنا..."

وہ باپ پر جھک گیا۔ باپ کے سینے کو گولیوں سے چھید ڈالا گیا تھا۔ جہاں جہاں گولیاں لگی تھیں، وہاں خون کے فوارے جم گئے تھے..... سارا جسم خون سے سنا تھا۔ اور جسم سے عجیب سی بدبو اٹھ رہی تھی۔ اس نے اچانک اپنی انگلیوں میں حرکت محسوس کی۔ اور اس کی متحرک انگلیاں باپ کے جسم میں ان جگہوں پر پیوست ہونے لگیں جہاں گولیاں داغی گئی تھیں۔

ایلیا روتے ہوئے چیخی۔ "فیروز! یہ کیا کر رہے ہو؟"

وہ سرد لہجے میں بولا۔ دیکھتی نہیں۔ گولیاں نکال رہا ہوں۔

"خدارا بس کرو۔ بس کرو فیروز۔"

ماں دھیرے سے بولی "باپ پر بیٹے کا حق ہوتا ہے۔"

ایلیا پھر چیخی۔ مگر..... "تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟"

"میں اس واقعہ کو زندہ رکھنا چاہتا ہوں۔ سمجھی تم ایلیا۔ زندہ رکھنا چاہتا ہوں، وہ حلق پھاڑ کر چیخا۔ صرف باپ کی موت مجھے یاد نہیں رہ سکتی۔ صرف یہ، کہ ایک رات یہ گولیوں سے چھلنی ہوا تھا۔ میں اس کے جسم سے ساری گولیاں نکالتے ہوئے اس واقعہ سے جڑنا چاہتا ہوں۔ ڈراونے خواب کی طرح۔"

"نہیں ایسا مت کرو۔ ایسا مت کرو فیروز....."

ایلیا زور زور سے چلانے لگی۔ ماں اسی طرح باپ کی لاش کے پاس بیٹھی تھی۔ جیسے کچھ بھی اس کے لیے عجوبہ نہ ہو۔

سیز فائر

(کسی کہانی کے لیے یہ تعین کرنا ضروری نہیں ہے کہ وہ واقعہ کب ظہور میں

آیا.... یا وہ حادثہ کب سرزد ہوا۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ دن تاریخ، مہینے حقیقت سے پوری طرح واقف کرانے میں ہماری مدد کرتے ہیں۔ معزز قارئین! یہ سب کچھ ان دنوں ہوا۔ یا یہ مان لیا جائے کہ ان ہی دنوں ہوا ہو گا یا انہی دنوں ہو سکتا ہے.... ماننے اور فرض کر لینے سے سچ زیادہ شفاف ہو کر ہمارے سامنے آتا ہے)

(ہاں تو مان لیتے ہیں، یہ سب کچھ ان ہی دنوں ہوا ہو گا جب ایک انسانی نسل پرانی ہو رہی تھی اور دوسری نسل جوان ہو رہی تھی۔ ایک صدی وقت کے سرد و گرم کی کہانیاں سمیٹے رخصت ہو رہی تھی اور..... ایک صدی آ رہی تھی)

اور سچ یہ ہے کہ ہمارے ہیرو، یعنی فیروز راہب نے اس واقعہ کے بعد چرمی واسکٹ اتار پھینکا۔ اسے بہت ساری باتوں کا جواب نہیں ملا۔ مثلاً اس کے باپ کو کیوں مارا گیا۔ مثلاً اس قتل سے کسی کا کیا فائدہ ہو سکتا تھا۔ مثلاً.... اس کی ماں روئی کیوں نہیں۔ جس دن اس نے چرمی واسکٹ اتارا، اس دن ایک واقعہ اور ہوا۔ اس دن ایلیا اسے بدلی بدلی سی نظر آئی.... اس نے ایلیا کو غور سے دیکھا..... ایلیا کی آنکھوں میں ایک نئی دنیا آباد ہو رہی تھی۔

پھر کافی عرصہ گزر گیا۔

باپ، حادثہ اور گولی..... گو، بہت زیادہ وقت گزر جانے کے بعد بھی یہ حادثہ اسے کل کا لگتا۔ جبکہ اس درمیان یعنی باپ کی موت کے ٹھیک دو سال بعد ماں بھی باپ کے پاس چلی گئی۔ مگر سچ تو یہ تھا کہ وہ ماں کو بھول بھی گیا۔ مگر باپ کا حادثہ اس کے ذہن میں ابھی بھی جیوں کا تیوں محفوظ تھا۔ یعنی وہ خوفناک رات.... نصف شب ہونے والی دستک اور باپ کے مردہ جسم سے گولیاں نکالنے کا عمل..... اسے یقین تھا، باپ اس کے اندر زندہ ہے اور باپ اس کے اندر زندہ رہا تھا.....

اس بیچ، جیسا کہ باپ نے کہا تھا... جنگیں لگاتار ہوتی رہیں۔ ہاں، جیسا کہ آگے باپ نے سیز فائر کے بارے میں بتایا تھا... جنگیں رک رک کر پھر شروع ہو جاتیں۔

اس بیچ صرف ایک بات ہوئی۔ نہ چاہنے کے باوجود وہ فوج میں چلا گیا۔

ایک دن۔ کافی دنوں بعد اس نے ایلیا کو چہچہاتے ہوئے دیکھا تو چونک پڑا۔ ایلیا کی آنکھوں میں چمکتے رنگوں والی چڑیا کی شوخی اتر آئی تھی۔

"کیا بات ہے ایلیا...."

"سیز فائر۔۔۔۔ ایلیا ہنسی۔۔۔۔ میرے پیارے فوجی.... میں محبت کر رہی ہوں، وہ ذرا سا ہنسی.... کیوں محبت میں ہنسنا جرم تو نہیں ہے۔ اور میرے پیارے فوجی۔ یہ بات تمہارے لیے بھی ہے۔ تم بھی محبت کرنا شروع کر دو۔"

وہ اس کے قریب آگئی۔ "جنگ میں ہم ایک دوسرے سے دور چلے جاتے ہیں .... نہیں؟"

"تمہیں باپ کے جسم سے نکلنے والی گولیاں یاد ہیں؟"

"آہ ۔۔۔۔ تم بالکل نہیں بدلے۔ سنو، باپ نہیں ہے۔ میرے پیارے فوجی۔ باپ بہت دور چلا گیا ہے۔ وہ کھلکھلائی .... محبت جنگ کو بھلا دیتی ہے .... تم سمجھ رہے ہو نا میرے پیارے...."

ان دنوں آسمان پر گدھوں کی طرح جنگی طیاروں نے منڈرانا شروع کر دیا تھا۔ اس کے پاس بھی جنگ میں شامل ہونے کا پروانہ آگیا۔۔۔۔ اس رات دونوں نے جشن منایا.... ایلیا نے اپنا وائلن نکالا جو اس کے باپ نے اس کی بارہویں سالگرہ پر دیا تھا۔ فیروز نے اپنا ڈریسنگ گاؤن نکالا، جو چرمی واسکٹ کی طرح اسے پسند تھا۔

کمرے میں مدھم اندھیرا تھا۔ ایلیا دیر تک وائلن بجاتی رہی۔ وہ تا دیر اپنی خوشی کا اظہار کرتا رہا۔ شاید لام پر جانے سے قبل وہ ہر طرح کے احساس سے بے خبر ہو جانا چاہتا تھا۔

"محبت" ۔۔۔۔ ایلیا نے وائلن سے ہاتھ روک کر کہا ۔۔۔۔ "جنگ میں کوئی

عورت مل جائے تو اس سے محبت ضرور کر لینا۔"

ایلیا اور محبت

جنگ بند ہو چکی تھی۔ وہ جنگ سے واپس لوٹ آیا۔ پھر وہ جنگ میں شامل نہیں ہوا پھر بہت کچھ نہیں ہوا۔ پھر جیسے وقت کا پرندہ ایک لمبی چھلانگ لگا گیا۔ صدی ..... ایک صدی، دوسری صدی میں گم ہونے والی تھی۔ اور نئی صدی گم ہونے والی صدی کے بطن سے جنم لینے والی تھی.... اچانک اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ایلیا ایک معمر عورت میں تبدیل ہو کر اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں وہی وائلن تھا۔

"آہ" سب ختم ہو گیا۔ وہ دھیرے سے بڑبڑایا۔ ڈریسنگ گاؤن کافی پرانا پڑ چکا تھا۔ بٹن ٹوٹ گئے تھے۔ کپڑا بوسیدہ ہو چکا تھا۔ اور وہ دو نالی بندوق۔ زندہ رہنے کے لیے...."

"آہ" اس نے لمبا سانس کھینچا۔

"بالآخر وہ آدمی بھی ..... کیوں ایلیا۔ وہ آدمی بھی فریبی نکلا نا.... کیا ملا اس پر ایک عمر لٹا کر.....؟"

ایلیا کے لہجے میں ہنسی تھی۔ "تم نہیں سمجھو گے میرے پیارے بوڑھے فوجی۔ اس کی آواز میں کہیں بھی تھکن نہیں تھی ...... وہ وائلن تب بھی بجتا تھا.... وہ اس لمحے کا سچ تھا۔ وہ سچ آج بھی ہے۔ یہ میرا سچ ہے...... محبت، محبت ہوتی ہے میرے پیارے فوجی۔"

آنکھیں موند کر وہ وائلن بجانے میں مصروف تھی۔

"کیا تمہیں اس کی یاد آتی ہے ایلیا؟"

ایلیا بے ساختہ مسکرائی..... "تمہیں باپ یاد ہے۔ بلیوں کو اپنے راستوں کا پتہ ہوتا ہے...."

وہ دیر تک کمرے میں چپ چاپ ٹہلتا رہا۔ اور اس درمیان ایلیا برابر وائلن بجاتی رہی۔

محبت اور مادام ایلیا کا نظریہ

جنگ کے درمیان بہت سی باتیں ہوئیں... جیسے... ایک رات، اس کے شراب کے گلاس میں ایک کاکروچ گر گیا تھا۔ جیسے کاکروچ کی موت کا جشن منایا گیا تھا۔ مگر وہ آدمی ... نہیں، اسے کاکروچ کو یاد رکھنا ہے اور اس آدمی کو بھول جانا ہے..."

"وہ آدمی ......اس کی انگلیوں کے پور پور میں جیسے ایک یگ تک باپ کے جسم میں لگی گولیوں کا درد موجود تھا۔ ویسے ہی وہ آدمی..."

فیروز دھیرے سے کھانسا۔ وہ آدمی اس کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ بس ایک گولی چلی تھی۔ دشمن کے دفاع میں چلنے والی محض ایک گولی۔ اپنی حفاظت کے لیے ...... باپ کے الفاظ جیسے مدھم پڑ گئے تھے.....

اس نے گولی چلا دی۔ سرحد کے اس پار، اس نے کسی کو گرتے، چھٹپٹاتے اور دم توڑتے ہوئے دیکھا۔ بہت ساری چیخوں کے بیچ وہ چیخ واحد تھی، جو اس کی جنم دی ہوئی تھی۔ اس نے دیکھا، اس کی بندوق کی نال سے ابھی بھی دھواں اٹھ رہا تھا۔ اور وہاں.... سرحد کے اس طرف۔

وہ دھیرے دھیرے پیچھے ہٹ رہا تھا۔ خوفزدہ ہو کر۔ یہ.... یہ آدمی.... فوج میں شامل ہونے سے قبل بھی اسے معلوم تھا کہ....وہ کسی پیس مشن میں نہیں جا رہا تھا... .وہاں گولے برسیں گے.... بارود پھٹیں گے.... آگ کے آسمان چھوتے شعلے ہوں گے....اور ... آدمیوں کی چیخ ہوگی .....اسے سب کچھ پہلے سے پتہ تھا۔ پھر بھی اسے یقین نہیں تھا کہ اس کی بندوق سے۔ وہ آدمی..... ایک آدمی۔ بس ایک آدمی.... اس براعظم سے کم ہونے والا وہ ایک آدمی اس کی گولی کا نشانہ بنے گا۔ اس کی گولی کا۔ ایک

اذیت ناک حقیقت۔

"آہ... تم نے وقت گنوا دیا۔۔۔" ایلیا اس کے پاس آ کر ٹھہر گئی۔ زندہ رہنے کے لیے..."

اس نے بندوق کو جنبش دی جیسے گہرے سناٹے سے باہر نکلنے کا راستہ ڈھونڈ رہا ہو۔

اس کے بعد جو ہوا وہ بہت عجیب تھا۔ اپنے لہجے میں سختی پیدا کرتے ہوئے ایلیا نے اس کے ہاتھوں سے بندوق چھین لی۔

"یہ وہی بندوق ہے نا جس کی گولی سے...."

"ہاں ......" اس نے گہرا سانس کھینچا۔ تاہم یہ اعتراف کرنے میں اسے ذرا بھی دشواری نہیں ہوئی۔

"ایلیا نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔۔۔ مجھے پتہ ہے۔ تم کیا چاہتے ہو۔ ٹھیک اپنے باپ کی طرح... اس بندوق کو بھی اپنی زندگی سے لگا کر رکھنا چاہتے ہو۔۔۔"

"اس کا لہجہ تیکھا تھا۔ یادوں کو اپنے دل سے نکال کیوں نہیں دیتے۔"

وہ ایک دم ایسے چونک پڑا، جیسے شراب کے گلاس میں کاکروچ کو دیکھ لیا ہو....

تم۔ ایلیا تم.... تم بھی تو.... یہ وائلن ....

ایلیا نے اس کے ڈریسنگ گاؤن پر ایک نظر ڈالی اور کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"میرے پیارے، برسوں بعد وہی چمکتے رنگوں والی چڑیا کی شوخی اس کی آنکھوں سے جھانک رہی تھی...."

"زندہ رہنے کے لیے.... ایک.... ایک محبت بھی کافی ہوتی ہے میرے پیارے فوجی۔"

○○

بھنور میں ایلس

(۱)

ادھر آنکھیں بوجھل ہوئیں، ادھر خواب کے در کھل گئے... پھر جیسے کسی نے انتہائی معصومیت سے صدا لگائی ہو... ایلس آنکھیں کھولو... آنکھیں کھولو نا ایلس...." "جاؤ نہیں کھولتی۔ ابھی مزے مزے کے سپنے جو دیکھ رہی ہوں.... آنکھیں کھلیں تو سپنا ٹوٹ جائے گا..."

آواز پھر گونجی۔ "اچھا خیر چھوڑو، یہ بتا، سپنے میں کیا دیکھ رہی تھی...؟"

"میں نے دیکھا کہ... ایلس کہتے کہتے ٹھہر گئی.... نہیں پہلے تم بتاؤ.... لوگ مرنے سے گھبراتے کیوں ہیں؟"

"مرجانا ایک بھیانک ڈراونے خواب کی طرح ہے۔ جہاں آنکھیں بند ہوتے ہی ہم سب سے دور چلے جاتے ہیں۔ وہاں آسمان پر ٹمٹماتے تاروں کی طرح.... خود کو نہیں پانے، کھوج نہیں پانے اور ہمیشہ کے لیے کہیں گم ہوجانے کا احساس.... نہیں ایلس۔ تم نے بے وجہ مغالطے میں ڈال دیا ہے۔ ہنس مت پگلی۔ بتاؤ نا، خواب میں کیا دیکھا؟"

"بتاؤں گی تو ہنسنے لگوگی۔ میں نے دیکھا کہ میں مر گئی ہوں.... اور وہاں.... آسمان پر جو تارہ چمک رہا ہے نا، وہ میں ہوں.... اچھا بتاؤ.... رات میں آسمان پر چمکنے والے تارے کتنے بھلے اور سندر لگتے ہیں.... اچھا سمجھ لو ہم مر گئے ہیں اور مر کر

وہاں آسمان میں گل بوٹوں کی طرح چپک گئے ہیں۔ اس تارے کی طرح.... تو اس میں گھبرانے کی بات کیا ہے؟"

"گھبرانے کی بات کیسے نہیں ہے ایلس... ہم اکیلے تھوڑے ہی ہوتے ہیں، ایک خاندان ہوتا ہے۔ اور خاندان سے بچھڑ کر آنکھیں موند لینا... ایک دم سے ہنستی مسکراتی، جیتی جاگتی دنیا سے کٹ کر گم ہو جانا... ہوا میں تحلیل ہو جانا... اب جیسے تم ہی سوچ کر دیکھو نا ایلس... تمہارے شوہر ہیں، تمہاری ایک لڑکی ہے۔ اسکول سے آنے میں ذرا سی دیر ہوئی تو کیسے بوکھلا جاتی ہو تم؟ بوکھلا جاتی ہو نا.... اب ذرا سوچو.. .. آنکھیں بند ہو گئیں تو.... ان سب کی خیر خبر کون لے گا...؟"

"کون لے گا؟..... ایلس ہنستی ہے.... ارے تب اپنی خیر خبر یہ خود لیں گے .... اس میں گھبرانے کی بات کیا ہے۔ ذمہ داری سب سکھا دیتی ہے۔ ہاں تم نے پوچھا نہیں.... میں نے کیا خواب دیکھا.... میں نے دیکھا کہ.... نہیں ڈرو مت.... اپدیش مت دو۔ مرنا سب کو ہے۔ ہم امر بیل کھا کر تھوڑا ہی آئے ہیں جو ہمیشہ زندہ رہیں گے.... ہاں تو میں نے دیکھا کہ.... اب کیا بتاؤں.... ایسی روشنی... چکا چوند روشنی.... دودھ کی نہریں.... سیب کے باغات، مخمل و کمخواب میں لپٹے حسین خوبصورت چہرے.... میں نے دیکھا.... ندی کی لہروں کی طرح ان میں سے ایک میں بھی ہوں.... خوب سفید براق لباس میں.... اور ہوا کی طرح.... لہروں کی طرح میں ان کے درمیان تیر رہی ہوں... میں نے دیکھا کہ میرا جسم بالکل ایسا ہی ہے جیسے ابھی ابھی ہے۔ نہیں اس سے بھی کچھ ہلکا ہو گیا ہے.... جیسا کہ کالج کے دنوں میں تھا.... اور میں ان دنوں سے زیادہ سندر اور پریوں جیسی ہو گئی ہوں... اور میں نے پایا کہ.... جسم کے باقی اعضاء اپنی جگہوں پر ہیں.... مگر ایک شے نہیں ہے..... دماغ والی جگہ خالی ہے، جیسے مرنے کے بعد نکال لیا گیا ہو.... یا صاف کر دیا گیا ہو.... اس لیے میں صرف تیر رہی ہوں۔ تیر رہی ہوں.... بس تیر رہی ہوں.... یوں کہ سوچ نہیں پا رہی

ہوں۔ کسی کے بارے میں بھی.... اچھا چھوڑ.... سپنے کی باقی باتیں رہنے دے.... یہ بتانا، لوگ مرنے سے گھبراتے کیوں ہیں؟"

لیٹے لیٹے کتاب پڑھتے پڑھتے ایلس کی اچانک آنکھ لگ گئی تھی۔ کتاب ہاتھ سے چھوٹ کر سینے پر آ گئی۔ لاشعوری طور پر دایاں ہاتھ سینے پر چلا گیا۔ وہاں.... جلتے ہوئے پھوڑوں کی جگہ.... جیسے کسی نے کباب لگانے والی سیخ اچانک اس کے سینے میں اتار دی ہو۔ "تھلے" کی مڑی تڑی چمڑی میں اینٹھن پڑ گئی ہو۔ کہتے ہیں سینے پر ہاتھ آجائے تو ڈراونا خواب آجاتا ہے۔ مگر ڈراونا کہاں.... وہ تو جیسے خواب جزیروں کی ناآفریدہ وادیوں کی سیر میں گم تھی.... ہاں نیند اس وقت ٹوٹی جب اشرف کے مکڑے کی طرح رینگتے ہوئے ہاتھ اس کے کندھے تک آکر ٹھہر گئے۔ اس نے دونوں آنکھیں بند کر کے اشرف کے چہرے کو پڑھنا چاہا۔ پھر مزہ لینے کے لیے ایک آنکھ ذرا سی کھول دی۔

اشرف کے تھرتھراتے ہاتھوں نے کتاب اٹھالی....

"ایلس، سوئی ہو کیا...؟"

وہ شرارت سے دونوں آنکھیں کھول کر مسکرا پڑی۔... "نہیں تو۔ ہاں، ہلکی سی نیند لگ گئی تھی۔"

"کتاب پڑھ رہی تھی؟"

وہ تیزی سے بچوں کی طرح اٹھ کر بیٹھ گئی۔

اشرف نے اطمینان کی سانس لیا۔ پھر کتاب کی طرف دیکھا.... "روشومین! یہ پڑھ رہی تھی؟"

"ہاں ...." وہ علی الصباح، سناٹے کو توڑنے والی.... اور نیند سے بوجھل ہو رہے لوگوں کو جگانے والی.... چڑیا کی طرح چہچہائی.... "جاپانی ناول ہے۔ میں اب

تک سمجھتی تھی کہ یہ جاپانی کمبخت نئی نئی ایجادوں کے سوا اور کچھ جانتے ہی نہیں۔ چھوٹے ٹھگنے قد والے! ان کے دماغ میں تو بس دنیا کو جنت بنانے والے سپنے ہی بستے ہوں گے... مگر دیکھو نا، کتنی عمدہ کہانی ہے..."

اشرف نے غور سے اس کے چہرے کو پڑھا۔ کہا کچھ نہیں۔

ایلس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔ "جاپان کی قدیم راجدھانی کیوتو کا عظیم الشان گیٹ روشومین وقت کے ساتھ کھنڈر بن چکا ہے۔ وہاں لاوارث لاشوں کا پایا جانا بہت معمولی بات ہے.... کیوتو شہر قدرتی آفات کی زد میں آ گیا۔ ادھر سمورائی کے گھر سے نکالے جانے والا ایک بے بس نوکر ہے جس کے لیے سب سے ضروری شے ہے، اس کا زندہ رہنا۔ نیکی اور بدی سے اوپر، اس نوکر کے ساتھ حقیقت صرف اتنی سی تھی.... زندہ رہنا اور سوزاکو کے کسی دیوار کے سامنے دم توڑنا.... اور اچانک روشومین کے ہولناک کھنڈر میں وہ ایک بوڑھی عورت کو دیکھتا ہے جو لاشوں کے، سر کے بال اتار رہی تھی۔ نوکر خوفزدہ ہو کر اصلیت پوچھتا ہے... تو معلوم.. بوڑھی عورت نے کیا جواب دیا... اس نے کہا... میں لاشوں کے سر کے بال اتارتی ہوں، اور ان کی ٹوپیاں بنا کر بیچتی ہوں۔

غلط تو میں بھی ہوں۔ مگر تمہاری طرح ذلالت بھرے کام نہیں کرتا، نوکر نے پوچھا، تمہیں ایسا کرتے ہوئے شرم نہیں آتی؟"

بڑھیا نے کہا۔ "ہو سکتا ہے یہ کام تمہارے نزدیک ذلت بھرا ہو... مگر بھائی جس عورت کی لاش سے یہ بال میں نے اکھاڑے ہیں کیا وہ مجھ سے بھلی تھی؟ بولو، مجھ سے بھلی تھی وہ؟ نہیں جواب دے سکتے۔ پھر؟ مجھے ایک بری اور مردہ عورت کے سر کے بال اتارنے کا حق کیوں نہیں؟"

ایلس نے اشرف سے کہا۔ جانتے ہو، اس پر سوزاکو کے یہاں سے نکالے گئے چور نے کیا کہا۔ اس نے کہا... بھولی بڑھیا! یہ اچھی بات ہے۔ گویا زندہ رہنے کے

لیے دوسرے کا لٹنا بھی ضروری ہے۔ سو اگر میں تمہیں لوٹ لوں تو یہ بھی کہیں سے غلط نہیں ہو گا۔ کیونکہ اس کے عوض میں اپنی دوزخ شانت کروں گا اور زندہ رہوں گا۔"

ایلس کی آنکھوں میں تجسس کی موجیں تھی..... اشرف، لوگ زندہ کیوں رہنا چاہتے ہیں، ممکن ہے موت زندگی سے کہیں زیادہ خوبصورت ہو..."

"پھر وہی موت، اشرف زور سے چیخا۔ کس نے کہہ دیا کہ تم مرنے والی ہو؟"

"اشرف... اس نے جیسے آنکھوں کے رستے پلاش کے پھول بچھا دیے ہوں..." غصہ کیوں کرتے ہو... موت حقیقت ہے تو اس سے بھاگتے کیوں ہو.... میں ہوا میں تحلیل ہو گئی تو زمانہ کی چال نہیں رک جائے گی۔ یہ ایسے ہی اس وقت بھی قائم رہے گی جیسے ابھی ہے جیسے اس سے پہلے.... جیسے اس وقت تم ہو..."

وہ اپنی دھن میں کہے جا رہی تھی...." ایک کھنڈر ٹوٹتا ہے۔ اس پر دوبارہ ایک نئی عمارت تعمیر ہو جاتی ہے... پھر؟ ایک شناخت مٹتی ہے نئی شناخت بنتی ہے۔ ہم گم ہو جاتے ہیں... ہم سے بھی اچھے لوگ اس دنیا میں آجاتے ہیں.... کوئی کسی پر مسلط، حاوی یا ٹکا نہیں ہے۔ سب اپنی ضرورت ہیں... جیسے وہ لاشوں سے بال اکھاڑ کر ٹوپیاں بناتی ہوئی بڑھیا! روشومین کے کھنڈر میں بڑھیا کو لوٹ کر اپنے زندہ رہنے کا، سامان کرنے والا سوزا کو کا نوکر..."

پھر وہ تیز آواز میں بولی۔ "میں کھو جاؤں گی، تب بھی یہ کارخانہ ایسے ہی چلتا رہے گا، اشرف.... سمجھے!"

وہ ہنسی تو ایک کھنک دار ہنسی کمرے میں گونجتی چلی گئی۔ لیکن اس ہنسی میں کہیں کوئی درد انگیز کیفیت نہ تھی۔ ایک بیباک سی بیگانہ روش تھی جو ہمیشہ سے ایلس کے مزاج کا ایک حصہ رہی تھی۔

(۲)

کچھ سال پہلے کی بات ہے....

بس کچھ سال.... اور کچھ سال میں بہار دروازہ تک آتے آتے ٹھہر گئی تھی۔ سیڑھیاں چڑھتے ہی دائیں طرف ایلس کا کمرہ تھا۔ کمرے کے ٹھیک باہر جنگل سا تھا۔ کھڑکی کھول کر وہ گھنٹوں فرصت کے اوقات ہری بھری وادیوں کو دیکھتی رہتی۔ اشرف دفتر چلے جاتے تھے اور شابانہ اسکول.... وہ گھر پر ہوتی تو خالی وقت میں ساتھی یا تو کتابیں ہوتیں یا قدرت کے یہ گل بوٹے....

تب کڑاکے کی ٹھنڈی کم ہونے لگی تھی۔ آموں میں بور آنے لگے تھے۔ کوئل کی کوک سنائی دینے لگی تھی۔ سامنے جلتے انگاروں جیسے، پھولوں سے لدے پلاش کے پیڑ تھے۔ پیڑوں کے بارے میں جاننا اور پہچاننا اسے اچھا لگتا تھا۔ وہ ہاتھ کے اشارے سے بتا سکتی تھی... کہ یہ ڈھاک ہے... یہ ٹیسو، یہ کھاکھر... چھیولا... اور یہ پلاش.... بیوٹیما مونوسپرما یعنی فلیم آف دی فاریسٹ Flame of the forest

پلاش کے پھول.... بچپن میں ان سے رنگ گندھا کرتی تھی وہ... پانی میں گھول کر کتنے کتنے رنگ چرا لیتی تھی۔

ہوا تیز تیز چل رہی تھی۔ پلاش کے سرخ پھول ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔ پھر کوئی تیز ہوا آئی۔ سرد سی ہوا اسے چھوتی ہوئی گزر گئی۔ اس نے دروازہ بند کیا۔ کچھ دیر تک وہیں پر، برف سی، جمی کھڑی رہی.... یہ سینے کے پاس اینٹھن کیسی ہے؟ چمڑی کے اندر اندر اتر جانے والی اینٹھن؟

رات میں شابانہ سو گئی تو بے اختیار ہو رہے، اشرف کے، بدن پر مکڑے کی طرح رینگتے ہاتھوں کو اس نے چھاتی کے گڈھوں پر لاکر ٹھہرا دیا...... یہاں

چھوؤ تو سہی.... یہاں.... یہاں دیکھو...“

”ہاں..... کیا ہے؟“

”کچھ محسوس ہوا ...؟“

”نہیں تو....؟“

”کچھ جلن سی ہے.... دیکھونا، یہاں کچھ ابھر رہا ہے.... گلینڈ سا...“

اشرف کے ہاتھوں کی آوارگی میں جیسے خلل پڑ گیا۔ وہ چونک پڑا۔ رات کے اندھیرے میں مکڑے سے سانپ بنتے ہاتھ اچانک خرگوش جیسے نرم اور خوفزدہ ہو گئے۔

”ہاں ہے تو.... کچھ کچھ.... ابھرا سا.... ڈاکٹر کو دکھالینا۔ اب سو جاؤ۔“

اسی کے ساتھ وہ کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔ ابھی کچھ دیر پہلے تک کیسا اتاؤلا ہو رہا تھا۔ اور ابھی اچانک ... اس کے ہونٹوں پر ایک شرارت بھری مسکان اتر گئی۔ خود غرض، مطلبی.... وہ بچوں کی طرح ہنسی.... لیٹ تو گئی مگر ہوا سے گرتے پلاش کے پھول نظروں میں گھومتے رہے.... اس سے ذہن گھومتا تو پھر وہیں چلا جاتا.... یہاں چھاتی میں اندر کا گوشت کوئی ایسے گھوڑ موڑ رہا ہے، جیسے دودھ کو اسٹیل کے برتن میں رکھ کر فریج کے Chiller میں رکھ دیا جائے تو....؟ کیسے ایک دم سے سوکھ کر برف ہو جاتا ہے ... اور اوپر اوپر برف کی تہہ جم جاتی ہے۔ ٹھیک ایسے ہی.... چھاتی میں جیسے دودھ اور خون کو کوئی چور مچور کر، نچوڑ کر، برف کی جھلیاں بنا کر پیس رہا ہو.... اندر تک پورا بدن کنکنا رہا تھا...

ایلس کمرے میں آ گئی۔ کمرے میں سوئی ہوئی شاہانہ کو ہولے سے چھوا۔ شاہانہ نیند میں بے خبر تھی۔ ایک دو بار مداخلت بری لگنے کے انداز میں چونکی پھر کروٹ بدل کر نیند میں کھو گئی۔ ایلس نے شاہانہ کے بے حد معصوم شگفتہ لبوں پر انگلی پھرائی۔ یہاں سے ہو کر بیسن کے پاس لگے آئینہ کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

بلب روشن کیا۔ پھر دھیرے سے نائیٹی کا، آگے کا ہوک کھولا۔ دو بھڑکتے شعلے نائیٹی سے باہر چھلچھلا پڑے۔ اس نے چھاتیوں پر ہاتھ پھیرا.... یہاں....

مگر چھاتیاں ویسی ہی روشن تھیں۔ ویسی ہی بھری ہوئی اور کسی کنواری لڑکی کے پستان کی طرح کٹھور..... شاہانہ دس برس کی ہو گئی۔ اس نے ان دس برسوں میں اپنا فیگر کتنا مین ٹین کر کے رکھا تھا۔ ایک بار پھر پستان کو چھو کر مطمئن ہونا چاہا مگر ..... چھاتیوں میں پڑی کوئی گرہ اس کے ذہن پر بھی پڑ گئی تھی۔

ایک لمحے کو گھبرا کر، آئینہ میں اپنا خوفزدہ چہرہ دیکھا اس نے۔

"ایلس! کیا تم خوفزدہ ہو؟"

"بولو ایلس! کیا اس لیے کہ ایک دن گم ہو جاؤ گی تم...!"

"ہاں، ابھی عمر ہی کیا ہے۔ صرف ۳۵ سال۔ مگر ۳۵ سال کی عمر بھی تو کوئی کم نہیں ہوتی۔ مان لو اگر گم ہو گئی تو...؟ ... کیا اسی لیے خوفزدہ ہو ... وہاں، کمرے میں اشرف سوئے ہیں۔ ایک بہت ہی پیار کرنے والے شوہر ... بچوں کی طرح غیر ذمہ دار اور بے ترتیب ... اور ننھی سی شاہانہ ... تم سوچتی ہو۔ سب تمہارے سہارے زندہ ہیں؟"

ایلس نے نائیٹی کا ہک بند کیا ... کوئی کسی کے سہارے زندہ نہیں ہے ایلس ... بس زندہ رہنے کا عمل ہے یہ، کہ اصول، قاعدے اور ضابطے کی ایک دیوار اٹھ جاتی ہے ... بس ... اور اس دیوار کے اندر ہی زندگی تلاش کرنی پڑتی ہے ... یہ دیوار ٹوٹ بھی گئی تو، کہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا ایلس ..."

وہ دھیرے سے مسکرائی ... اب وہ پوری طرح مطمئن تھی ... ایک بار پھر اس نے اپنے سراپا کو غور سے دیکھا ... اور کچھ گنگناتی ہوئی کمرے میں آ گئی۔

اس رات ایلس صبح دیر تک گھوڑے بیچ کر سوتی رہی۔ آرام کی نیند....

بلب روشن کیا۔ پھر دھیرے سے نائیٹی کا، آگے کا ہوک کھولا۔ دو بھڑکتے شعلے نائیٹی سے باہر چھلچھلا پڑے۔ اس نے چھاتیوں پر ہاتھ پھیرا..... یہاں....

مگر چھاتیاں ویسی ہی روشن تھیں۔ ویسی ہی بھری ہوئی اور کسی کنواری لڑکی کے پستان کی طرح کٹھور..... شاہانہ دس برس کی ہو گئی۔ اس نے ان دس برسوں میں اپنا فیگر کتنا مین ٹین کر کے رکھا تھا۔ ایک بار پھر پستان کو چھو کر مطمئن ہونا چاہا مگر ..... چھاتیوں میں پڑی کوئی گرہ اس کے ذہن پر بھی پڑ گئی تھی۔

ایک لمحے کو گھبرا کر، آئینہ میں اپنا خوفزدہ چہرہ دیکھا اس نے۔

"ایلس! کیا تم خوفزدہ ہو؟"

"بولو ایلس! کیا اس لیے کہ ایک دن گم ہو جاؤ گی تم...!"

"ہاں، ابھی عمر ہی کیا ہے۔ صرف ۳۵ سال۔ مگر ۳۵ سال کی عمر بھی تو کوئی کم نہیں ہوتی۔ مان لو اگر گم ہو گئی تو...؟ ... کیا اسی لیے خوفزدہ ہو... وہاں، کمرے میں اشرف سوئے ہیں۔ ایک بہت ہی پیار کرنے والے شوہر... بچوں کی طرح غیر ذمہ دار اور بے ترتیب ... اور ننھی سی شاہانہ ... تم سوچتی ہو۔ سب تمہارے سہارے زندہ ہیں؟"

ایلس نے نائیٹی کا ہک بند کیا ... کوئی کسی کے سہارے زندہ نہیں ہے ایلس ... بس زندہ رہنے کا عمل ہے یہ، کہ اصول، قاعدے اور ضابطے کی ایک دیوار اٹھ جاتی ہے... بس ... اور اس دیوار کے اندر ہی زندگی تلاش کرنی پڑتی ہے ... یہ دیوار ٹوٹ بھی گئی تو، کہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا ایلس ..."

وہ دھیرے سے مسکرائی ... اب وہ پوری طرح مطمئن تھی ... ایک بار پھر اس نے اپنے سراپا کو غور سے دیکھا ... اور کچھ گنگناتی ہوئی کمرے میں آ گئی۔

اس رات ایلس صبح دیر تک گھوڑے بیچ کر سوتی رہی۔ آرام کی نیند....

(۳)

کچھ ہی دنوں میں مسز گروور اس کی دوست بن گئیں۔ مسز گروور وہی عورت ہیں، جن سے اس کا علاج چل رہا تھا۔ سبک اور متین لہجہ... آنکھوں میں مادرانہ شفقت کی بو باس... ہونٹوں پر نرمی اور مٹھاس۔ بھرے بدن کی ادھیڑ عمر کی عورت۔ بالوں میں سفیدی جھانکنے لگی تھی۔ چہرے سے گھریلو دکھنے کے باوجود کافی باوقار لگتی تھیں۔ گروور...

تین چار چھوٹی چھوٹی ملاقات کے بعد ہی مسز گروور نے دھماکہ کیا تھا۔

"...ایلس، کنگوجر اور تل چٹا دیکھ کر تمہیں ڈر تو نہیں لگتا؟"

"...نہیں تو۔ مگر کیوں؟"

"...میں ایک انکشاف کرنے جا رہی ہوں۔ انکشاف ہمیشہ چونکانے والا ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے میرا شک ہو..."

"آپ کہیں تو سہی۔ وہ ہنسی تھی۔ میں دل برداشتہ تب بھی نہیں ہوئی تھی جب شاپن ہار کو اس کی تخلیق میں شکست خوردہ محسوس کیا تھا۔ لوگ اتنے نراش وادی کیوں ہوتے ہیں اور شاپن ہار جیسا آدمی۔ اور مونٹا ئجین جیسا شخص، خودکشی کے بارے میں دلیلیں دے دے کر اس کو صحیح ثابت کرتا ہے۔ کمزور اور بزدل۔ میں اس Spiritual Pessimism پر یقین نہیں رکھتی۔

"SPIRITUAL PESSIMISM" ...مسز گروور زور سے ہنسیں۔ اسی لیے تم سے باتیں کرتے ہوئے مزہ آتا ہے ایلس۔ ناامیدی میں بھی موہوم سی ہی سہی مگر امید کی کرن ہوتی ہے۔ اچھا بتاؤ تو سہی۔ اگر میں انکشاف کروں کہ تمہیں بریسٹ کینسر ہے تو..."

وہ جیسے اچانک ایک پل کو برفانی بارش میں نہا گئی۔ حلق میں کچھ الفاظ اٹک

سے گئے۔ آنکھوں میں سراسیمگی تیر گئی۔ اس نے خود کو نارمل بنانے کی کوشش کی۔

"کیا یہ صحیح ہے مسز گرو ور؟"

"میرا شک بھی ہو سکتا ہے... اور بھگوان کرے میرا شک ہو۔ تمہاری عمر کی عورتوں کو ہمیشہ اس جانب سے فکر مند رہنا چاہیے۔ اگر سینے میں گانٹھ یا سوجن ہو۔ چھاتی یا آس پاس کی چمڑی دھنس گئی ہو۔ پستان سے پانی رستا ہو۔ ان باتوں پر یوں غور کرو کہ... یہ موضوع بھی تمہارے ہاتھ میں دبی کسی دلچسپ کتاب کی طرح ہے۔ تو کیا تم اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی کوشش نہیں کرو گی... اگر ہے بھی... بھگوان نہ کرے... تو کوئی غم مت رکھنا... انسانی جسم امراض کا گھر ہے۔ کیوں ایلس؟ تم گھبرا تو نہیں گئی...؟"

ایلس دونوں ہونٹ آپس میں بھینچتے ہوئے مسکرائی۔ "مسز گرو ور... میں بالکل نہیں ڈری۔ مجھے اچانک کچھ یاد آگیا۔ وہ جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ الگزینڈر سولزے نیٹسن... یہ نام یاد ہے نا آپ کو۔ آپ نے اس کی کینسر وارڈ پڑھی ہوگی۔ مجھے بس وہ عورت یاد آگئی۔ یاد ہے نا۔ جو اچانک اپنا سینہ کھول کر اپنے بوائے فرینڈ کے سامنے جذباتی ہو گئی تھی۔ Suck it... اسے منہ میں لے لو۔ چوسو! اس کا یقین کرو۔ یہ دہکتا ہوا انگارہ۔ اس کا یقین کرو ابھی یہ اس جگہ ہے... اور گواہ رہنا کہ یہ اس جگہ موجود تھا۔ کل یہ آپریشن کے بعد کسی گڑگڑیا ڈسٹ بن میں پھینک دیا جائے گا... مگر گواہ رہنا کہ یہ اس جگہ موجود تھا... اپنی تمام تر شعلہ سامانیوں کے ساتھ۔ ...یہ دہکتا ہوا انگارہ...."

اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے...

مسز گرو ور نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ایلس! کیا تم ڈر گئی ہو؟

"نہیں تو... آنسو پونچھتے ہوئے وہ پھر مچل گئی۔ "ہولناک مسز گرودور۔ انتہائی ہولناک۔ میں کینسر وارڈ کی حقیقت میں گم ہو گئی تھی مسز گرودور! آپ قطعی پریشان نہ ہوں۔ کردار، محض ایک کردار کی حقیقت نگاری نے مجھے کچھ دیر کے لیے گمراہ کردیا تھا۔

(۴)

اس انکشاف کے بعد گھر میں اچھا خاصا زلزلہ آ گیا تھا۔ اسے لگا، ہر کوئی اس سے نظریں چرانے کی کوشش کر رہا ہے۔ کئی کئی رات اس نے اشرف کو پاگلوں کی طرح بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے بھی پایا۔ کئی بار اندھیرے میں اس نے محسوس کیا... اشرف آنکھوں میں سمٹ آئے آنسوؤں کو پونچھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اسے دیکھتا پاکر مسکرانے کی کوشش میں وہ اور بوجھل ہو جاتا۔ وہ دیکھ رہی تھی، شاہانہ کے چہرے پر غم کی کالی بدلیاں تیر گئی ہیں۔ شاید وہ بھی اس انکشاف کے پردے میں بہت کچھ جان گئی ہے کہ ایک حقیقت جیسی شے، ماں جیسی شفقت کا سایہ ہولے سے ایک دن آنگن کی دھوپ کی طرح گم ہو جائے گا۔

صبح میں اگر وہ دیر سے اٹھتی تو دیکھتی کہ اشرف نے اپنے سارے کام خود ہی انجام دے دیے ہیں۔ شاہانہ کو اسکول کے لیے تیار کرنا، بریک فاسٹ کے لیے ٹوسٹ اور آملیٹ کا ریڈی میڈ ناشتہ تیار کرنا، کپڑے دھونا، استری کرنا، دھوبی، دودھ والے کا حساب رکھنا ...... اسے لگا، وہ کچھ بھی سے چھوٹ تو نہیں رہی ہے...... وہ کچھ کرنا بھی چاہتی تو اشرف نظریں چراتا ہوا اس کے سامنے چھا جاتا.....

"ریلیکس ایلس۔ کبھی کبھار آرام بھی تو کرلیا کرو۔"

"اب آرام ہی تو کرنے جا رہی ہوں۔ ہمیشہ کے لیے...."

وہ چاہتی تھی، اشرف اس جملے میں ہمیشہ کی طرح Wit آدھا محسوس کرے، مگر

اشرف اچانک ہی غمگیں ہو اٹھتا۔ آنکھیں بھر آجاتیں تو وہ نظریں پھیر لیتا۔ زیادہ جذباتی ہوجاتا تو اس کو بانہوں میں بھینچ لیتا۔ پاگلوں کی طرح ...... "تمہیں کچھ نہیں ہوگا ایلس! کچھ نہیں ہو گا......"

ایک معمولی سی سرکاری نوکری جس کی امید میں آنکھیں جیسے مستقبل کی زمین میں دفن قارون کا خزانہ دیکھنے کی سعی کر رہی ہوتیں..... زندہ رہنے اور مطمئن کر دینے کے احساس سے زیادہ کا "اتاولا پن" اسے بے چین بنا دیتا۔ وہ محسوس کرتی۔ سرد و گرم موسموں کی تمازت جذب کرتا ہوا اشرف اب بکھر سا رہا ہو...... وہ محسوس کرتی تو کھلی کتاب کی طرح اس کی آنکھوں میں اتر جاتی پھر جھانکنے اور پڑھنے لگتی.....

"میں نے کبھی تم سے کچھ زیادہ کی مانگ تو نہیں کی....؟"

"کبھی خود کو تم پر مسلط تو نہیں کیا؟"

"نہیں....."

"میں گرم ہوا کی طرح تم پر بار تو نہیں رہی۔ میں نے اتنا ہی چاہا نا، جتنا خود کو چاک کر کے چاہ سکتی تھی۔ پھر پاگل کیوں بنتے ہو، خوفزدہ کیوں رہتے ہو؟ مر جاؤں گی تب بھی کچھ نہیں بدلے گا۔ سب ایسا ہی رہے گا۔"

"وہ اشرف کی سانس سانس میں اتر کر کہتی ..... "ممی ڈیڈی گزر گئے۔ جب زندہ تھے تب ان کی ہلکی سی آہ پر کراہ اٹھتی تھی، لرز جاتی تھی..... اور سوچتی تھی، دعا مانگتی تھی کہ اللہ میاں انہیں ہمیشہ زندہ رکھیو۔ وہ گزر گئے تو اب گزرنے کے سوا کوئی سا بھی احساس باقی نہیں ہے۔ آنکھیں کھلنے تک جذبات جسم سے روح کی طرح چمٹے ہوتے ہیں..... بس..... ڈونٹ بی ایموشنل۔"

"اس نے دیکھا، اشرف نے ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیا۔ کرسی پر دھم سے بیٹھ گیا۔ کچھ اور نہیں ہوا تو بلند آواز میں رونے لگا۔

وہ جھکی "SPIRITUAL PESSIMISM ۔۔۔ مجھے معلوم ہوتا کہ تم شاپن ہار میں سے ہوتو میں کبھی تم سے شادی نہیں کرتی۔۔۔۔۔"

(۵)

اندھیرے کمرے میں جب کوئی نہیں ہوتا تو ایلس دیر تک خلاء میں اپنے سوالوں کا جواب تلاش کرتی رہتی۔ کیا سچ مچ وہ ایک دن گم ہوجائے گی؟ یوں غبارے سے نکلی ہوا کی طرح۔۔۔ پھر کہاں جائے گی۔۔۔۔ اسے لگتا کہ کوئی اس کے قریب کھڑا ہے۔۔۔ یہاں اس قبر میں لوسی سو رہی ہے۔ تم بھی سو جاؤ گی۔

وہ چونک کے اٹھتی ہے۔ پھر تالستائے کے ایوان ایلچ کے بارے میں سوچتی ہے۔ ایوان ایلچ مر گیا ہے۔ کمرے میں اس کا جنازہ رکھا ہے۔ سوگوار گم سم کھڑے ہیں۔ حالانکہ ماحول ہی کچھ ایسا ہے، مگر سب سوگوار ہونے کا ناٹک کر رہے ہیں۔ ایوان کے دوست، رشتے دار، یہاں تک کہ اس کی بیوی۔۔۔۔ سب آخری رسوم کے جلد سے جلد فارغ ہونے کے انتظار میں ہیں۔ انتشار اور اضطراب سے الگ ایک ابدی سکون۔

وہ ٹھہری۔۔۔ روح سب سے پہلے بدن سے، اپنا رشتہ کہاں سے منقطع کرتی ہے۔ وہ آہستہ سے جانگھوں پر سے ساڑی ہٹاتی ہے۔ کمرے میں در آئی تیز ہوا کھڑکی کے پردے، جھٹکا کر، اس کے "پوشیدہ مقام" سے ہوتی ہوئی چپکے سے گزر جاتی ہے۔۔۔ یہاں سے ۔۔۔۔! ممکن ہے، یہیں سے عورت اپنے خالق کہلانے کا درجہ حاصل کرتی ہو۔ یہیں سے تسکین کے سوتے پھوٹتے ہیں، اور عجب کیا کہ روح کی نجات بھی یہیں سے ہوتی ہو!

پیروں کو عریاں کیے۔ وہ دھیرے ہاتھ پھیرتی ہوئی اس مقام کی "سنکری" گلیوں

تک آکر ٹھہر جاتی ہے....

(۶)

وقت ہوا کے جھونکے کی طرح اڑا اور ایلس کسی کمزور عمارت کی طرح ڈھ گئی۔ پہلے وہ سوچتی تھی... لوگ موت ENJOY کیوں نہیں کرتے۔ ایک انجانی سی منزل؟ جس کو کسی نے بھی نہیں دیکھا۔ ایک انجانی سی دنیا۔ جس کی دریافت کسی نے بھی نہیں کی... وہ چاہے جنت ہو یا دوزخ یا محض تصور ہو.... موت اس کے لیے کسی چکا چوند گلیمر کی طرح تھی مگر دھیرے دھیرے تکلیف کی شدت نے اسے تنکا تنکا کھوکھلا کرنا شروع کر دیا تھا...

جیسے نالے کا منہ کھل گیا ہو... چھاتی کا ناسور اور اس سے رسنے والا مواد..... جیسے اندر سے، تھلے کو کوئی شے پچوڑ ہی رہو.... پہلے آئینہ کے سامنے نائٹی کا ہک کھولتے ہی جو شے آنکھوں میں سب سے زیادہ جگمگاتی تھی اب اس سے گھن اٹھ رہی تھی۔

ہاں ... وہ تھک گئی ہے.... اٹھنے سے چکر آنے لگتے ہیں۔

شابانہ اس کے پاس آکر پتھر کی مورت کی طرح ٹکر ٹکر اس کا چہرہ تکتی ہے اور کسی بڑے سمجھدار آدمی کی طرح کہتی ہے۔ "ممی! اب مجھے اکیلے کمرے میں ڈر نہیں لگتا۔ میں خود سے کنگھی بھی کر لیتی ہوں۔ مجھے سارے کام آتے ہیں۔ ممی...."

اشرف اس سے نظر بچانے کی کوشش کرتے ہیں .... جیسے اس کے بکھرتے وجود میں دن، مہینے اور برس گن رہے ہوں۔ کبھی کبھی کمرے میں پاگلوں کی طرح ٹہلنے لگتے ہیں۔

جبراً وہ مسکرانے کی کوشش میں صدا لگاتی ہے.... "اشرف، گھبراتے کیوں ہو... کسی اور کو لے آنا..." وہ ہنستی ہے۔ "ذرا سوچو، شابانہ کی پیدائش کے دو

سال بعد سے میں تمہارے لیے کیا رہ گئی ہوں۔ ایک ایسی ضرورت جو تم میرے سوا بھی پوری کر سکتے ہو۔ کسی سے بھی۔۔۔ بس اسی ضرورت کے لیے میں یاد آؤں گی۔"
وہ زور سے ہنسی۔۔۔ "یو انڈین! اتنا پڑھ لکھ کر بھی تم لوگ دقیانوسیت کے خول میں کیوں بند رہتے ہو؟"

پھر اس نے اشرف کی گھٹی گھٹی سی آواز سنی۔ "مائی ڈارلنگ ایلس! یہ سب ۔۔۔ ایسا کیوں سوچتی ہو؟"

"اس لیے کہ اب تم لڑتے نہیں، بگڑتے نہیں، ناراض نہیں ہوتے۔ تم موم بتی کے پگھل جانے کی راہ دیکھ رہے ہو۔" اس نے غور سے اشرف کی آنکھوں میں جھانکا۔ "موم بتی جب تک جل رہی ہے۔۔۔ آخری شعلے تک ۔۔۔ وہ روشنی تو دے رہی ہے۔۔۔ میں ابھی نہیں مر رہی۔۔۔ جب مروں گی، تب دیکھا جائے گا۔ موت کو عام حقیقتوں کی طرح قبول کرنا سیکھو۔۔۔ جینا سیکھو۔"

زندگی جینا اور ہر لمحے کو ENJOY کرنا۔۔۔ مسز گروور سے یہی تو وہ کہتی ہے۔

"سرخ پلاش کے پھول پھر کھل اٹھے ہیں۔ پچھلے سال بھی کھلے تھے۔ تب سے ایک سال گزر گیا۔ ایک سال زندہ رہی نا۔۔۔؟"

"ہاں۔"

"اگر مسز گروور! ایک سال پہلے میں اداس ہو گئی ہوتی تو ۔۔۔۔۔" وہ کہتے کہتے رک گئی۔۔۔۔ "کیوں مسز گروور!" میڈیکل سائنس کی دنیا میں ایسے معجزے نہیں ہوتے کیا۔۔۔۔؟

"ہو بھی سکتے ہیں۔۔۔۔"

مسز گروور کی لاچاری پر اسے ترس آتا ہے۔۔۔۔

وہ جانتی ہے۔۔۔ وقت کم رہ گیا ہے۔۔۔۔ وہ دھیرے دھیرے موت کی طرف

بڑھ رہی ہے۔ موت میں فاصلہ بہت کم رہ گیا ہے۔ بہت سی باتیں، بہت سی کتابیں، اور بہت سی چیزیں ایسی ہیں جنہیں وہ کرنے، پڑھنے اور جاننے کی خواہش مند ہے۔۔۔ وقت کے دریا کا پانی سوکھتا جا رہا ہے۔

پھر اس کا جسم تب نئے عذاب سے گزرتا چلا گیا۔ اشرف اسے لیے لیے پھرتے رہے۔۔۔

اس کونے سے، اس کونے۔ ایک شہر سے دوسرے شہر۔۔۔ آپریشن، ریڈیشن کے مختلف مرحلوں سے اس کا بدن گزرتا رہا۔۔۔ کیموتھراپی سے تھوڑی راحت ملی تھی لیکن مرض پھر بھی نہیں گیا۔۔۔ ریڈیم، بایوپسی، میموگرافی۔۔۔ میڈیکل سائنس کے ہر جبر کو جھیلنے اور سہنے کے لیے وہ شہروں شہروں اڑان بھرتی ہوئی بمبئی آ گئی تھی۔

بمبئی ہاسپٹل۔۔۔ بمبئی دیکھنے کی کتنی خواہش تھی اس کی۔۔۔ مگر وہ ایک کینسر پیشنٹ تھی، اس کی دنیا محض کینسر وارڈ تک محدود تھی، جہاں چیخوں اور کراہوں کو سنتے سنتے اس کے کان پک گئے تھے۔۔۔ ڈاکٹر مریض، سب کے سب اسے کینسر پیشنٹ نظر آنے لگے تھے۔

وہ لہولہان ہوتی رہی۔۔۔ ہوتی رہی۔۔۔ لیکن ایک دن جب برداشت کی قوت ختم ہو گئی تو وہ اشرف کے سامنے پھٹ پڑی۔ "اشرف سنو! یہ لوگ مجھے مار ڈالیں گے۔ میرا جسم ان ڈاکٹروں کے تجربے کے لیے نہیں ہے۔ مجھے واپس وہیں لے چلو ۔۔۔ مسز گروور کے پاس۔۔۔" وہ گڑگڑانے کے لہجے میں بڑبڑائی۔ "یقین مانو اشرف! یہ وہی پرانے تجربے مجھ پر کیے جا رہے ہیں جہاں سے انہیں کامیابی ملنے کی کوئی امید نہیں۔ اگر کامیابی ملنے کی ذرا سی بھی صورت دکھتی تو میں پہلی عورت ہوتی جو اپنے جسم کو ان کے تجربے کے لیے وقف کر دیتی مگر۔۔۔"

وہ دم گھٹ رہے قیدی کی طرح ہانپ رہی تھی۔ یہ مجھے تھکا رہے ہیں۔ مجھے

سب کینسر میں لتھڑے ہوئے نظر آرہے ہیں جن کے گوشت کی جھلیاں پھٹ گئی ہیں اور ناسور باہر جھانک رہے ہیں۔ مجھے گھبراہٹ ہورہی ہے...."

اشرف یخ زدہ لہجے میں بولے۔ "ایلس ڈارلنگ! یہ تمہیں ٹھیک کرنا چاہتے ہیں..."

"نہیں یہ صرف ایکسپریمنٹ کررہے ہیں۔ الٹرا سونو گرافی، فائن نیڈل ایکسپریشن سائیٹولوجی۔ صرف ایک تجربہ گاہ ہے تمہارے ڈاکٹروں کے لیے.... یہ دیکھو...."

اچانک، بہت اچانک.... ایک بیہودہ سا واقعہ پیش آیا۔ اس نے جھٹکے سے اوپری لباس ہٹایا اور سینے کی گولائیوں کو اس کے سامنے عریاں کردیا....

"دیکھو... غور سے دیکھو.... میں ابھی ابھی پورے ہوش و حواس میں ہوں... اور کوئی ناٹک نہیں کررہی ہوں۔ میں کینسر وارڈ کی اس عورت کی طرح یہ نہیں کہوں گی کہ دیدار کرلو اور گواہ رہنا کہ یہ کبھی تھا.... موجود تھا.... دیکھو یہ محض سڑے ہوئے گوشت کا بدبودار، جھولتا ہوا لوتھڑا رہ گیا ہے۔ اندر اندر مواد سے بھرا ہوا ہے۔ کیا تم اس سے محبت کرسکو گے.... اور اسے دیکھ کر محسوس کرکے... مجھ سے...؟"

اس رات ایلس نے چپکے سے ڈاکٹر کی نظر بچاکر ڈائری میں لکھا۔ "زندگی صرف بھلی بھلی ہی اچھی لگتی ہے۔ شاید یہ بات سب کے ساتھ ہے۔ حسین، دلفریب، خوبصورت مناظر اور توبہ شکن پرکشش جسم... اپنی لٹکتی جھولتی، مواد رستی چھاتیوں کو تکتی ہوں تو مجھے نفرت محسوس ہوتی ہے۔ ابھی اس نفرت کو جی سے لگاکر رکھنا چاہتی ہوں ... اس نفرت کے اگنے تک جینے کی خواہش کو برقرار رکھنا چاہتی ہوں۔ اشرف ناامید ہوگئے ہیں۔ مجھے لے کر وہ وطن واپس لوٹ رہے ہیں۔ شاہانہ، مسز گردور اور اپنا گھر... سب مجھے بے صبری سے یاد آرہے ہیں۔ اپنا شہر

اور اپنے گھر کی بات ہی دوسری ہوتی ہے۔۔۔۔"

(۷)

ڈاکٹروں کے مطابق اس کا بریسٹ کینسر اب تھرڈ اسٹیج میں پہنچ گیا ہے۔ یعنی جینے کے چانس کم رہ گئے ہیں۔ امید، دھندلی سی امیدوں پر وہ زندہ نہیں تھی۔ وہ فخر سے کہتی تھی۔ یہ کتابیں۔۔۔ ان کتابوں نے مجھے زندہ رکھا ہے۔۔۔ وہ ذرا بھی خود کو چلنے پھرنے کے قابل محسوس کرتی تو مسز گرودور کے یہاں پہنچ جاتی۔ وہاں وہ جتنی دیر بیٹھتی، آل انڈیا گائنا کالوجی سوسائٹی اور بریسٹ کمیٹی کی رپورٹ کا مطالعہ کرتی پھر مسز گرودور سے جرح کرتی۔۔۔ مسز گرودور ہار کر کہتیں۔ "ایلس، تم میں زندگی بہت ہے۔" پھر ان کی آواز بھاری ہوجاتی۔۔۔۔ "میں تمہارے لیے پریئر کرتی ہوں میری بچی۔۔۔ "مسز گرودور کی آنکھیں نمناک ہوجاتیں۔

وہ دھیرے سے ہنس پڑتی۔ "مسز گرودور میں نے عالیشان مکان میں نہیں، عالیشان کتابوں میں پناہ ڈھونڈی ہے۔۔۔۔ جینا جانتی ہوں مسز گرودور۔۔۔"

لیکن شاید بہت دور تک چلتے چلتے وہ ہانپ گئی تھی۔

(۸)

وہ دن بہت عام سا نہیں تھا۔

اور یہ سچ تھا کہ کئی دن سے مسلسل سوچ کی رہ گزر پر چلتے چلتے وہ ہانپ گئی تھی۔ ایلس کو احساس تھا کہ اب بہت کم وقت رہ گیا ہے۔ مٹھی بھر بھی نہیں، جب اچانک ایک پل میں آنکھیں بند ہوں گی تو پھر نہیں کھلیں گی۔ تب جانے وہ کہاں ہوگی پتہ نہیں، آنکھیں موند جانے کے بعد اس کے پیٹھ پیچھے جو بھی ہو رہا ہے، اس کے دیکھنے کا عمل باقی رہتا ہے یا نہیں۔۔۔ شاید وہ بھی کچھ دیکھنا چاہتی تھی۔ ممکن ہے یہ، کہ اشرف کیسے رہتے ہیں، شاہانہ بیٹی کس طرح زندگی گزارتی ہے۔

وہ ان پر اسراریت کے جنگلوں کو ہوا کی طرح عبور کر جاتی۔ کوئی شے ہے جس نے ابھی تک اسے مضبوطی سے تھام رکھا ہے... آخر وہ شے کیا ہے... کتابیں... نہیں، وہ نہیں مان سکتی۔ یہ کچھ اور بھی ہے... ممکن ہے حقیقت کی تلخی کو وہ اپنی پناہ میں لینے سے خوف کھاتی ہو... مگر نقاہت، چھاتی سے رسنے والے مواد، گوشت کے لوتھڑ، چت کو برے۔ تفتیش کے ہر نئے عمل سے باہر نکل کر وہ صرف یہی سوچ رہی ہے۔ ایلس راتیں اتنی لمبی کیوں ہوتیں ہیں...؟

لیکن تعجب... اس روز رات مختصر ہو گئی اور دن اسے ایک خاص تجربے کے لیے ودیعت کیا ہوا نظر آیا۔

☆☆

اس دن وہ صبح سویرے ہی اٹھ گئی۔ آنکھوں کے آگے سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ اس نے پاس لگے آئینہ میں چہرہ دیکھا۔ خود کو پہچاننا چاہا۔ اپنے بکھرے بکھرے سے بیمار زدہ وجود کو دیکھا۔ پھر جیسے خود سے بڑبڑائی "کیوں، بہت بیمار لگتی ہوں نا، ایلس۔ مرتے وقت لوگوں کو دھوکہ دینا چاہتی ہوں کہ بیمار کہاں تھی... ابھی سب سوئے پڑے ہیں۔ ۸ بجے شاہانہ کی بس آتی ہے... ساڑھے چھ بجے سے پہلے اشرف اور شاہانہ میں سے کوئی بھی نہیں جاگتا... سب سے پہلے اشرف جاگتے تھے۔ گھڑی کا الارم سن کر... پھر شاہانہ کو جگاتے... ٹوسٹ گرم کرتے، آملیٹ بناتے، ٹفن تیار کرتے، کتابیں کھوجتے اور شاہانہ کا ہاتھ پکڑ کر بس تک چھوڑ جاتے۔ اب اس کی جگہ یہ سارا معمول اشرف نے سنبھال لیا تھا۔ اس نے سوچا، آج کا دن خدا نے اسے ودیعت کیا ہے۔ وہ اس دن کا بھرپور استعمال کرے گی۔

کپڑوں کی الماری سے اس نے اپنے لیے ایک نفیس ساڑی کا انتخاب کیا۔ پھر اس سے میچ کرتا ہوا بلاؤز لے کر باتھ روم کی طرف بڑھ گئی... ایک نئے احساس نے

جسم کی نقاہت بھلادی تھی۔۔۔ باتھ روم کا دروازہ بند کر کے اس نے سارے کپڑے ایک ایک کر کے اتار دیئے۔ ایک لمحے کو وہ ٹھہری۔۔ہاں، وہ دبلی ہو گئی ہے۔ یہاں سے۔۔ اور یہاں سے۔۔ ناف کے اوپر کا حصہ اور۔۔یہاں تک۔۔ جانگھوں پر سے جیسے گوشت کی پرت اتر گئی۔۔بس ایک سال میں کشش نام کی دھوکہ باز چڑیا اس سے اپنا رشتہ توڑ کر اڑ گئی۔۔اس نے سوچا۔۔رات کے وقت پہلو بدلتا ہوا اشرف۔۔۔۔"

دھیرے دھیرے جسم پر ہاتھ پھراتے پھراتے وہ ٹھہر گئی۔ آگ اچانک برف کی طرح سرد کیوں ہے؟ ایک بے حس، بیمار زدہ عورت اس میں کروٹ لے رہی تھی۔۔۔۔

"مجھ میں زندگی کیوں نہیں ہے۔۔۔۔؟"

"اپنی حرارت، گرمجوشی میں کہاں بھول آئی ہوں۔۔۔؟"

وہ غسل کر کے اٹھی تو ایک نئی عورت کے ساتھ شادابیوں سے لبریز تھی۔ شابانہ کو دیر تک پیار کرتی رہی۔ اس کو چوما، گالوں کو سہلایا، شابانہ میری بچی۔ میرا پیار۔

شابانہ ایکدم سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ فق ہو رہا تھا۔

"ممی اب میں تمہیں تنگ نہیں کروں گی۔ میں جانتی ہوں، تم بیمار ہو۔"

"پگلی" اس نے پھر پیار سے لپٹایا۔ چہرے پر انگلیوں سے لکیریں بناتی ہوئی بولی۔ "میں بیمار نہیں ہوں۔ دھوپ ہوں بیٹی! آنگن سے دھوپ کیسے اتر جاتی ہے۔ ویسے ایک دن میں بھی کھو جاؤں گی۔ مگر مجھے کھوجنا مت۔۔۔ جو چیز گم ہو جائے اس کا غم مت کرنا۔۔۔۔"

اس روز، وہ سارا دن شابانہ سے کھیلتی رہی۔ اشرف بھی اس دن آفس نہیں گئے۔ سارا دن اسے گھورتے رہے۔۔۔۔ اس دن وہ بہت کم بولے۔ بار بار پلٹ کر اپنی تیز نظریں اس کے چہرے پر گاڑ دیتے تھے۔ سارا دن وہ ایسے ہی گم سم رہے۔

☆☆

رات ہو گئی۔ شابانہ کو سلا کر وہ چپکے سے اپنے کمرے میں آ گئی۔ اشرف سگریٹ پی رہے تھے۔ اس نے سگریٹ اس کے ہاتھوں سے چھین لیا۔۔۔ پھر ایش ٹرے میں آگے بڑھ کر سگریٹ بجھا دی ۔۔۔۔ پھر دھیرے ہنسی۔۔۔۔

"سنو، میں کیسی لگ رہی ہوں۔۔۔؟"

سارا دن چپ رہنے کے بعد اشرف تیز آواز میں بولے "ایلس مجھے جینے دو ایلس۔۔۔" وہ کانپتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔

"میں کب جینے نہیں دے رہی ہوں۔" پیار سے ہاتھ پکڑ کر اس نے اپنی طرف کھینچا۔۔۔ "جینے پر سب کا اپنا حق ہوتا ہے، اشرف۔۔۔ جینے کا حق میں کہاں چھین رہی ہوں۔"

"پھر یہ الجھی الجھی باتیں کیوں کر رہی ہو۔۔۔ آج جو دن بھر کرتی رہیں، وہ سب کیا تھا؟"

"مجھے لگا، بس آج کا ہی دن ملا ہے مجھے۔" وہ کھلکھلائی۔۔۔ "ایک پورا دن۔۔۔ ہزاروں لاکھوں سیکنڈ۔۔۔ کئی کئی گھنٹے۔۔۔" وہ گرم ہوا کے تھپیڑے کی طرح گزر گئے۔۔۔ "میں گم ہو رہی ہوں اشرف!"

اس نے کپکپا دینے والی سانسوں کی ہلچل سنی۔

"سنو، تم مجھے یاد نہیں کرو گے۔"

وہ پلٹ کر بولی۔ "ایک چیز جو نہیں ہے، اسے یاد کرنے اور جذباتی ہونے سے کیا حاصل؟" وہ رک رک کر سانس لے رہی تھی۔ "میرے پاس شاید بہت کم وقت ہے۔ میں آج کی رات کو یادگار بنانا چاہتی ہوں۔ یاد کرو ایک سال سے تم نے مجھے چھوا نہیں۔۔۔ چھونے کی کبھی خواہش نہیں ہوئی نا۔۔۔" وہ ہنسی۔ "چھونے سے پہلے ایک ڈرپوک مرد تم میں جاگتا ہو گا جسے مجھے چھونے سے گھن آتی ہو گی۔"

اشرف نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

اس نے حکم صادر کرتے ہوئے کہا۔ "چلو، کپڑے اتارو، میری بیماری سے مت ڈرو۔ تم گھبرا رہے ہو۔۔۔ نہیں میں سڑ نہیں گئی ہوں۔ تمہارا ساتھ دے سکتی ہوں۔ اتنا ول پاور بچا ہے میرے پاس۔"

وہ خود ہی آگے بڑھی۔ اشرف کے کپڑوں کے بٹن میں اس کی انگلیاں الجھ گئیں۔ ایک سڑسڑاہٹ ہوئی، ایک سنسنی سی اندر تیر گئی۔

وہ آہستہ آہستہ اس پر نچھنے لگی۔ ہاں، پہلے مجھے لگتا تھا کہ تمہارے ہاتھ خوبصورت نہیں ہیں۔ تمہارے یہاں سے.... یہاں تک کا حصہ، وہ سینے پر انگلیوں سے شگاف ڈال رہی تھی۔۔۔ بدصورت ہے.... دیکھو نا، کتنی مدت بعد تمہارے اس گلستاں کی سیر کر رہی ہوں۔ میں غلط تھی اشرف۔ تمہارے بدن میں کسی حسین عورت کے خطوط کی طرح گداز اور پیچ موجود ہیں۔"

وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ اشرف نے بوکھلا کر سانپ کی طرح سرسراتے اس کے ہاتھوں کو دیکھا وہ سرکا، پیچھے ہٹا۔ "نہیں۔۔۔ خدا کے واسطے۔۔۔ نہیں ایلس"

"بس اپنی موجودگی کی گواہ رہنے تک۔" اس نے انگلیوں کا رقص بدستور جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "آج تم وہی کروگے جو میں چاہوں گی۔ اس کے بعد نہ میں چاہوں گی اور نہ اس کے لیے موجود رہوں گی۔ ہاں تم ہوگے۔ تمہاری دنیا ہوگی۔ اور تم اپنی ضرورتوں کے لیے آسمان میں سیر کرتی چڑیوں کی طرح آزاد ہوگے۔ چلو مجھے سیراب کرو۔۔۔"

پھر وہ کسی ناگن کی طرح لہرائی، سمندر کی طرح گرجی اور کسی سیلاب زدہ ندی کی طرح بہتی چلی گئی۔

(۹)

قارئین! اس کے بعد کہانی بہت کم بچی ہے۔

ایلس مر گئی۔ شاید اسے اپنے مرنے کا علم ہوگیا تھا۔ اس رات کے بعد ایک رات اس کی زندگی میں اور آئی۔۔۔ مگر وہ بے لذت اور بستر مرگ پر کروٹیں بدلتے ہوئے مریض کی آخری شب کی طرح ہولناک اور اذیت ناک تھی۔۔۔ پھر ایلس ہمیشہ کے لیے بادلوں میں کھو گئی۔ "اس شب مرنے سے پہلے کچھ لمحے کی مہلت نکال کر وہ اپنی خواب گاہ کی میز پر کچھ لکھ رہی تھی۔۔۔۔

"میں موت کو دیکھنا چاہتی تھی ... اس لیے اس کے بارے میں دسیوں طرح کے پراسرار تصور آنکھوں میں سجائے تھے۔۔۔۔ میں جینے کی طرح جیئی اور مرنے کی طرح مر گئی۔ میں اپنی سانس سانس کو بٹور کر اس میں زندگی رکھ کر جینا چاہتی تھی۔۔۔ مرنے سے پہلے میں تشنہ نہیں رہنا چاہتی تھی۔۔۔ مجھے خوشی ہے۔ میں تشنہ نہیں رہی۔ میں نے شابانہ کو کبھی بے بس اور لاچار نہیں سمجھا۔۔ اس لیے کبھی اسے اپدیش نہیں دیا۔ کسی کے چلے جانے سے کوئی بدنصیب نہیں ہوجاتا۔۔۔ (کاٹی ہوئی لائن)۔۔۔ زندگی جس کے پاس ہے۔۔۔ (پھر کاٹی ہوئی)۔۔۔۔ اس میں اس کے ہونے کا احساس ہی اس نیا کو پار لگا سکتا ہے۔ اشرف پر بھی ترس نہیں آیا۔ میں جانتی ہوں۔ (حرف موٹے ہوگئے ہیں) اپنی سب طرح کی ضرورتوں کے لیے خواہ وہ مرد ہو یا عورت، غلام نہیں ہے۔۔۔ وہ اس ضرورت کو کسی نہ کسی طرح پورا کر لے گا۔۔۔۔ میں دونوں کی طرف سے مطمئن ہوں۔ دونوں کے سامنے زندگی کے دھارے کھلے ہیں تاوقتیکہ موت نہ آجائے۔۔۔ ایک انجانے سفر پر نکلتے ہوئے اپنے تجسس کو زندہ رکھنا چاہتی ہوں میں۔ یا یوں کہیں کہ میں چاہتی ہوں۔۔۔ (کچھ سطر کاٹی ہوئی) پتہ نہیں انجانے سفر میں انسان کو کیسا لگتا ہو گا اور یہی چیز مجھے مطمئن کر رہی ہے۔"

اس کے بعد حروف ترچھے ہوگئے۔ جیسے لکھتے لکھتے قلم کی نب ٹوٹ گئی ہو۔۔۔ یا ہاتھ کانپنے لگے ہوں۔ ایک چھوٹی سی لکیر کے ساتھ ہی عبارت ختم ہو گئی تھی۔

○○

آگے چلتے چلتے اچانک /

پلٹ کر پیچھے دیکھنا

یہ کچھ نہیں ہے /

صرف اپنے آپ کو محسوس کرنا..........زندہ

اور پیچھے / چھوٹ جانے والے نشانات سے...... سبق سیکھنا

○

کچھ پرانی کہانیاں

(۱۹۸۰ء سے ۱۹۹۰ء)

اپنی کہانی

میں نے بے چارگی سے اس کی طرف دیکھا۔ آؤ نا؟
وہ مسکرا کر دور ہٹ گئی ..... جاؤ ..... نہیں آتی .....

آؤ نا ....

نہیں آتی ......

میں جتنا اس کے پیچھے بھاگتا، وہ اتنا آگے بھاگ کھڑی ہوتی ..... یہ سب کیا ہے میں اب ترس کھانے والے لہجے میں اس سے گویا تھا۔
سنو، تم مجھے لکھنا چاہتے ہو..... وہ پھر مسکرا رہی تھی۔

ہاں ..... ہاں .....
مجھے!

ہاں۔ بھائی۔ ہاں .....

کوئی ویسی کہانی جس سے تمہارے اندر کے کمیونسٹ کو سکون مل سکے۔ وہ ہنس رہی تھی..... تمہارے اندر کے کمیونسٹ کو؟ کیوں؟ بدھو..... کمیونزم اب کہیں نہیں ہے۔ پوری دنیا میں کہیں نہیں ہے۔ اب روس کو ہی لو ..... گوربا

چوف نئی ہوا کے امام بن گئے..... کیوں گلاسنوست، پیرسترئیکا؟ لینن اور کارل مارکس کے بت ڈھادیے گئے میاں ..... چلو جاؤ میں نہیں آتی....

وہ پھر قہقہہ لگا رہی تھی .....

سنو۔ مجھے غصہ آگیا۔ پاگلوں جیسی بات مت کرو۔ کمیونزم کوئی۔ تمہاری دنیا میں رہنے والے انسانوں کا مذہب نہیں ہے.....

وہ پھر مسکرائی۔ اسی لیے تمام کمیونسٹ ملکوں میں دراڑ پڑ گئی ہے۔

بکو مت۔ مجھے پھر غصہ آگیا..... کوئی اگر کسی عقیدے کو چوٹ پہونچانے کی کوشش کرے تو اس سے عقیدہ زخمی نہیں ہوتا۔

تمہارے کمیونزم کی قبر کھد گئی میاں....

وہ لگاتار ہنسے جا رہی تھی.....

دیکھو، نہیں آنا ہے تو مت آؤ ..... لیکن اس طرح میرا مذاق نہیں اڑاؤ... مجھے سمجھنے کوشش کرو۔ مجھے کچھ چاہیے۔ میرا مطلب ہے.... جسے لکھتے ہوئے مزہ آجائے۔ اور پڑھنے والے .... بس دل تھام لیں.....

یعنی نیا زاویہ چاہیے..... اور وہی غریبی ہو۔ گھٹن ہو ..... جس میں رومانٹسزم کے تمام پہلو ہوں ..... جسے پڑھنے میں ہمیشہ سے لوگوں کی دل چسپی رہی ہے..... کیوں ؟ مزہ آتا ہے نا، ننگا پا دکھاتے ہوئے۔ میاں، وقت بدل چکا ہے......

وہ ہنس رہی تھی۔

وقت نہیں بدلا ہے....

بدل چکا ہے .....

میں نہیں مانتا ..... بدلتا تو میں بھی بدل چکا ہوتا.... میں تو اب تک وہی ہوں ...... میں نے ایک سرد سانس چھوڑی ..... جہاں پہلے تھا، وہیں اب بھی۔ دنیا گول ہے۔ وہی قلم ہے کاغذ ہے۔ روز روز کی تھکن ہے۔ پریشانی ہے۔ ایک غیر

یقینی زندگی ہے۔ بے سکونی ہے، کیوں! کچھ نہیں بدلا......

بدل چکا ہے۔ وہ ہنسی۔ تم لکھنا چاہتے ہونا....

ہاں......

تو تھری وہیلر والوں پر لکھو

گڈ آئیڈیا.....

خاک گڈ آئیڈیا....، وہ زور سے ہنسی۔ یہ کس کے مکان میں آج کل تم رہ رہے ہو۔ یہ بڑا سا تین منزلہ مکان..... تم نے صرف ایک منزل کرائے پر لی ہے۔ یہ مکان کس کا ہے؟ سچ تو یہ ہے کہ تم ان پر لکھ ہی نہیں سکتے۔ لکھو گے تو لوگ بیوقوف سمجھ کر تمہارا مذاق اڑائیں گے۔ اسٹوپڈ، پاگل.... گدھا.... کچھ بھی کہہ دیں گے .... جانتے ہو کیوں..... اس لیے کہ جانتے ہوئے بھی جو بات ان کے دل میں بس چکی ہے، وہ اس سے باہر نہیں نکل سکتے.... یعنی تم لکھو گے تو لوگ ہنسیں گے۔ اور تم ....اور تم قلم کو اسی محور پر گھمائے جا رہے ہو۔ دیکھتے کیا ہو۔ آنکھیں کھولو۔ یہ مکان جہاں تم رہتے ہو، ایک تھری وہیلر والے کا ہے.... آسائش کے جتنے سامان اس کے پاس ہیں۔ کیا تمہارے پاس ہیں۔ یا تم سوچ سکتے ہو؟

نہیں .....

وہ زور سے ہنسی۔ لیکن پھر بھی تم اس تھری وہیلر والے کی کہانی نہیں لکھ سکتے، تمہیں کہانی کے لیے ایک بے چارہ غربت کا مارا تھری وہیلر والا چاہیے..... پیسے پیسے کا محتاج دم توڑتی بیوی.... جھگی والا مکان اور ...... وقت بدل چکا ہے میاں......

وہ پھر کھلکھلائی......

میں سکتے میں آگیا......

سنو.... اس ریوڑی والے کی کہانی لکھو گے جو تمہارے گھر کے نیچے خوانچہ لگاتا ہے اور روز آتے جاتے تمہیں سلام مارتا ہے۔

ہاں۔۔۔ ہاں۔۔ کیوں نہیں۔

مورکھ۔ اس نے عجیب آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔۔۔۔۔۔۔ وہ اپنے لڑکے کو باہر پڑھنے کے لیے بھیجنے والا ہے۔۔۔۔ اور اس کے پاس بھی۔۔۔۔۔۔

دیکھو۔۔۔۔ تم مجھے پاگل بنا رہی ہو۔۔۔۔۔

خیر چھوڑو۔ پاگل تو صحیح معنوں میں اب تم ہو گے۔۔۔۔ وہ رگھوا جو روز تمہارے گھر کی گندگی صاف کرنے آتا ہے۔ اس کی کہانی۔۔۔۔

ہاں۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔

اس نے مذاق اڑایا۔ تم کبھی اس کے گھر گئے ہو۔ وہ آج کل اپنا مکان بنوا رہا ہے۔۔۔۔۔ وہ ہنسی۔۔۔۔۔ وہ، اس کا بیٹا، اس کی بہو، اس کی لڑکی سب کمائی کرتے ہیں۔ اور تم۔۔۔۔۔۔ اس نے کھلی اڑائی۔۔۔۔۔ تم سے ہر معاملے میں بہتر ہے وہ۔۔۔۔۔ سوائے تمہارے کپڑوں اور اوپری دکھاوے کے۔

وہ مسلسل ہنسے جا رہی تھی۔۔۔۔ کچھ اور سناؤں۔۔۔۔۔ کس کس کے بارے میں تم جاننا چاہتے ہو۔۔۔۔۔ یہ تمہارے آس پاس بسنے والے لوگ۔۔۔۔۔ جسے تم اپنے لکھنے کا موضوع بنانا چاہتے ہو۔۔۔۔ اور ایک تنگ کوٹھری میں بیٹھ کر کہانیاں گڑھتے ہو۔۔۔۔ فرضی۔ کالپنک۔۔۔۔ میاں زمانہ بدل چکا ہے۔ ہاں تم وہی ہو۔۔۔۔۔ وہیں پرانی جگہ۔۔۔۔۔ اور جب تک آنکھیں کھول کر غور سے اس پورے ماحول کا جائزہ نہیں لوگے۔ تم وہیں رہو گے۔ اس بار وہ ہنسی نہیں سنجیدہ ہو گئی۔۔۔۔ سنو تمہیں لکھنا ہے نا، تو دوسروں کا چکر چھوڑو۔ اپنے پر لکھو۔ اس لیے کہ اب ایک تم ہی رہ گئے ہو جس پر لکھنے کی ضرورت ہے۔۔۔۔

کہانی ہنسی اور غائب ہو گئی۔

○○

بچھونا

منگرو کو یقین نہیں آرہا تھا کہ کوئی اس کا بچھونا بھی چوری کر سکتا ہے۔
سردی سے ٹھٹھرتی ہوئی رات ... کھلا بس اسٹاپ... چاروں طرف سے آتی ٹھنڈ کی لہریں گوشت پوست کی عمارت کو چھیدتی ہوئی نکل جاتیں۔ اور اب بڈی کے ڈھانچے میں گوشت تھا ہی کتنا۔

اس نے ایک بار پھر جھانک کر اسٹاپ کے پتھر والے بینچ کے نیچے دیکھا۔ جہاں سے پورے دس سال میں کسی نے اس کے بستر ے کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ ہاں، دو ... ایک بار بس اسٹاپ کی مرمت کے ہی دوران اس کا بچھونا ادھر ادھر ضرور ہوا تھا۔ لیکن چوری کبھی نہیں ہوا تھا۔ ہاں مرمت کے ہی دوران ایک بار مزدوروں نے پیشاب گھر کے قریب اس کا بچھونا پھینک دیا تھا۔ لیکن وہ گرمی کا موسم تھا۔ وہ رات گئے لوٹا، بچھونے کو بدبو دیتی دیوار سے اٹھا کر دیر تک پھینکنے والوں پر گالیوں کی بارش کرتا رہا۔ لیکن ان گالیوں کو سننے کے لیے تھا ہی کون... پتھر والے بینچ کے پاس رام آسرے سوتا تھا۔ بڈھا۔

اس کی چیخ سن کر بڈھے نے ناگواری سے کہا تھا۔ سو جا...

کیوں۔ سو جا....؟

کوئی پھائدہ ہو تو چلا۔ گلا پھاڑ پھاڑ کر...

بڈھے کے سارے جسم میں چلڑ پڑ گئی تھی۔ سارا دن بس اسٹاپ کے سائے میں وہ بدن کھجاتے اور نوچتے ہوئے گزارتا۔ بھلا ایسے کاہل لوگوں کو کون بھیک دیتا ہے۔ جب تک جیا، بدن کے چلڑ کو نوچتے نکالتے جیا۔ کم بخت۔۔۔ پھر ایک دن میونسپلٹی والے اس کی لاش لے گئے۔۔۔ تب سے کتنے ہی لوگ آئے، گئے لیکن اس کی جگہ، اس کا بچھونا محفوظ رہا۔۔۔ بچھونے میں تھا ہی کیا۔ دو بڑے سائز کے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے بورے، ایک۔۔۔۔ خالی ٹن، اور۔۔۔ ایک کمبل۔۔۔ اور ایک اسی چلڑ والے بڈھے رام آسرے کی اکلوتی رضائی، جو اس کے مرنے کے بعد اس کے قبضے میں آ گئی تھی۔ بس یہی کل سامان تھا۔ صبح، بھور ہوتے ہی وہ اپنی کل جائیداد رسی سے باندھ کر بینچ کے نیچے ٹھونس دیتا۔ پھر۔۔۔ رہے نام اللہ کا۔۔۔ نکل جاتا۔ بستی بستی۔۔۔ آخر دھندے کے لیے ہاتھ پاؤں تو چلانا ہی پڑتے ہیں۔۔۔۔۔!

منگرو کو پھر بھی یقین نہیں آرہا تھا۔ بینچ کے نیچے کی خالی جگہ کو بار بار اس نے ہاتھ پھیر کر دیکھا۔۔۔ ہنہ جائے گا کہاں۔۔۔ ادھر ہی ہوگا۔۔۔ بس اسٹاپ کی مرمت بھی نہیں ہوئی تھی کہ سامان کے ادھر ادھر ہو جانے کا خدشہ ہو۔ سڑک کے اس پار پیشاب، ٹٹی کرنے والی ساری جگہوں پر وہ دیکھ آیا تھا۔ اب ٹھنڈک اس کے پور پور میں اترنے لگی تھی۔

بچھونا نہیں ملا تو۔۔۔؟

اتنی رات گئے، ٹھنڈ میں کون اسے اپنا بچھونا دے گا۔ سونے کے لیے۔۔۔؟

اس نے کنارے، ٹھیلے پر لیٹے سوامی کو دیکھا، جو گھوڑے بیچ کر سو رہا تھا۔ چھلکا اماں بھی گدڑی میں منہ دیئے رام ہو گئی تھیں۔ اسے سب پر غصہ آرہا تھا۔ چھلکا اماں بھی یہاں تین سال سے تھیں۔ پہلے کہاں تھیں، اسے نہیں معلوم۔۔۔ یوں بھی اماں صاف صاف بولتی نہیں تھیں۔ مرنے ہی کے دن تھے۔ جو بولتی تھیں، سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ ہاں چھلکے کھانے کا بے حد شوق تھا۔ جب تب ادھر ادھر سے اٹھا کر، چھلکے بٹور کر لے آتیں۔ خاص کر خربوزے، تربوزے اور کیلے کے چھلکے تو بے حد شوق سے

کھاتیں۔

اسے غصہ آ گیا۔ کم بخت سو گئی۔ سوامی بھی سو گیا۔ اس کے بچھونے کی کسی کو فکر نہیں۔ چھلکا اماں تو گدڑی میں منہ دیئے ایسے سوتی ہیں کہ مردہ بہتر۔۔۔ چھلکا اماں کے دوسری طرف رنگروٹ سوتا ہے۔ مکار۔۔۔۔۔ ایک نمبر کا دغا باز۔۔۔۔ لیکن ایک فائدہ ہے، رنگروٹ سے۔ دس سال پہلے جب وہ اس جگہ آیا تھا تو یہاں سونے کی جگہ نہیں رہتی تھی۔ لیکن رنگروٹ کا چھرا بہت کام کا ہے۔ چھرا دکھا کر کام چلائے گا اپنا۔۔۔ بول سوئے گا یہاں سالے۔۔۔ سارے سنسار میں یہیں جگہ ملی ہے۔۔۔۔۔ ہنس کر بتاتا ہے اسے۔۔۔ جتنی مرضی پیر پھیلا کر سوؤ۔۔۔ جب تک رنگروٹ ہے۔ سونے میں کوئی تکلیف نہیں۔

رنگروٹ کا گلا کھڑ کھڑ کر رہا تھا۔

اس کے جی میں آیا، آگے بڑھ کر وہ سوامی، رنگروٹ، چھلکا اماں سب کو جگا دے۔ سوامی کو تو اس کے بچھونے کے بارے میں سب کچھ معلوم ہوگا۔ وہ ان کے بستروں میں ہی رات بھر کے لیے جگہ مانگ لے۔ تھوڑی سی جگہ۔ بس وہ ایسے ہی ایک کروٹ سے گزارہ کر لے گا۔۔۔۔ دوسرے دن دیکھا جائے گا۔

اماں۔۔۔۔ او چھلکا اماں۔

آگے بڑھ کر اس نے چھلکا اماں کو ہلایا، ڈلایا۔ گدڑی بدن سے ہٹانے کی کوشش کی مگر کاہے کو۔۔۔ موئی مردے سے بدتر۔۔۔ لاش کی طرح بھاری۔۔۔

چھلکا اماں۔۔۔ چھلکا اماں۔۔۔

اندھیرے میں اسے لگا، اس کی آواز کچھ زیادہ ہی زور سے پھیلتی جا رہی ہے۔ اسے ڈر لگتا تھا تو صرف رنگروٹ سے۔ کم بخت کی نیند اڑ گئی تو پھر چھرا نکال دے گا۔ یوں بھی رنگروٹ جب موج میں ہوتا تو بتایا کرتا کہ ہتیا کرنا، اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اب تک دس خون کر چکا ہے وہ۔

اماں۔۔۔۔ اماں۔۔۔

ڈرتے سہمتے اس نے اماں کی منت سماجت کر کے دیکھ لیا۔ سب بے سود۔۔۔ اماں گڑے مردے کی طرح گھوڑے بیچ کر سو رہی تھیں۔

ٹھنڈک بڑھتی جا رہی تھی۔

ارے سوامی۔۔۔۔ اٹھ۔۔۔ اٹھ نا سوامی۔

ٹھیلے پر کے سوامی کو بھی اس نے ہلکے سے جھنجھوڑا۔۔۔ ارے اٹھ نا۔ اٹھ نا۔ مائی باپ، دیکھ نا برا وقت آیا ہے مجھ پر۔۔۔ اٹھ نا۔

دن بھر ٹھیلہ ادھر ادھر لیے پھرنے کے بعد سوامی تھک جاتا تھا۔ پھر یہیں آرام کرتا تھا۔ ٹھیلہ پر ردی اکٹھا کرتا تھا۔ کہتا تھا پیسہ جمع کر رہا ہے۔ گھر جانے کے لیے۔ گھر کے نام پر ایک عجیب سی جوت اس کی آنکھوں میں جل اٹھتی۔

اٹھ، نا رے سوامی

سوامی نے کروٹ لی۔ پھر لگا، دھیرے سے سوامی نے آنکھیں کھول دیں۔ پلکیں جھپکائیں اور غور سے اس کی طرف دیکھا۔ حقارت سے نفرت سے۔۔۔

کیا ہے۔۔۔۔؟

"بچھونا۔۔۔۔"

"سو جا۔۔۔ رات کافی ہو گئی۔"

منگرو کے جی میں آیا۔ زور زور سے رونے لگے۔

سوامی بھائی۔ اس نے پھر پینترا بدلا۔

سوامی نے اس بار ذرا آواز اونچی کر کے پوچھا۔

"کیا ہے؟"

"میرا بچھونا کسی نے غائب کر دیا۔"

بچھونا؟

ہاں۔۔۔ نہیں ہے۔

کیوں۔۔۔ کہاں رکھا تھا۔

سوامی جھٹ سے اٹھ کر ٹھیلے پر بیٹھ گیا۔

"یہیں... دس سال سے یہیں تو تھا۔ آج نہیں ہے"۔

"اوہ... کہاں گیا۔"

"ٹھنڈ کافی پڑ رہی ہے سوامی بھائی۔"

"ہاں۔ پڑ تو رہی ہے۔ لیکن تو کرے گا کیا۔ سن، بوری سلگالے۔ رات میں بچے ہی کتنے گھنٹے ہیں۔ کاٹ لے۔"

سوتے سوتے سوامی نے پھر اسے آواز لگائی۔ سن۔ وہاں میری ردی پڑی ہے۔ اسے مت جلانا سالے۔ سمجھا۔ اب سوجا۔ دماغ مت چاٹ ....

خر.... خر....

سوامی کا گلا پھر بولنے لگا تھا۔

اسے لگا، اس کے بچھونے کا غائب ہونا ان کے لیے کوئی حادثہ ہی نہیں ہے۔ سب کیسے مزے میں سو رہے ہیں۔ اب بچا ہے رنگروٹ۔ بات بات پر چھرا نکالنے والا.... لیکن۔

ٹھنڈ بڑھتی جا رہی تھی۔

رنگروٹ کے خراٹے بج رہے تھے۔

رنگروٹ بھائی....

دھیرے سے، ونتی کرنے کے لہجہ میں، اس نے رنگروٹ کو کندھے سے پکڑ کر ہلایا۔ خلاف توقع رنگروٹ نے آنکھیں کھول دیں۔ آنکھیں کھول کر غور سے اس کے بدن پر جھولتے اکھرے کرتے، پھٹے سوئیٹر، اور آدھے تہمد کو کچھ دیر دیکھا۔ پھر بولا...

کیا ہے؟

میرا.... میرا بچھونا کسی نے غائب کر دیا۔ رنگروٹ بھائی۔

کیا؟

رنگروٹ بچھونا ایک طرف کرکے بیٹھ گیا۔ دیکھ... ٹھیک سے دیکھ۔ بچھونا کون لے جائے گا۔

ہاں رنگروٹ بھائی۔ سب جگہ دیکھ لیا۔ سڑک کے پار.... ادھر ادھر...

موت والی جگہ؟

وہاں بھی.....

کمال ہے.....

رنگروٹ کے چہرے پر ایک لمحے کو فکر کی لکیریں پھیلیں۔ پھر اس نے قہقہہ لگایا۔

بڈھے.....اب کرے گا کیا بڈھے۔

مجھے تھوڑی سی جگہ دے دو نا... اپنے بچھونے میں۔

رنگروٹ ہنسا... پگلا گیا ہے۔ یہاں تو یہ بچھونا ہی پورا نہیں پڑتا۔ اوپر سے تو بھی جگہ گھیر لے گا۔ رنگروٹ تھوڑا فکر مند ہوا۔ ہماری تو ساری کمائی بچھونا ہوتی ہے۔ ارے.. کیا؟ کہ بچھونا نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ زندگی بھر سالا ہم کماتے ہیں کیا۔ یہی بچھونا۔ اس نے بچھونے کو ہاتھ سے چھوتے ہوئے کہا: یہی بس... یہی ملکیت ہوتی ہے ہماری... تیری ملکیت گم ہو گئی ہے۔

ملکیت.....اسے رنگروٹ کی بات اچھی لگی۔

ایک بات سن۔ جاکر پولیس میں رپورٹ لکھوادے۔

رپورٹ؟ اسے ہنسی آگئی۔ بھلا میری رپورٹ کون لکھے گا؟

کیوں نہیں لکھے گا۔ رنگروٹ کے چہرے کا رنگ بدلا۔ وہ بچھونا تیری زندگی بھر کی کمائی تھا یا نہیں۔؟ پھر وہ کمائی لٹ گئی تو؟... یہ بڑے لوگ کرتے کیا ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر پولیس میں رپورٹ... لیکن تیرے معاملے میں ایک خطرہ ہے۔

رنگروٹ کو جیسے کچھ یاد آگیا۔

"کیا خطرہ؟"

پولیس والے پوچھ سکتے ہیں کہ آخر تیرے بچھونے میں تھا کیا۔ جو تو اتا پریشان کررہا ہے؟

"میں بتادوں گا۔ منگرو جھٹ سے بولا۔ دو بورے۔ ایک رضائی۔ ایک کمبل اور...."

رنگروٹ نے قہقہ لگایا۔ "واہ رے بڑھے میاں۔ اور وہ مان جائیں گے۔ ارے پولیس والا کہے گا، اتنے سے سامان کے لیے تو کبھی بے چین نہیں ہوسکتا۔ ضرور تو بھیک کی آڑ میں چرس، گانجہ، اسمیک بیچتا ہوگا۔ آج کل سارے بھیک منگے یہی کرتے ہیں۔"

"اچھا.... منگرو کی آنکھیں پھیل گئیں۔ لیکن میرے لیے تو سب کچھ میرا بچھونا تھا۔ اب رات کیسے گزاروں گا۔؟"

منگرو نے سوچا، بچھونا نہیں ملا تو۔ پل پل بڑھتی ہوئی ٹھنڈ.... سرد لہر، بدن کی کمزور عمارت کو ہلاتی ہوئی اندر تک بھونچال اٹھانے والی ہوا۔ اور آدھی رات... اس نے رنگروٹ کو دیکھا، جو چند بے معنی ادھر ادھر کی گپوں کے بعد اپنے بچھونے میں جا گھسا تھا۔ وہ اسٹاپ کے باہر آیا۔ سڑک سنسان تھی۔ ادھر ادھر فٹ پاتھ پر کئی غریب بدن اپنے اپنے بچھونے میں سوئے پڑے تھے۔ ایک وہ ہے جس کا بچھونا چھن گیا۔

سڑک پر دو چار قدم چلنے کے بعد اس نے دیکھا۔ ایک پولیس جیپ آرہی ہے۔ منگرو کو ایک ہلکی سی امید نظر آئی۔ وہ پوری قوت لگا کر چیخا۔

سنو صاحب

جیپ کچھ تیز ہوئی۔

وہ جان لگا کر دوڑا۔ سنو صاحب۔ رک جاؤ صاحب...

جیپ دھیرے ہوئی۔ پھر جیپ رک گئی۔ جیپ سے اتر کر ایک وردی والے

نے اسے گھور کر دیکھا۔

کون.....؟

ہانپتا، لڑکھڑاتا ہوا وہ پاس آکر ڈول گیا... میں.....میں....صاحب....

"اتنی رات گئے... جیب کیوں رکوائی..." انسپکٹر کی آنکھوں میں غصہ تھا۔

"صاحب.... اسے لگا، اندر کی ساری ٹھنڈ کو باہر نکال کر وہ ہلکا ہو گیا ہے.... صاحب.... کسی نے میرا بچھونا غائب کر دیا زندگی میں کچھ نہیں کمایا صاحب۔ جو کمایا وہ یہی بچھونا تھا۔ جسے اپنا کہہ سکوں۔ وہ یہی بچھونا تھا صاحب... باقی اپنا کچھ نہیں... دن بھی نہیں صاحب... رات بھی نہیں... بس بچھونا تھا صاحب... ساری زندگی بھر کی کمائی۔"

"تو تمہارا بچھونا غائب ہو گیا"۔ انسپکٹر کی آنکھوں میں شک تھا۔ وہ پاس کھڑے آدمی سے بولا۔

"چلو... آج اسے لاک اپ میں بند کر دو۔ وہاں اسے بچھونا بھی دے دینا۔

اس رات اسے بچھونا مل گیا۔

وہ رات اس نے لاک اپ میں گزاری۔ دوسری رات اس نے ریلوے کراسنگ کے پاس گزاری۔ بچپن سے ایک بات سنتا آیا تھا، جو ہوتا ہے اچھا ہوتا ہے۔ اچھے کے لیے ہوتا ہے۔ یہ کہاوت اسے چوتھے دن سمجھ میں آئی۔

رات ہو گئی۔ ریلوے اسٹیشن پر اس نے اپنا شکار ڈھونڈ لیا تھا۔ سب سو رہے تھے۔ کبھی کبھی کوئی ٹرین پاس سے گزرتی تو انجن کے چیخنے کی آواز سے بدن میں گرمی بھر جاتی۔ وہ دھیرے دھیرے اپنے شکار کی طرف بڑھا... اس کے بدن پر نیا کمبل تھا۔ ادھر ادھر دیکھ کر پہلے اس نے اپنا دھڑ اندر کیا۔ اندر سو رہے آدمی کے بدن میں حرکت ہوئی۔ اس نے اوں آں کر کے کروٹ لینا چاہی پھر اس کی آنکھ کھل گئی۔ گھبرا کر اس نے منگرو کی طرف دیکھا۔

سونے دے...... منگرو کی آواز میں تلوار سی دھار تھی۔

دبلے پتلے آدمی کے چہرے پر گھبراہٹ تھی۔

"یہ کمبل کہاں سے لیا.....؟"

"جی.....؟"

"کہاں سے لیا؟"

وہ بانٹنے...... آئے تھے۔

"بانٹنے..... منگرو کو شک ہوا۔ دس سال میں تو اسے کمبل بانٹنے کوئی نہیں آیا۔"

"تو کرتا کیا ہے؟"

"مزدوری۔ ڈیم بن رہا ہے نا..."

"اکیلا؟"

"ہاں...."

وہ دھیرے سے پھسپھسایا۔ "دیکھ۔ میں اچھا آدمی نہیں ہوں۔ کئی خون کر چکا ہوں۔"

"جی...."

"مجھے یہ کمبل چاہیے۔"

"جی...."

"دیکھ۔ ہلا کرے گا تو میری جیب میں چاقو ہے۔ اب چپ چاپ سو جا۔ صبح سے کمبل میرا۔"

لیکن صبح ہونے سے پہلے ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ دیکھا تو مزدور نہیں تھا۔ بیچارہ... اسے افسوس تو ہوا۔ لیکن خوشی بھی ہوئی۔ کمزور تو سدا سے مارا جاتا رہا ہے۔ پھر لوگ کمزور ہوتے ہی کیوں ہیں۔ وہ بھی تو اب تک..... جو ہوتا ہے اچھے کے لیے ہوتا ہے۔ مزدور بیچارہ لگتا ہے رات کے کسی پہر ہی خوفزدہ ہو کر بھاگ گیا۔

منگرو کو لگا، دس سال اس نے بیکار میں گزار دیئے۔ یہ نیا کمبل۔۔۔ پورے دس سال موت جیسے گندے بدبو دار بچھونے میں گزارا کیا اس نے۔

بھور ہونے سے پہلے ہی وہ کمبل لے کر پرانے والے بس اسٹاپ کی طرف چل پڑا۔

سوامی ٹھیلہ لے کر جاچکا تھا۔

رنگروٹ اب تک سویا ہوا تھا۔ چھلکا اماں کا آدھا چہرہ بوریئے سے جھانک رہا تھا۔ اسے لگا اسے کچھ اور چاہیے۔ یہ کچھ چاہیے کی طلب پہلے پیدا ہوتی تو اب تک بہت کچھ بدل چکا ہوتا۔ اور جب کچھ بدلتا ہے تب ہی ایک کے بعد دوسرے کی طلب پیدا ہوتی ہے۔ اسے لگا، اسے یہ جگہ بدل دینی چاہیے۔ یہ کمبل اب اس کی ملکیت ہے۔ لیکن یہ ملکیت کوئی دوبارہ بھی چرا کر لے جاسکتا ہے۔ دس سال میں کچھ بھی نہیں بدلا۔ لیکن اب بدلے گا۔

اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک لہرائی۔ ملکیت سنبھال کر رکھنے اور سر چھپانے کے لیے اب اسے ایک چھوٹی سی جھونپڑی کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ جو ہوتا ہے، اچھے کے لیے ہوتا ہے۔۔!!

○○

اوراق (خاص نمبر)

راشٹریہ سہارا

کنگن

وہ دونوں چلتے چلتے ٹھہر گئے۔ سامنے ہی زیورات کی دکان تھی۔ رنگ برنگے لباس پہنے مرد عورتیں زیورات کی خرید و فروخت میں مشغول تھے۔ پورے شہر میں زیورات کی یہ سب سے بڑی دکان تھی۔ باہر لگے ہوئے شوکیس میں پتھر کی ایک حسین مورت نے خوبصورت طلائی کنگن پہن رکھا تھا۔ لڑکی نے للچائی نظروں سے کنگن کو دیکھا۔ پھر اپنے مرد سے بولی۔

"کتنا خوبصورت ہے۔"

"ہاں بہت خوبصورت"

"کافی پیسوں میں ملے گا نا ......؟"

"ہاں بہت پیسوں میں" لڑکے نے اشارہ کیا۔ "دیکھتی نہیں دکان کے اندر کیسے کیسے لوگ ہیں۔ کیسے کیسے قیمتی کپڑے پہنے ہوئے۔"

"ہا ...... ہاں" لڑکی کا چہرہ لٹک گیا تھا۔ مگر دفعتاً اس کے چہرے پر پھر سے خوشی آ گئی تھی۔

"میرے ہاتھوں میں کیسا لگے گا یہ کنگن؟"

لڑکے نے لڑکی کے گندے میلے ہاتھوں کو دیکھا۔ پھر مسکرایا۔ "بہت اچھا ......بوت خوبصورت لگے گا۔"

"کیا ہم یہ کنگن نہیں لے سکتے؟"

اس بار لڑکے کا چہرہ لٹک گیا تھا۔ "بہت مہنگا ہے نا ...... بہت پیسہ لگے گا......"

"ہم دونوں پیسہ جمع کریں گے...... بھیک سے جو بھی ملے گا، اسے جمع کر لیں گے۔"

لڑکے کو لڑکی کی یہ تجویز پسند آئی۔ اس نے حامی بھری۔ "ہاں یہ ہو سکتا ہے۔ بچت سے ہو سکتا ہے کہ ہمارے پاس ڈھیر سارے پیسے جمع ہو جائیں۔ پھر یہ کنگن میں تمہیں پہنا سکتا ہوں۔"

"سچ!" لڑکی خوش ہو گئی۔ جسم میں اچانک پھرتی آ گئی۔ "تم کتنے اچھے ہو۔

لڑکا مسکرایا۔ "اور تم بھی کتنی اچھی ہو۔"

دھوپ تیز ہو گئی تھی، دونوں پسینے میں شرابور ہو گئے تھے۔ لڑکی اب بھی للچائی آنکھوں سے شوکیس میں سجی ہوئی پتھر کی مورتی کو تکے جا رہی تھی۔ جس کے ہاتھوں میں پہنا ہوا طلائی کنگن سچ مچ ہی بڑا اچھا لگ رہا تھا۔

"آؤ ...... ہم آج سے ہی پیسے جمع کرنا شروع کر دیں۔"

"ہاں، آج سے ہم زیادہ رات تک بھیک مانگیں گے۔"

پھر دونوں نے اپنی صدا تیز کر دی...... مائی باپ...... ایک پیسے کا سوال ہے مائی باپ ...... لاچارے مائی باپ...... بس ایک پیسے کا ......

اس دن دونوں نے جم کر بھیک مانگی۔ پھر واپسی میں پیسے گنے......

"ہاں۔ آج تو کافی آمدنی ہو گئی"

"آج ہم نے محنت بھی کافی کی ہے۔" لڑکا سوکھی روٹی چباتے ہوئے بولا۔

لڑکی نے بھی اپنی پوٹلی کھول لی۔

"ہم ایسی محنت اب روز روز کریں گے۔"

پھر یہ دونوں کا معمول ہو گیا زیورات کی دوکان سے گزرتے ہوئے لڑکی ہمیشہ کی طرح ٹھہر جاتی۔ پھر ...... بیچارگی سے اپنے ہاتھوں کو دیکھتی۔

"پتہ نہیں اور کتنے دن لگیں گے۔"

"بس اب جلد ہی" لڑکے نے یقین دلایا۔ اب ہم نے کافی پیسے جمع کر لیے ہیں۔

"اندر چلو نا۔" لڑکی نے دکان کی بھیڑ بھاڑ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔

"نہیں ابھی نہیں۔ لڑکا بولا .... جب اتنے پیسے جمع ہو جائیں گے تب۔"

لڑکی اب مایوس نہیں تھی۔ بلکہ ہر روز اب اس کی آنکھوں کی چمک بڑھتی جا رہی تھی۔

"مجھے یقین نہیں ہوتا، کیا میں سچ مچ یہ کنگن پہن پاؤں گی۔"

"کیوں نہیں" ..... لڑکے نے یقین دلایا۔ یہ کنگن تمہارے ہی لیے تو ہے۔ مگر اس کے لیے ہمیں کچھ انتظار کرنا ہوگا۔"

اس درمیان ایک نئی بات ہوئی۔ لڑکی ماں بن گئی۔ اسی کی گود میں ایک چھوٹا سا موٹا ننھا منا آ گیا۔ کچھ دنوں تک لڑکا اکیلے ہی بھیک مانگنے جاتا رہا۔ واپسی میں لڑکی پوچھتی۔ "وہ کنگن اب تک موجود ہے نا ......؟"

"ہاں ..... بس ذرا تم چلنے پھرنے کے لائق ہو جاؤ۔"

"آج کل تم اکیلے جاتے ہو۔ بھیک بھی کم ملتی ہوگی۔ پتہ نہیں پیسے کب پورے ہوں گے۔"

"بس جلد ہی" لڑکا مسکرایا۔ اب اپنا یہ بیٹا بھی تو آ گیا ہے۔ اب ہم تین ہو گئے اب پیسے زیادہ ملیں گے۔"

لڑکی کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی۔ معصوم بچے پر سب ہی رحم کھاتے ہیں۔

اب ہم پہلے سے زیادہ کمائیں گے اور کنگن ......"

لڑکے نے پیار سے لڑکی کے ہاتھوں کو چوم لیا تھا۔

لڑکی اب دھیرے دھیرے صحت مند ہونے لگی تھی۔ پھر ایک دن وہ بھی بھیک مانگنے کے قابل ہو گئی۔ اب دو کی جگہ انہیں تین آدمیوں کے پیسے مل رہے تھے۔ دونوں خوش تھے۔ لڑکی بھی اور لڑکا بھی۔ دونوں رات گئے تک واپس آتے۔ پھر پیسے ملاتے۔ اب سچ مچ ان کے پاس بہت پیسے جمع ہو گئے تھے۔ ڈھیر سارے پیسے دونوں سکے کے ڈھیر کو دیکھ کر بہت خوش ہو گئے .....

"اب تو کافی پیسے ہو گئے۔"

"ہاں کافی پیسے۔"

"کیا ان پیسوں سے کنگن نہیں مل سکتا۔"

"کیوں نہیں، اب کل ہی ہم بات کریں گے۔"

لڑکی خوش ہو گئی تھی۔

دوسرے دن زیورات کی دکان پر ویسی ہی بھیڑ تھی۔ لڑکی کنگن والی عورت کو دیکھ کر مسکرائی۔ کچھ دیر کے لیے اسے محسوس ہوا۔ وہ خود بھی شوکیس میں سما گئی ہے اور اس کے ہاتھوں میں طلائی کنگن چمک رہا ہے۔ لڑکا کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ "آؤ۔ اندر چلتے ہیں۔"

لڑکی کی سانس اب تیز تیز چلنے لگی تھی۔ دونوں اندر داخل ہو گئے۔

اچانک ایک بڑی عجیب بات ہوئی...... دوکان کے مالک نے انہیں باہر ہی روک دیا۔

یہ کیا.... لڑکی چونکتے ہوئے بولی۔

"پتہ نہیں کیا بات ہے؟"

مگر بات جلد ہی معلوم ہو گئی۔ کچھ دیر بعد اندر سے ایک لڑکا واپس آیا۔ اور ان کی ہتھیلیوں پر دس دس کے دو سکے تھما دیے......

"یہ ......" لڑکی ایک دم سے چونک پڑی ......

لڑکا ایک دم سے ہنس پڑا تھا۔ "اتر اؤ......"

"تم ہنسے کیوں؟" ...... لڑکی نے اداسی سے دریافت کیا۔

"اس لیے کہ ہم دکان میں کنگن خریدنے گئے تھے اور دکان مالک نے ہمیں بھکاری سمجھ لیا۔"

لڑکا قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ لڑکی بجھ گئی تھی۔ مگر پھر وہ دوبارہ سنبھل گئی۔ اب وہ لڑکے کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔

کیوں نہ ہم ان پیسوں کو اپنے بچے کے لیے رکھ دیں۔ "اسے اچھا کھلائیں گے۔ پلائیں گے۔ پڑھائیں گے......"

"ہاں...... لڑکا خوش تھا۔ دونوں نے ایک ساتھ مل کر بچے کو چوم لیا۔

○○

مہذب

یہ مہذب لوگوں کا ادارہ تھا۔ اور یہ ادارہ جہاں قائم تھا وہ ایک محل تھا۔ قصر ڈرا کیولا کے طرز پر اس کا نام ہی پڑ گیا تھا قصر مہذب۔ اور یہ قلعہ ایک گھنے جنگل میں واقع ہوا تھا۔ رات کے سناٹے میں یہ محل اور بھی خوف ناک لگتا جیسے بہت ساری ویمپائر مل کر چیخ رہی ہوں اور ڈرا کیولا انسان کا خون پینے کے بعد دیواروں پر الٹا رینگتا ہوا اپنے تابوت میں بند ہونے جا رہا ہو۔ کہتے ہیں قصر مہذب میں پہلی بار داخل ہوتے وقت کچھ ایسا ہی احساس ہوتا تھا۔ جیسے بہت ساری چمگادڑوں نے اچانک ایک ساتھ آپ پر شب خون مار دیا ہو۔ ان ساری باتوں کے باوجود ادارہ دن بدن بہ دن ترقی کر رہا تھا اور مہذب لوگوں کی فہرست میں اضافہ ہوتا رجا رہا تھا۔

وہ ایک بوڑھا شخص تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی اور ڈراونی۔ چہرے پر پڑی ہوئی دنیا جہان کی لکیریں اس کے تجربے کار ہونے کی گواہی دے رہی تھیں۔ وہی اس ادارے کا سرپرست تھا۔ ممبر بننے آئے ہوئے لوگوں کو پہلے اس کے طویل اور اکتا دینے والے انٹرویو سے گزرنا پڑتا تھا۔ یوں انٹرویو کے دوران وہ سوال کم ہی کرتا مگر اس کی برچھی جیسی آنکھیں برابر سوال پوچھے جانے والے کے جسم میں گھسی جا رہی ہوتیں۔

آج اس کا پہلا دن تھا۔ جب اس نے مہذب لوگوں کے اس ادارہ میں شامل ہونے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ اور قصر مہذب میں اس کے قدم داخل ہوئے تھے۔ اب وہ آقا کے سامنے کھڑا تھا اور اس کی لرزہ دینے والی آواز کسی گہرے کنویں سے آتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔

"میرے محترم دوست! کیا تم اپنے مہذب ہونے کی کوئی دلیل دے سکتے ہو۔"

"ہاں"

اس نے سینہ فخر سے پھیلاتے ہوئے کہا۔ "میں جس محلہ سے آ رہا ہوں وہ سفید پوش لوگوں کا محلہ ہے۔ پتہ نہیں کہاں سے تین سیاہ فام وہاں آکر بس گئے تھے۔"

"میرے عزیز! شاباش!! پھر تم نے کیا کیا؟"

میں نے تینوں سیاہ فاموں کی قسمت میں بے رحم موت لکھ دی۔"

"شاباش میرے عزیز!! ایسا کر کے تم نے برابری کا ثبوت دیا۔ وہ برابری جو آج کے تہذیب یافتہ ملک کے لیے ضروری ہے۔ یہ مہذب ہونے کی دلیل ضرور ہے تاہم تمہیں ایک پل صراط سے گزرنا باقی ہے۔ گزر سکو گے؟

"ہاں"

"تو جاؤ"

بوڑھے کی گہری نیلی آنکھوں میں چمک لہرائی۔ "اپنے ان پچیس نئے ساتھیوں کو شامل کر لو اس نے اشارہ کیا۔ اور شہر کے متوسط علاقے کی طرف نکل جاؤ..... سنا ہے وہاں بچے کافی پیدا ہو رہے ہیں۔ تم اپنا کام جانتے ہو؟"

"ہاں۔ یہ بچے سرکش ہیں کل ان کے بگڑے ہوئے تیور انہیں تہذیب سے دور کر سکتے ہیں۔"

"شاباش میرے عزیز! وحشی قوموں کو یہ حق نہیں دیا جا سکتا کہ وہ سرکش اور باغی بنیں۔ اور حکومت کریں۔ یہ عین تہذیب کے منافی ہے۔ ان چھوٹے چھوٹے

بچوں کو تہذیب کی مقدس راہ پر قربان کر دو۔ اور شاباش! وہاں سے فاتح بن کر اور ہماری اس عظیم تہذیب کے لیے بنائی گئی تنظیم میں شامل ہو جاؤ۔"

"جیسا حکم آقا۔"

انہوں نے سروں کو جھکا لیا۔ آقا نے تالی بجائی۔

"اب تم لوگ جا سکتے ہو۔"

اور مشینی انداز میں سب آقا کی بتائی گئی سمت کی جانب روانہ ہو گئے۔

شام واپسی پر آقا کو انہیں اپنی رپورٹ پیش کرنی تھی۔ نوجوان کی آنکھوں میں پراسرار سی چمک تھی۔ اور وہ اپنے بازو کی مچھلیوں کے خون میں کئی گنا زیادہ حرارت محسوس کر رہا تھا۔ اور شام میں سارے کے سارے فاتح بن کر لوٹ آئے۔ ان کے ہاتھ پاؤں ناپاک بچوں کے خون میں رنگے جا چکے تھے۔ اور بقول ان کے وہ خوش تھے۔ کہ اب بہت جلد وہ مہذب لوگوں میں شامل کیے جانے والے ہیں۔

"شاباش! آقا کی بلند آواز گونجی۔ اب آخری سوال اور اس کے بعد تم سب ہمارے اس عظیم خاندان کے اہم افراد میں شمار کیے جاؤ گے۔ تو عزیز! میں کیسا خوش ہوں۔ تمہارے منہ سے یہ جان کر کہ تم نے ان چھوٹے چھوٹے ناپاک بچوں کو.... ہاں ناپاک بچوں کو کہ وہ بڑے ہو کر تہذیب کی مقدس آسمانی کتاب کے خلاف آواز احتجاج بلند کرتے۔ تم نے ان بچوں کے وجود کو ہی ختم کر دیا۔ آنے والی اس نسل کو بڑا ہونے سے پہلے ہی کچل ڈالو کہ یہ تہذیب کو زندہ رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ شاباش میرے عزیزو.... اب تم مہذب لوگوں میں شامل ہونے کو تیار ہو! تو نوجوان! تم بتاؤ۔ ان مسحور کن لمحوں کی داستان سناؤ کہ وہ کیسے چیخے، تڑپے، چھٹپٹائے، چلائے.... ہائے وہ لمحہ... کتنا خوبصورت ہو گا! میں جاننے کو بے چین ہو رہا ہوں.. .. مہربانی کر کے مجھے بتاؤ....

"تو یوں ہوا میرے آقا!"

اور نوجوان نے واقعہ کو یاد کرنا شروع کیا کہ کیسے اس نے چھوٹے چھوٹے بچوں پر اسلحے تان دیے۔ حملہ بول دیا۔ ان کی بوٹیوں کے بھی کئی ٹکڑے کر دیے۔ اور آہ.....وہ لڑکی.... کیسی دلخراش چیخ تھی اس کی۔ جب اس کا بھیجا.....ایک تیز آواز کے ساتھ پھٹا تھا۔ آہ! لمحے بھر کے لیے اس کے جسم میں ایک ٹھنڈی لہر دوڑ گئی تھی۔

"آہ سب ضائع ہوا۔ سب ضائع ہوا.... آہ وہ کیسی خوبصورت صدا رہی ہوگی۔"

آقا زیر لب بڑبڑا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔

نوجوان، آہ تم نے وقت ضائع کر دیا۔ کچھ کمی رہ گئی ہے تمہارے اندر.... ورنہ تم اس لڑکی کی چیخ پکار میں بھی سرور تلاش کرتے، نشہ تلاش کرتے۔ آہ تمہاری ساری محنت ضائع ہو گئی.... واپس جاؤ۔ واپس جاؤ۔"

واپس جاؤ نوجوان.... اس چیخ کو بھلانے کی کوشش کرو۔ اور اس آہ و بکا میں شراب جیسا نشہ تلاش کرو.... وہ نشہ جو تمہیں مہذب بنا سکے۔

اور نوجوان دبے قدموں سے باہر نکل رہا تھا.... کتنے افسوس کا مقام تھا.... تہذیب کی تین صدیاں گزارنے کے بعد بھی وہ مہذب نہیں ہو سکا تھا۔ ○○

ایک پرانی دستک

دوپہر کے بارہ بجے تھے۔ سورج کا سرخ گولا ایک دم سے سر پر آگیا تھا۔ صبح میں کچھ خنکی سی تھی۔ دس بجتے بجتے سورج کی تمازت زمین کے ریزے ریزے میں جذب ہو گئی اور سارا شہر جلنے لگا۔ چلچلاتی ہوئی گرمی نے سبھی کو پریشان کر دیا تھا۔ دکانیں کھلی تھیں۔ موٹر گاڑیوں اور رکشہ والوں کے آوارہ شور، قہقہوں سے بے نیاز ہندو پاک کے درمیان ہو رہے ایک روزہ کرکٹ میچ کی کمنٹری انتہائی دلچسپی سے سنی جا رہی تھی۔ چھوٹا سا شہر تھا۔ دکانوں پر بیٹھے ہوئے لوگ کرکٹ کے کھیل کو لے کر آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ بسوں کے شور اور گاڑیوں کے ہنگاموں سے بالکل الگ چائے، پان کی دکانوں پر بیٹھے ہوئے لوگ کسی کسی بات پر کھلکھلا کر ہنس پڑتے.... وہ دونوں چپ چاپ چلے جا رہے تھے۔ آہستہ آہستہ.... کبھی کبھی لڑکے کی بیساکھی کی کھٹ کھٹ اس شور سے الگ گونج اٹھتی۔ دونوں کی نگاہیں جھکی جھکی تھیں اور سڑک کے کنارے کنارے دونوں سہمے قدموں سے چلے جا رہے تھے۔ کبھی کبھی جب کوئی گاڑی بالکل قریب سے گزرنے لگتی تو لڑکی اس کا بازو پکڑ کر اسے کنارے کر دیتی.....اور لڑکے کے ہونٹوں پر پیار بھرا تبسم مچل اٹھتا۔

لڑکے کی عمر کوئی بیس بائیس سال کی تھی اور لڑکی سترہ اٹھارہ سال کی

رہی ہوگی۔ دونوں ہی بھکاری تھے۔ لڑکے کا رنگ کچھ صاف تھا۔ بڑا سا لمبوترہ معصوم چہرہ، ایک پاؤں گھٹنے سے اوپر کٹا ہوا۔ اس وقت بھی اس نے گندہ میلا سا کرتا پہن رکھا تھا..... پاجامہ کچھ زیادہ ہی گندہ دکھ رہا تھا۔ پائجامے کی ایک مہری گھٹنوں تک کٹی ہوئی تھی۔

"چلو نا کھانے؟" لڑکی نے مڑکر سرگوشیوں کے سے انداز میں کہا۔

چلتے چلتے وہ کچھ ٹھہر سا گیا۔ آگے کپڑوں کی ہول سیلز کی دکان تھی اور دکان کے قریب انٹلکچول قسم کے کچھ لوگ کمنٹری سننے میں مصروف تھے۔ آپس میں تبصرے بھی ہو رہے تھے۔ یہ کالج میں پڑھنے والے لڑکے تھے جو جینس کے پینٹ اور رنگ برنگی جرسیاں پہنے ہندوستانی بیٹس مین کی شاندار بلے بازی کی داد دے رہے تھے۔

"تم ٹھہر کیوں گئے؟" لڑکی نے پھر پوچھا۔

"نہیں جانتی۔ بیساکھی والے لڑکے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ میں کمنٹری سن رہا ہوں۔"

"کم۔ ٹری؟" لڑکی نے اس لفظ کو دہرایا۔

"کمنٹری۔" بیساکھی والا لڑکا ہنسا۔ "جانتی ہو یہ کیا ہوتا ہے؟"

"نہ"۔ لڑکی نے بہت سوچ سمجھ کر نفی میں گردن ہلادی۔

"یہ وہ ..... ہوتا ہے۔" لڑکے نے بیساکھی پر گرفت ذرا سخت کرتے ہوئے کہا۔ اسے افسوس ہوا کہ ہاتھ کے اشارے سے بتانے میں وہ معذور ہے۔ پھر بھی مسکراتے ہوئے بولا۔ "کل جو تم نے رمنہ میدان میں دیکھا تھا نا، کھیلتے ہوئے۔ ایک آدمی گیند پھینکتا ہے، دوسرا بلے سے مارتا ہے۔ کچھ لوگ گیند روکنے کے لیے کھڑے رہتے ہیں ....."

"ہاں۔" لڑکی اب خوش تھی۔

"بس یہی کمنٹری ہے۔ میچ جہاں بھی ہوتا ہے، ریڈیو اسے سنا دیتا ہے۔"

"اچھا!" لڑکی اس کی نالج سے خوش تھی۔ "تم تو بہت کچھ جانتے ہو۔"

لڑکے کے چہرے پر ایک بار پھر اداسی چھا گئی تھی۔ اسے یاد آیا۔ بچپن کے نام پر اپنی اس بائیس سالہ زندگی میں کتنی ہی بار اسے زہر پینا پڑا تھا۔ بچپن کی یاد آتے ہی سارے بدن میں جیسے آبلے اگ آئے تھے۔ اور یادوں کی یلغار جب ایک بار شروع ہو جائے تو پھر دو قدم بھی چلا نہیں جاتا۔ ایسی ہی کتنی یادوں میں اس کا خاموش بچپن بھی تھا اور پرائیویٹ اسکول کے ماسٹر رام لکھن بابو بھی۔ جو پچھتر روپیہ ماہوار پاتے تھے اور اپنے چھوٹے بچے کے ساتھ تنگ دستی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ گھر کے نام پر صرف ایک کمرہ تھا جو ان کے رشتہ داروں نے رحم کھا کر دیدیا تھا۔ سارے دن وہ رشتہ داروں کی جوٹھیاں چوستے... نوکروں سے زیادہ کام کرتے... اور شام ڈھلے اپنے بوڑھے کمزور وجود کے ساتھ کمرے میں ڈھیر ہو جاتے۔ راجو سب کچھ دیکھتا رہتا۔ اپنے بچپن کی ننھی منی شرارتوں کے بیچ سب کچھ سہتا رہتا۔ اور پھر وہ اپنے بابو جی کے زخم آلودہ کندھے کو دیکھنے کے بعد چھوٹی سی عمر میں ہی اپنی شرارتیں بھول گیا۔ بابو جی نے اس کے لیے رنگ برنگی کتابیں خرید کر دی تھیں اور کتابوں کی کتنی ہی خوبصورت تصویریں ساری ساری رات زندہ ہو ہو کر اس کے خواب میں آتی رہتیں۔ جہاں ننھے منے کندھے پر بستہ لٹکائے اسکول جاتے بچے تھے اور ان بچوں کے نوخیز قہقہے تھے۔ پھر بابو جی اسے ساتھ ساتھ اسکول لے جاتے۔ آدھا پیٹ کھاتے اور اسے لے کر امیدوں کے عالیشان محل تعمیر کرتے۔ ماں تو پیدا ہوتے ہی ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ پھر سب کچھ بند آنکھوں کا نوحہ بن گیا۔ نہ خواب ہی پورا ہوا نہ بابو جی نے ہی لمبا ساتھ نبھایا۔ رشتہ داروں کے بوجھ تلے اور زمانے کی نارسائیوں کا شکوہ کرتے کرتے ایسا جھکے کہ ایک شام جب بستر پر گرے تو پھر ان کی ارتھی ہی اٹھی ....
خوفناک خوفناک سی نگاہوں سے گھبرا کر جب چھوٹا سا راجو شام کے سناٹے میں باہر نکلا.... تو شہر کی چمکتی ہوئی روشنیوں، اور اندھی چمک دمک میں کھویا کھویا سا دس سالہ نادان بچہ گاڑی کی زد میں آچکا تھا۔ اور اس کا ایک پیر وقت کی ستم ظریفی کا شکار ہو کر کاٹا جا چکا تھا..... زندگی کی بے معنی سی شاہراہوں پر گھومتے ہوئے اچانک

ہی اس نے گچیا کے معصوم ہاتھوں کو تھام لیا تھا جو اس کی طرح ہی اکیلی تھی... اور پھر کبھی پلپا کے نیچے اور کبھی اسٹیشن کی خاموش راتوں میں دونوں کے گہرے گہرے مدہوش خراٹے گونجنے لگے ... آج اچانک لڑکی کی گفتگو نے اسے پھر سے پرانی یادوں کے قریب کر دیا تھا۔

"مجھے سب معلوم ہے۔" لڑکا آہستہ سے رندھی ہوئی آواز میں بولا۔ "مجھے شروع سے ہی کمنٹری سننے کا بہت شوق رہا تھا۔ ذرا ٹھہرو، تمہیں ایک کھیل دکھاتا ہوں۔"

راجو کے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ اتر آئی تھی۔ "ابھی دیکھنا۔"

گچیا کو وہیں روک کر وہ کھٹ کھٹ کرتا ہوا، بیسا کھی تیز بڑھاتا ہوا کالج میں پڑھنے والے لڑکوں کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔

"بھائی صاحب! کتنا اسکور ہوا ہے۔؟"

"اسکور؟" دو تین لڑکوں نے اس کے حلیے پر اپنی آنکھیں نچاتے ہوئے کہا۔

ایک لڑکے نے تبصرہ کیا.... "زمانہ تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔ کرکٹ کا کھیل اب یکساں طور پر ہر طبقے کے بیچ مقبول ہے۔ کوئی حیرت انگیز انکشاف نہیں اگر یہ حضرت بھی اس سے شوق رکھتے ہوں۔"

"تب تو بتانا چاہیے۔" دوسرے لڑکے کے چہرے پر پھیلا ہوا تبسم اور گہرا ہو گیا۔

"تم نے اسکور پوچھا ہے نا۔" اسی لڑکے نے بیسا کھی والے لڑکے کا بغور معائنہ کرتے ہوئے کہا.... "اسکور تمہیں بھیک تو دلانے سے رہا۔ تمہیں روٹی بھی نہیں دے گا۔ مگر..... " وہ قدرے ٹھہرا.... "ہو سکتا ہے اسکور تمہارے لیے تسلی ثابت ہو.... اس لیے کہ تسلی اور روٹی میں بہت یکسانیت ہے۔"

"اب بتا بھی چکو...." دوسرے نے کہنی ماری۔

"کہنے دو یار۔" وہی لڑکا بولا۔ "جیسے چاند کسی کے لیے محبت ہے تو کسی کے لیے روٹی۔ ویسے ہی اتنا جان لو کہ اب اس میچ میں ہندوستان کے جیتنے کا امکان زیادہ

نظر آنے لگا ہے ۔۔۔۔"

"شکریہ!" بیساکھی والا لڑکا اتنی باتوں سے مطمئن تھا۔

گچیا حیرت سے اور پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس کو ان خوبرو اور پڑھنے والے لڑکوں کے ساتھ بات چیت کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ جب وہ اس کے قریب پہنچا تو وہ تعجب سے آنکھیں نچاتی ہوئی بولی۔

"تم تو کمال کے آدمی ہو۔ ان لوگوں اس طرح کی بات کر لیتے ہو۔"

"ہاں، اس میں رکھا ہی کیا ہے۔" اس نے کندھے اچکائے ۔۔۔۔"چلو چل کر کہیں کھاتے پیتے ہیں۔"

لڑکی نے اس کی تعریفوں کے پل باندھ رکھے تھے۔ دونوں گاڑیوں اور بسوں کے ہنگامے سے الگ سڑک کے کنارے کنارے ڈھابے کی دکان کی جانب بڑھنے لگے، جہاں کم پیسوں میں پیٹ کی دوزخ کو شانت کیا جا سکتا تھا۔

پیٹ پوجا کر کے جب وہ باہر نکلے تو لڑکے کا خیال تھا ۔۔۔۔ آگے کے اسکول کے بارے میں کہیں بھی ٹھہر کر معلومات حاصل کرے گا۔ مگر تب تک شہر میں عجیب سی کشیدگی پیدا ہو چکی تھی۔ دکانیں جلدی جلدی بند ہو رہی تھیں۔۔۔۔ اور بند دکانوں کے باہر لوگوں کی اچھی خاصی بھیڑ لگنی شروع ہو گئی تھی۔ اس نے ڈھابے میں ہی یہ منظر دیکھا تھا کہ کچھ لوگ اچانک ریڈیو سنتے سنتے ایک دم سے چونک پڑے تھے۔ گچیا کچھ سوچ کر پریشان سی ہو گئی اور اس نے زور سے راجو کا بازو تھام لیا ۔۔۔۔ جانے کیوں اسے ڈر سا لگ رہا تھا ۔۔۔۔"جلدی چلو نا ۔۔۔۔"

"چلتے ہیں۔ ڈر کی کیا بات ہے۔ پہلے پتہ تو لگا لوں کہ آخر ہوا کیا ہے ۔۔۔؟"

دونوں ایک جگہ ٹھہرے ۔۔۔۔ کچھ لوگ زور زور سے باتیں کر رہے تھے۔ دونوں نے اپنے کان کھڑے کیے اور اچانک جیسے دونوں ہی بوکھلا گئے۔

"اندرا ماتا کو کسی نے گولی مار دی۔۔۔۔۔" گچیا کی آواز میں لڑکھڑاہٹ تھی۔

"اب کیا ہو گا؟" راجو کے چہرے کا بھی رنگ اڑ گیا تھا۔ ایک عجیب سی

بد حواسی دونوں کے رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی۔ اور دونوں ہی شہر کے دیگر پریشان حال لوگوں کی بھیڑ میں شامل ہو گئے۔

چار بجے تک شہر میں اچھی خاصی کشیدگی پیدا ہو چکی تھی۔ مختلف ذرائع سے لوگوں تک کچھ خبریں موصول ہو چکی تھیں۔ سات بجے تک توڑ پھوڑ کے کئی واقعات سامنے آ چکے تھے۔ کئی بسیں نذر آتش کی جا چکی تھیں۔ کئی سکھوں کی دکانیں لوٹ لی گئی تھیں..... اور یہی وقت تھا جب دونوں کے اکھڑے ہوئے قدم کھولی میں پہنچ کر اپنی تکان اتار رہے تھے۔

"یہی حال رہا تو کل بھوکا رہنا پڑے گا ....." گپیا نے روئی صورت بناتے ہوئے کہا۔ دھول میں سنا ہوا اس کا چہرہ زرد سا دکھلائی دے رہا تھا.....

"اب جو ہوگا... کل ہوگا نا... ٹھیر... پہلے میں کھا پی لوں۔ پھر دیکھکر آتا ہوں۔"

مانگی ہوئی چیزوں کی پوٹلی کھول کر باسی روٹی اور سڑن دیتی ہوئی سبزی دونوں نے چٹخارے لے لے کر کھائی۔ پھر کرتے کے نچلے حصے سے منہ پوچھتا ہوا وہ اٹھ کھڑا ہوا... اور بیساکھی اٹھا کر اس میدان کی طرف چل پڑا جہاں چائے، پان والوں کی دکانیں رات کے کئی کئی بجے تک کھلی رہتی تھیں۔ اور جہاں دنیا بھر کی خبریں آسانی سے معلوم ہو جایا کرتی تھیں۔ چائے پان کی دکان کے پاس آکر اس نے دیکھا کہ تمام دکانیں بند تھیں مگر بھیڑ لگائے پریشان پریشان سے لوگ کھڑے تھے۔ سب کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا، مٹھیاں کسی ہوئی تھیں۔ ہر شخص غصے میں دکھائی دے رہا تھا.....

فوراً ہی وہ تیز تیز بیساکھیاں بڑھاتا ہوا کھولی میں لوٹ آیا تھا۔ رات کی پرچھائیاں شہر پر حاوی ہو گئی تھیں۔ اس کی سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ کھولی میں داخل ہوتے ہی وہ چلایا۔ "گپیا! اپنی اندرا ماتا ختم ہو گئیں، ان کی ہتیا کر دی گئی..."

اندر گھستے ہی اس نے دیکھا، گپیا چادر میں سر دیے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی ہے۔ بیساکھی ایک کونے میں رکھ کر لڑکھڑاتا ہوا وہ زمین پر لیٹ گیا۔ گپیا نے اپنے

آنسو پونچھے اور اس کے قریب آکر اپنی کالی میلی بانہیں اس کے گلے میں ڈال دیں۔

"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ پتہ نہیں کیوں بہت ڈر ..... اندرا ماتا مار دی گئی۔ یہ خبر کھولی میں سبھوں کو معلوم ہو گئی ہے۔ پر مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ بھوت ....."

"دھت پگلی! راجو نے گپیا کے وجود کو پرے کرتے ہوئے کہا۔ "میں سوچ رہا ہوں اب مولک (ملک) کا کیا ہو گا ..... اور تو ہے کہ ڈری جا رہی ہے ....."

"میرا دل دھک دھک کر رہا ہے ..... دیکھو نا.....!" اس نے راجو کے ہاتھ کو اپنے دھڑکتے ہوئے سینے کے پاس رکھتے ہوئے کہا۔

"تو سو جا۔ میں آج بہت پریشان ہوں۔"

اتنا کہہ کر وہ زمین پر ہی لمبا ہو گیا۔ پھٹی پھٹی آنکھیں دیر تک کھولی کی چھت کو گھورتی رہیں ..... گپیا کی آنکھوں میں بھی دھیرے دھیرے نیند اترتی جا رہی تھی۔

صبح ہونے کو تھی.... اور صبح کی سرخی اپنے آنچل میں کتنے ہی واقعات سمیٹے شہر کے آنگن میں پھیلتی جا رہی تھی۔

صبح ہوتے ہی گشتی پولیس جیپ نے چیخ چیخ کر یہ اعلان کر دیا تھا کہ سارے شہر میں کرفیو لگا دیا گیا ہے۔ توڑ پھوڑ کی کارروائی کرنے والوں کو دیکھتے ہی گولی مار دی جائے گی۔ کوئی بھی اپنے گھر سے باہر نہیں نکلے....

"شہر میں کرفیو لگ گیا ہے۔" اس نے گھبرائے سے لہجے میں کہا۔

"یہ کیا ہوتا ہے۔" گپیا نے معصوم بنتے ہوئے کہا۔

"جو باہر نکلے گا۔ پولیس اسے گولی مار دے گی۔"

"باپ رے۔" گپیا خوفزدہ ہوتے ہوئے بولی۔ "تب کھانا کیسے کھایا جائیگا؟"

کھولی کے آس پاس بھی ہلچل ہو گئی تھی۔ آج صبح سے ہی "کینسٹر اور بلے" کا شور نہیں تھا۔ میونسپلٹی نل پر پانی بھرنے والے اور نہانے والوں کے ہنگامے بھی نہیں تھے۔ بوڑھا چھچین سہما سہما سا اپنی جھونپڑی کے پاس کھڑا تھا۔ دوسرے بھکاری اور بھکارن بھی بدحواسی رونی صورت بنائے کھولی کے ارد گرد کھڑے تھے۔

اسے باہر پاتے ہی کئی آوازوں نے اسے نرغے میں لے لیا۔

"رجو! باہر مت جانا، آج کرفو ہے۔"

"جانتا ہوں۔" اس نے بیسا کھی سے مٹی کھرچتے ہوئے بڑے اطمینان سے کہا اور دوبارہ کھولی کے اندر آگیا۔ اس کا دماغ بوجھل تھا۔ پیشانی پر شکن پڑ گئی تھی۔ وہ بس اتنا جانتا تھا کہ یہ کام جس نے بھی کیا ہے غلط کیا ہے۔ اندرا ماتا سچ مچ کی ماتا تھیں، دیوی تھیں۔ وہ جو کچھ بھی کھاتا رہا ہے۔ سب کچھ انہی کی مہربانی سے۔ اندرا ماتا کو مار کر گھور پاپ کیا ہے قاتلوں نے ..... اور اندرا ماتا کی ہتیا کی خبر سن کر شہر کا شہر جیسے پاگل ہو گیا ہے ..... پر گچیا کھائے گی کیسے؟

رہ رہ کر وہ اس سوال پر لوٹ آتا۔ وہ کیسے سہن کرتا کہ گچیا بھوکی رہ جائے ..... مگر آج بھیک کون دے گا۔ اور گچیا بھوکے پیٹ رہ نہیں سکتی ہے..... باہر نکل کر دیکھنا چاہیے ..... کون سا انرتھ ہو جائے گا..... پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں.....

"چل گچیا .....!" فیصلہ کن انداز میں وہ زور سے چیخا۔ چلتے ہیں باہر..... کچھ اپائے تو کرنا ہی ہوگا۔"

"پھر؟" گچیا خوف سے بولی۔ "مگر کارفو؟"

"اس سے کا؟ ہم لوگوں کو کچھ نہیں ہوگا۔"

بیساکھی کھٹکھٹاتا ہوا، گچیا کے ڈرپوک وجود کے ساتھ تیز قدموں سے وہ شہر کی سڑکوں پر نکل آیا۔ کئی دوسرے بھکاریوں نے حیران حیران نگاہوں سے اس کا تعاقب کیا۔ پھر سب کے سب ہمت اور حوصلہ پاکر شہر کے متعدد علاقوں میں بٹ گئے۔ شہر میں کرفیو لگنے کے باوجود فضا ویسی ہی تھی۔ غنڈوں اور لٹیروں کو شہ مل گئی تھی۔ غنڈہ عناصر توڑ پھوڑ کے واقعات میں شریک تھے۔ اس نے سب کچھ دیکھا۔ پولیس کا گرین سگنل ..... اور توڑ پھوڑ کرنے والوں کی آسانیاں ..... بیچارے سکھوں کی دکانیں ایک ایک کرکے لوٹی جا رہی تھیں۔ پگڑی والے ایک بھی آدمی شہر میں نظر نہیں آرہا تھا۔ پولیس کبھی کبھی جیپ سے گزر جایا کرتی۔ لوگ جگہ چھوڑ

دیتے .... گشتی پولیس اور گھوڑ سوار مذاق کرتے۔ ایک دو جملے بول کر شہر کے دیگر علاقوں کا محاسبہ کرنے نکل جاتے۔

گچیا نے پھر بیزاری سے کہا..... "آج سب مصروف ہیں۔ بھیک کوئی نہیں دے گا.... چلونا.... مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"پگلی....." بیساکھی والا لڑکا پھیکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

توڑ پھوڑ کی زبردست واردات جاری تھی۔ شور ہنگامے نے شہر کے معمولات کو نقصان پہنچایا تھا۔ شہر وحشیوں اور جنگلیوں کا شہر نظر آ رہا تھا۔ جنگل سے آئے ہوئے بے ہنگم جانور ہر موڑ پر چھا گئے تھے۔ دونوں سہمے سہمے، چھپتے چھپاتے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ کبھی کبھی جب فضا خراب ہو جاتی تو دونوں گلی میں سٹ کر کھڑے ہو جاتے اور بھکارن لڑکی بیساکھی والے لڑکے کو مضبوطی سے تھام لیتی۔

اچانک پولیس نے لاٹھی چارج کر دیا تھا۔ کچھ پاگل سے لوگ قتل و غارت گری پر اتر آئے تھے.... بھاگو، بھاگو کا شور تیزی سے فضا میں پرواز کر گیا۔ گشتی پولیس نے بوکھلائے ہوئے لوگوں پر فائرنگ کر دی تھی۔ بھیڑ کو شانت کرنے کے لیے آنسو گیس کا سہارا لیا گیا تھا۔ جسے جدھر جگہ مل رہی تھی بھاگ رہا تھا۔ خاکی وردی والے اچانک ہی غصے میں آ گئے تھے۔ اور ان کے مطلق العنان گھوڑ سواروں نے سڑک کی دھول اڑا دی تھی۔ ایک دوسرے پر گرتے پڑتے ہوئے لوگ تیزی سے بھاگتے جا رہے تھے۔

اچانک اس افراتفری میں ایک دلخراش چیخ گونجی۔ "آہ...." اور کسی کی بیساکھی لوگوں کے دھکے سے دور جا گری۔ اور اس کے ساتھ ہی کتنے ہی قدموں تلے وہ شخص روند دیا گیا۔ شہر سناٹے میں ڈوب گیا تھا۔

بیساکھی والا تقریباً بے ہوش ہو گیا تھا۔ آنکھیں ابل آئی تھیں۔ چہرہ زخموں سے چور تھا۔ پیروں سے خون نکلنے لگا تھا۔ پھر کہیں کسی گلی سے روتی ہوئی.... بلکتی ہوئی گچیا نکلی اور اس کے روند ڈالے گئے جسم پر سر رکھ کر پھپھک پڑی۔

"رجو...."

راجو نے بڑی مشکل سے آنکھیں کھولیں۔ اس کے اعصاب ہر لمحہ اس کا ساتھ چھوڑ رہے تھے۔

گشتی والے سپاہی دور جا چکے تھے۔ اور سڑک بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔

"تو چلی جا...." اس نے اٹکتے اٹکتے کہا۔ "لٹیروں نے مجھے کسی لائق نہیں چھوڑا۔ اب میں چل پھر نہیں سکتا۔"

اس کا سارا جسم خون میں ڈوبا ہوا تھا۔ سانس جیسے دھیمی رفتار سے چل رہی تھی۔

"کیا ہے رجو۔" لڑکی زار وقطار رو رہی تھی.... اس کا دھول میں سنا ہوا چہرہ بالکل فرشتوں جیسا نظر آ رہا تھا۔

اور بیساکھی والے لڑکے کے چہرے پر جیسے نور ہی نور بکھر گیا ہو.... ایک دم سے سارے درد بھول کر..... اٹکتے اٹکتے گپیا کے آنسوؤں سے تر چہرے کو دونوں ہاتھوں سے تھامے.... وہ کہہ رہا تھا "وعدہ کرو.... تیرے سے جو میری لڑکی ہوگی.... اس کا نام تو اندرا رکھے گی.... وعدہ کرو.... رکھے گی نا...."

اس کے چہرے پر عجب سی شان برس رہی تھی۔ گپیا کا سارا چہرہ آنسوؤں میں ڈوب گیا تھا۔

اور گشتی پولیس کی چاپ پھر نزدیک سے سنائی دینے لگی تھی۔

اچانک کچھ سوچتا ہوا۔ وہ بولا..... "معلوم، اب اس دن ہر سال گورمنٹ پروگرام کیا کرے گی اور....."

مسکراہٹ اور درد کی کش مکش میں وہ بڑبڑایا۔ "اور تو بھول جائے گی کہ اس دن میری ٹانگ بھی ٹوٹی تھی۔"

○○

---- سہیل۔ ۱۹۸۵ء

لیپروسی کیمپ

(Leprosy - Camp)

کنکریلے، ٹیڑھے میڑھے راستوں، اونچی نیچی ہیبتناک پگڈنڈیوں کو عبور کرتے ہوئے اب یہ قافلہ شہر کی پررونق شاہراہوں سے گزر رہا تھا۔

ان میں دس بارہ آدمی تھے۔ جس میں بچے بھی تھے۔ مرد بھی اور عورتیں بھی۔ ان کی شکلیں بڑی گھناؤنی اور کراہیت آمیز تھیں۔ ان کے چہروں پر چرک کے بڑے بھدے بھدے داغ تھے۔ کہیں کہیں کے ہونٹ بھی سڑے ہوئے تھے جن کی دراڑوں سے سڑے ہوئے دانتوں کی قطاریں باہر جھانک رہی تھیں۔ انکے جسموں پر پھٹا، ادھڑا ہوا کثیف لباس تھا۔ ہاتھ کوڑھ کے گھاؤ سے بدنما لگ رہے تھے۔ اور ٹھٹے سے ان ہاتھوں نے اپنی گردنوں میں لٹکا ہوا باجہ تھام رکھا تھا، جس کو بجاتا ہوا یہ قافلہ شہر کی مختلف سڑکوں سے ہوکر گزر رہا تھا۔

قافلے کے آگے لال کپڑوں والا ایک بورڈ تھا۔ جس کو دو بوڑھے، بوڑھیا اپنے "چرکیدے، ٹھٹھے" ہاتھوں سے پکڑے ہوئے تھے۔ ان کے سڑے ہوئے کراہیت آمیز چہروں پر دھوپ کی روشن لکیریں مسکرا رہی تھیں۔ اور آنکھوں میں غرض اور

ہمدردی کی کوئی اجنبی کرن آہستہ آہستہ مدھم ہوتی ہوئی ماند پڑتی جارہی تھی۔

آگے بڑھتے ہوئے لوگ متعدد دوکانوں پر چھترا جاتے۔ یا پھر چلتے پھرتے راہگیروں اور مسافروں کے پیروں پر بچھ کر اپنے سروں کی لال ٹوپیوں کو آگے کردیتے جس پر Help کے لکھے ہوئے الفاظ راہگیروں کو کچھ وقفے کے لیے اپنی جگہ منجمد کردیتے۔

بچہ خاموشی سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ وہ کبھی اپنے ٹھُٹھے سے ہاتھوں کو دیکھتا۔ کبھی اپنے سر کی لال ٹوپی، اپنے ٹھُٹھے چرکیدے ہاتھوں سے برابر کرتا۔ اور آتے جاتے راہگیروں کو اپنی بے حسی کے گونگے ہونٹوں کو دکھا کر اشارے کی انوکھی زبان کو آواز دیتا۔ راہگیر ان کے قافلے پر سرسری، ترچھی، طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے، اپنی اپنی منزلوں کی سمت آگے بڑھ جاتے۔

قافلے آگے بڑھتے رہے۔۔۔۔

دوپہر کے تھکے ماندے سورج نے تب تک آدھی نیند پوری کرلی تھی۔۔۔۔

اور ٹریفک ہمیشہ کی طرح پاگل ہاتھیوں کے جھنڈ کی طرح چنگھاڑ رہا تھا۔۔۔۔

وہ بچہ پہلی بار اس غیر انسان لوگوں کے قافلے سے آملا تھا۔ پہلی بار اسے اپنا جسم عام لوگوں سے الگ محسوس ہوا۔۔۔۔ اور جب اس نے اپنے جسم کی بدنما کھائیوں کے سنکرے پل کو عبور کیا تو اسے محسوس ہوا۔ وہ سبزی منڈی کی اس سڑی گلی سبزی کی طرح ہوتا جارہا ہے جسے منڈی والے سڑا ہوا مال سمجھ کر اپنی دکانوں سے باہر پھینک دیتے ہیں۔

وہ بچہ۔۔۔ اچانک ہی پل میں اپنے عمر کی ہزاروں منزل کو عبور کرگیا تھا۔

جسم کیا ہے۔۔۔۔؟

زندگی کیا ہے۔۔۔۔؟

لوگوں اور اس میں کتنا فاصلہ ہے۔۔۔۔؟

وہ خاموشی سے آنکھیں پھاڑے پر رونق شاہراہوں سے گزرتے سوٹڈ بوٹڈ لوگوں

اور آس پاس کی دکانوں سے گونجتے گانوں کی بے ہنگم، نقرئی آوازوں کو سن رہا تھا۔ پھر ہمیشہ کی طرح اپنے سر کو عجیب سا جھٹکا دیتا۔۔۔ اور اپنی لال ٹوپی پر لکھے ہوئے ہیلپ کے بورڈ کو ڈلاتا ہوا دکاندار یا راہگیر کی جانب اپنا ٹھٹھا چرکیدہ ہاتھ بڑھا دیتا۔

"تھوہ"۔۔۔۔۔۔

"پیسہ دور سے دینا۔ چھو دینے پر تمہیں بھی کوڑھ ہو جائے گا"۔۔۔۔۔۔

"ارے، یہ لوگ سالے نخرے کرتے ہیں"۔۔۔۔۔۔

"یہ سالے اپنے جسموں پر لوشن ملتے ہیں"۔۔۔۔۔۔

"۔۔۔۔۔۔"

کوڑھ۔۔۔ چرک۔۔۔ گھنونی بیماریاں۔۔۔ نفرت۔۔۔ چھوت۔۔۔

لوگ۔ ان گنت لوگ۔۔۔

اور فاصلے کی لمبی سنکری کھائی ۔۔۔۔۔۔

اس کے اندر دھنسی آنکھیں جسم کے بالکل اندر چلی جاتیں۔ اس کے جسم کے اندر کی آنکھیں اس کے پورے جسم کو کیکٹس کے نوکیلے پودوں کی طرح چبھونے لگتیں۔ اسے اپنا پورا جسم زخمی اور آگ سے جلتا ہوا معلوم ہوتا۔ ایک تیز آگ کی بھٹی اس کے جسم کے اندر ہی اندر سلگ جاتی۔

خاموشی دھیمی دھیمی آنچوں پر بوکھلائے ہوئے پرندے کی طرح جلتی رہی۔

اور وہ ۔۔۔۔ بس چپ لیے اپنے جیسے لوگوں کے اس قافلے کے ساتھ آہستہ آہستہ ڈگ بھرتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔۔۔۔

اسے لگتا۔ یہ سب اس کے اپنے لوگ ہیں۔ جن سے کبھی بھی اس کی واقفیت نہ تھی مگر اچانک جسم کی بدنما کھائیوں اور گڑھوں کی ان گنت سنکری قطاروں نے اس کے یہاں شناسائی کی بو پالی تھی۔

رینگتی ہوئی زندگی پتلی رسی کے کھلے احساسوں پر کسی مداری کی طرح جھول

رہی تھی۔

شام کا تھکا ماندہ سورج آہستہ آہستہ اپنے گھر کو لوٹ رہا تھا۔

ٹھٹھے ہاتھوں میں اب خنکی کی لہریں دوڑنے لگی تھیں۔

اور اب ...... یہ تھکا ماندہ قافلہ آہستہ آہستہ سنکریلی پگڈنڈیوں سے ہوتا ہوا گاؤں کی سرحد کو عبور کر رہا تھا۔ جہاں ان دنوں ان کا پڑاؤ تھا۔

ٹھٹھے، چرکیدے، گھاؤ والے ہاتھوں نے اپنی مٹھیاں درست کیں۔ چیتھڑے والے پھٹے ہوئے خیمے کی رسیاں برابر کیں...

سکڑے ہوئے ہونٹوں کے بدبودار بھبکے کو گاؤں کی فضا میں آزاد کبوتر کی طرح اڑا دیا۔ پھر پتیوں اور لکڑیوں والا الاؤ جلا۔

لوگ بیٹھے....

پوٹلیاں کھلیں......

کٹے ہوئے، ہونٹوں سے آزاد قہقہوں کا شور ابھرا.... ٹھٹھے، مواد بھرے ہاتھ صبح کی دوڑ دھوپ میں ملی ہوئی روزی کے ننگے پاؤں پر ٹوٹ پڑے۔

اور وہ بچہ.... بس خاموشی سے ایک ٹک سب کچھ بڑے عجیب انداز میں دیکھتا رہا۔ آج پہلی بار وہ اس قافلے سے ملا تھا اور پہلی بار اس غیر انسانی قافلے نے شہری لوگوں سے ورثے میں ملی ہوئی بولیاں کھائی تھیں۔

وہ متعجب تھا...

زندگی کا ٹھٹھا احساس اپنے نیم بیہودہ خواب کی تعبیر سنا کر ہونقوں کی طرح مسکرا رہا تھا۔

بوڑھے کی طرف دیکھا۔ جو اس قافلے کا سربراہ بھی تھا اور جو بڑی دیر سے اس کی ٹکٹکی کے انسانی زیور کے عکس کو محسوس کر رہا تھا۔ بچے نے خاموشی سے ایک زہر کا گھونٹ نگلا اور چرکیدے بوڑھے کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بابا ہم میں اور لوگوں میں کتنا فاصلہ ہے"......

چر کیدی بڑھیا دیر تک اپنے کٹے ہوئے ہونٹوں سے ٹھٹھا کر ہنستی رہی اور اپنے باہر جھولتے دانتوں کو اندر دابتی ہوئی حیرت زدہ بابا کی طرف سوال کا دوسرا غلیظ دھواں چھوڑتی ہوئی بولی۔۔۔۔۔ "بابا! ہم میں اور زندگی میں کتنا فاصلہ ہے"۔۔۔۔

جوان زوروں سے ہنسا۔ اس طرح کہ اس کا گڑھا والا دانت اور اندر کی جانب دھنس گیا۔ احساس کا میل بھرا مواد، اس کے قہقہے کے بدبودار بھبکے کے ذریعے باہر کی طرف پرواز کر گیا۔

اسے محسوس ہوا۔۔۔۔ وہ کوڑھی ہے۔۔۔۔ گھناؤنا۔۔۔

وہ جوان ہوتے ہوئے بھی جوان نہیں ہے۔۔۔۔

اس نے اپنے مواد والے پیروں کو جنبش دی۔ ٹھٹھے ہاتھوں سے بالوں کو نوچا۔ اور اپنا مکروہ چہرہ بابا کی دھنسی آنکھوں میں پیوست کر دیا۔۔۔

"بابا! ہم میں اور موت میں کتنا فاصلہ ہے"۔۔۔۔

چر کیدے بوڑھے نے باری باری سے تینوں کے چہرے کی رنگت پڑھی۔ خیمے کے اندر ایک کثیف دھواں سرایت کر گیا تھا۔

ایک بچہ تھا۔۔۔

ایک جوان۔۔۔

ایک بڑھیا۔۔۔

چر کیدہ بوڑھا تینوں کو بغور تک رہا تھا۔ شاید اس کا سبب یہی تھا کہ عمر کی اس لمبی چھلانگ میں کبھی اس نے بھی اس سوال کے بارے میں سوچا تھا۔ اور عمر کی اس لمبی چھلانگ تک آتے آتے وہ ان سوالوں کی بیماری کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی سعی میں کم از کم تھوڑا بہت کامیاب ضرور ہو گیا۔

اچانک وہ کراہا۔۔۔۔

اور اس کی مکروہ کراہ دور سے آتے ہوئے متعدد قدموں کی چاپ میں کھو گئی۔

اب بھی یہ سوال اس کے سڑے انگوں کے مواد سے باہر نکلے ہوئے بالوں

کے ریشے کو کھینچ رہا تھا۔ وہ لمحہ لمحہ اپنی کراہ پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔

دور سے آتے ہوئے متعدد قدموں کی چاپ اب قریب آگئی تھی۔

چرکیدے، بوڑھے کو اپنی سانسیں اندر گھٹتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

"لگتا ہے، ہمیں یہ جگہ چھوڑنی پڑے گی"۔۔۔

"اور سوال ہمارے جسم کے کوڑھ کی طرح ہمیں اندر ہی اندر ڈستے رہیں گے"۔۔۔

"ہم سوال کی جڑوں کو کاٹ نہیں سکتے۔ کاٹنے کی کوشش میں کوئی نہ کوئی دوسرا آکر اس پر پانی کا چھڑکاؤ کر جاتا ہے۔ اور ایسی صورت میں۔۔۔۔"

چرکیدے، بوڑھے سربراہ نے باہر کی طرف جھانکا۔

چند کوڑھیوں کی آنکھیں بھی گول گول دائروں میں بٹ کر وحشتناک ہو گئیں۔

گاؤں والوں کے ہونٹوں پر زہر کی پوٹلی دھری تھی۔ اور ان کی خونخوار، لہو آگیں آنکھیں، خیمے اور قافلے کے سڑیلے جسم کے تعفن پر ٹکی ہوئی تھیں۔

بچے نے کانپتے، پرکٹے پرندے کی طرح چرکیدے بوڑھے کی طرف دھنسی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔ "ہم میں اور لوگوں میں کتنا فاصلہ ہے"۔۔۔

لمحہ لمحہ وہ اپنی آواز کے گونگے پن کو لہو آگیں آنکھوں کے بیچ ٹٹولتا۔۔۔ آوازیں چہار سمت سے اس پر ضرب پہنچانے لگتیں۔

"تم لوگ گاؤں خالی کر دو۔"

"یہاں کی فضا خراب ہو رہی ہے"

"تم لوگ گاؤں کو کوڑھی بناؤ گے کیا۔۔۔۔؟"

"۔۔۔۔۔۔۔"

"چلو"۔۔۔۔ بالآخر بوڑھے کے ہونٹوں سے ایک تیز کراہ پھوٹی۔

بچہ اب بھی گونگی نظروں سے گاؤں والوں کی جانب دیکھ رہا تھا۔

بڑھیا نے اپنے کٹے ہوئے سڑے ہونٹوں پر گرم سلاخوں کے بھاپ کو رکھ دیا تھا۔ اور اپنا سوال اسے اپنے زخموں کے رس رہے مواد بھرے اعضاء میں گھلتا ہوا محسوس ہورہا تھا۔۔۔ "ہم میں اور زندگی میں کتنا فاصلہ ہے۔۔۔۔۔۔۔؟"

خونخوار نظریں اور زیادہ ہیبت ناک ہوگئی تھیں۔

دور جنگلی پیڑوں پر بیٹھا ہوا کوئی پرندہ اپنی نحوست بھری آواز میں دیر سے روئے جارہا تھا۔

خیمے اجڑ گئے۔۔۔

ٹھٹھے ہاتھوں نے دوبارہ پوٹلیوں اور سامانوں کے کثیف انبار کو سمیٹ لیا۔

اندھیرے کی تاریکی نے اپنی کالی بھیانک زبان باہر نکال دی۔

قافلہ پھر چل پڑا۔۔۔

"اس چرکیدے" جوان کا سوال اب تک اس کے ہونٹوں پر برف کی طرح جما ہوا ہے۔۔۔۔

خونخوار قدموں کی چاپ دور جاکر خاموش ہوگئی ہے۔

اور بس ایک سوال ہے جو فضا میں ساکت ہوگیا ہے۔۔۔

"ہم میں اور موت میں کتنا فاصلہ ہے۔۔۔؟"

کوئی زخم دکھا ہے۔

اس کے ہونٹوں سے نکلا یہ سوال فضا میں دیر تلک چیختا رہا۔

کیوں کہ اب یہ سوال پورے قافلے کا سوال بن گیا تھا۔ ○○

ادراک۔۔۔ ۱۹۸۲ء

مانو یہ بھی کہانی ہے

"بریک فاسٹ لیا کہ نہیں ؟ نہیں لیا؟ بچے اسکول چلے گئے ؟ ہاں، کب کے چلے گئے۔ ایک تم ہی ہو جو دیر میں اٹھتے ہو۔ پتہ نہیں کیسا دفتر ہے تمہارا۔ دفتر میں دیر سے آنے پر ڈانٹ نہیں پڑتی کیا؟ بچے کہہ رہے تھے، ان کے لیے پھولوں والا ایک چھاتا لادو۔ بس اسٹاپ پر بس کا انتظار کرتے ہوئے دھوپ برداشت نہیں ہوتی۔ اور سنو۔ تمہاری آنکھوں کی تکلیف کیسی ہے۔ اف اتنی دھوپ، اس قدر گرمی۔ اپنے لیے بھی ایک چھاتا کیوں نہیں لے لیتے۔ ارے چائے تو پیتے جاؤ۔ کیوں دیر ہو جائے گی۔ اچھا شام میں کب تک آؤ گے۔۔۔۔ دوستوں کے ساتھ دیر مت کرنا، شعر و شاعری مت کرنے لگ جانا۔۔۔۔"

صبح ہوتے ہی لگتا ہے جیسے باتوں کے گھنے جنگل میں گھوم رہے ہوں۔ مئی، جون کی گرمی، جھلساتی، چلچلاتی تیز دھوپ۔ سر سے پیر تک آگ کے شعلے بدن سے اٹھتے ہوئے، دماغ تمازت سے پھٹتا ہوا۔ اس قدر تیز دھوپ، اتنی شدید تپش۔ اف۔

ٹھہر جائیے جناب۔ اب جو میں سنانے جا رہا ہوں ممکن ہے آپ اسے سرے سے کہانی ہی تسلیم نہ کریں۔ مت مانئے آپ کی مرضی۔ لیکن پوری کہانی سن لینے کے بعد یہ ضرور بتائیے گا کہ پھر کہانی ہوتی کیا ہے۔۔۔۔ اسی مئی جون کے مہینے،

دوپہر کی تیز جھلساتی دھوپ میں یہ منظر سامنے آیا (منظر ہی کہنا زیادہ بہتر ہوگا اس یقین کے ساتھ کہ ایسے ہزاروں منظر آپ نے بھی سیکڑوں بار دیکھے ہوں گے) اور اس منظر کو سرے سے واقعہ بھی نہیں کہا جاسکتا، تو منظر کچھ یوں تھا۔

بس اسٹاپ ..... کوئی سا بھی بس اسٹاپ ہوسکتا ہے۔

مہانگر ..... کوئی سا بھی مہانگر .....

وہی چلچلاتی دھوپ، جھلسا دینے والی گرمی اور اپنی اپنی بس کا انتظار.......

آدمیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا بس اسٹاپ..... بس نہیں آرہی ہے۔ حیرانی، پریشانی، اکتاہٹ، غصہ ......

"بس کیوں نہیں آرہی ہے؟

"لنچ آور ہے"۔

لنچ آور میں بس کی فریکوئنسی کم ہوجاتی ہے۔"

"سرکار زیادہ بسیں کیوں نہیں چلاتی؟"

چلا رہی ہے (ہنسی)۔ ڈی۔ ٹی۔ سی کو لیپ پوت کر، رنگ بھر کر، اعلان ہوتا ہے، تین سو بسوں کی نئی سروس شروع۔ ہرا رنگ ہے تو گرین لائن سروس۔ سفید ہے تو وہائٹ لائن۔ سرخ ہے تو ریڈ لائن سروس؛

"جناب آپ لائن سے کیوں نہیں آتے۔ دیکھئے ہم سب بس کا انتظار کررہے ہیں"۔

"کمبخت، کئی دنوں سے بارش بھی تو نہیں ہوئی"۔

بارش ہونے سے گرمی اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

میں بھی گھڑی دیکھتا ہوں۔ چڑچڑاہٹ خود پر حاوی ہے۔ بیوی ٹھیک کہتی ہے۔ ایک چھاتا کیوں نہیں لے لیتے۔ پاس ہی اسکول ڈریس میں وزنی کتابوں کا بستہ کندھے سے لٹکائے بچے کھڑے ہیں اور ..... چلچلاتی دھوپ، چپ چپ کرتا پسینہ، چہ می گوئیاں۔ تیز تیز باتیں۔ بس کیوں نہیں آتی کمبخت۔ اب تو آجانی چاہیے۔ بس آتی

ہی ہوگی۔

بچوں کے چہرے پسینے سے تر ہیں، افسوس آتا ہے۔ بیوی ٹھیک کہتی ہے۔ پھول والا چھاتا آجاتا تو... میرے بچے بھی کہیں اسی طرح قطار میں کھڑے ہوں گے۔ کہیں کہیں تو اسٹاپ بھی نہیں ہوتا۔ بس دھوپ میں جھلستے رہیے۔ یہاں سائبان تو ہے۔ دھوپ سے تو بچ رہے ہیں اور یہاں سے بس ایک قدم دور، دھوپ ایسی چھٹکی ہے جیسے کسی خوفناک جانور کی طرح گھات میں ہو۔ قدم بڑھاؤ تو لپک لے گی۔

اور وہیں۔ بس ایک قدم کے فاصلے پر۔ آنکھیں جیسے تھم گئیں ... دو چھوٹے بچے، دو چھوٹے گندے بچے آکر ٹھہر گئے... لیکن ٹھہرو ... کیا یہ سچ مچ بچے ہیں۔ عمر تو بچوں والی ہی ہوگی۔ ایک سات آٹھ برس کا، لیکن دیکھنے میں اور بھی کم لگ رہا ہے۔ گندہ سا نیکر، پھٹی ہوی گندی شرٹ۔ چہرے پر لگی ہوئی مٹی دوسرا اس سے بھی کم۔ پانچ چھ برس۔ بس... لیکن ..... کیا یہ واقعی بچے ہیں۔ انہیں دیکھتے ہوئے تو بچوں کو، بچہ، بنانے والی ساری تعریف سانپ کی طرح راستہ کاٹ جاتی ہے۔ نہ شوخی، نہ مسکراہٹ، نہ بچوں والا کوئی سا بھی احساس بچوں میں اتنا "بچپنا" تو ہونا ہی چاہیے۔ تبھی تو بوڑھا آدمی بھی کبھی کبھی اپنی حرکتوں سے بچہ بن جاتا ہے... یہ بچے نہیں... دھوپ ایک قدم کے فاصلے پر کسی خوفناک جانور کی طرح آگ اگل رہی ہے۔ دونوں بچے دھوپ کے احساس کے بغیر تپتی زمین پر کھڑے ہوگئے ہیں۔ پیر میں چپل، بھی نہیں... ایک کے ہاتھ میں چھوٹا سا گول سا چکا، جس پر کپڑوں کی تہہ لگی ہے۔

"چل کھیل دکھا..... یہ بڑا بچہ ہے.... چھوٹا بچہ تھک گیا ہے۔ وہ اپنی جگہ کھڑا ہے۔ بے حس.....

بڑا بچہ اپنے گندے سے میلے پیر سے اس کی چوتڑ پر پیر مارتا ہے۔ چھوٹا بچہ گرتا ہے۔ غصہ میں وہ اسے مارنا چاہتا ہے..... بڑا اسے زور کی چپت لگاتا ہے۔

"چل کھیل دکھا۔ بابو لوگوں کو کھیل دکھا...."

پھر چھوٹا سر کے بل گرتا ہوا آتا ہے اور بڑے کے ہاتھوں میں، تھامے ہوئے لوہے کے چکے میں سما جاتا ہے......

کچھ لوگ، اب بھی بس کا انتظار کر رہے ہیں۔ کچھ لوگوں کا دھیان بس سے ہٹ کر بچوں کی طرف ہوگیا ہے.... اور وہ... اسکول میں پڑھنے والے بچے بھی وزنی بستے کی وجہ سے جن کے کندھے جھکے جا رہے تھے، مسکراتے ہوئے ان بچوں، کو دیکھنے لگے ہیں۔ اور... یہاں سے ایک قدم کے فاصلے پر دھوپ آگ اگل رہی ہے...

کچھ لوگوں کی آنکھوں میں چمک ابھری ہے۔ کچھ زیر لب مسکرائے ہیں۔ کچھ اب بھی بس کے انتظار میں خود پر غصہ ہو رہے ہیں۔ اور بچے.... دونوں چھوٹے بچے، نہ ان کے چہرے پر کھیل دکھانے والی چمک ہے، نہ کھیل دکھا کر بس اسٹاپ پر کھڑے لوگوں کو لبھانے کی خواہش۔ احساس سے عاری چہرہ... کچھ بھی نہیں ہے وہاں۔ ہونٹ پر گرد کی پپڑی جم گئی ہے۔

"کھیل دکھا..."

ایک چکر دے کر چھوٹا بچہ تھم گیا ہے۔

بڑا پھر اسے پیر سے ٹھوکر مارتا ہے۔ چھوٹا زمین پر بیٹھ کر رونے لگتا ہے..

لوگوں کو اب کھیل میں مزا آنے لگا ہے۔ لوگوں کی دلچسپی بچے میں بڑھ رہی ہے۔ بڑا اسے سمجھانے آیا ہے۔ چھوٹے نے بڑے کو کوئی گالی دی ہے۔ بڑے نے کچھ کہا ہے۔ شاید کوئی سنجیدہ بات۔ اب چھوٹا اٹھ گیا ہے۔

اور......

اب بڑے نے گول چکے پر مٹی کا تیل انڈیل دیا ہے۔ جیب سے ماچس نکال کر جلایا۔ گول، دائرہ اب آگ اگل رہا ہے۔ بڑا چکا تھامے بچے کو اشارہ کرتا ہے۔ بچہ سر کے بل گرتا ہوا آگ کے گولے کے پاس ٹھٹھک جاتا ہے۔ اندر سمانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ لوگ ہنستے ہیں۔ پاس میں کھڑے اسکول کے بچے بھی ہنستے ہیں۔ بڑا اسے

غصے سے ڈانٹتا ہے۔

بس اب تک نہیں آئی۔ سورج کا گولہ آگ برسا رہا ہے۔ صرف۔ اس سائبان سے ایک قدم کے فاصلے پر جھلسا دینے والی دھوپ، آگ اگل رہی ہے اور تپتی، جھلستی زمین پر ان بچوں کا کھیل، چل رہا ہے۔

چھوٹا آتا ہے۔ ڈرتے، ڈرتے سر کے بل گرتا ہوا وہ آگ اگلتے دائرے میں سما جاتا ہے۔ ایک بار دو بار..... تین بار.....

اور جناب.....

کہانی ختم ہو گئی.....

آپ مانیے، مت مانیے کہانی ختم ہو گئی۔ اس درمیان صرف اتنا ہوا کہ بس آ گئی۔ لوگ پاگلوں کی طرح بس کی طرف دوڑ پڑے۔ چھوٹے نے کھیل بند کر دیا۔ ننھے منے میلے ہاتھوں کو پھیلائے وہ لوگوں کے پاس جانا چاہتا ہے.... لیکن بس آ چکی ہے..... اب بچے کی طرف کوئی بھی نہیں دیکھ رہا ہے۔ اسکولی بچے. جھٹ بس کے آگے والے گیٹ سے اندر چڑھ گئے ہیں۔

اور ......ان میں سے ہی ایک میں بھی ہوں خالی وقت، دوستوں میں شعر و شاعری جھاڑنے والا میں.... وقت، بے وقت خود کو اموشنل جذباتی چہرے کو، دوست یار کے سامنے ڈلانے والا میں......میں رکنا بھی چاہتا ہوں اور بس کے نکل جانے کا موہ بھی ہے۔ مجھے لگتا ہے، بس کسی مقناطیس کی طرح مجھے کھینچ رہی ہے....

.اور پھر وہی ہوتا ہے بچے کا دھیان چھوڑ کر میں بس کی طرف لپک لیتا ہوں۔

اور ...... کہانی ختم ہو گئی۔ بس کے ایک چھور پر لٹکے ہوئے میں نے دیکھا۔ بڑا کمبل "اوڑھا کر چکے کی آگ بجھا رہا تھا۔ چھوٹا بس میں سماتے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ بس جب چلنی شروع ہوئی تو دیکھا۔ دونوں بچے سڑک کراس کر رہے تھے۔

کیا اب بھی آپ کو یقین نہیں ہے کہ یہ کہانی ہے؟

○○

مردہ روحیں

مجھے بچپن سے ہی قبروں سے ہول آتا ہے۔ قبریں دیکھ کر ڈر جاتا ہوں۔ وہاں کی خاموش فضا، عجیب سی ویرانی، کچی پکی دھنسی ہوئی قبریں۔ اور کچھ گیلی تازی قبریں ....درختوں کے جھرمٹ سے سرسراتی ہوئی ہوا....آس پاس گھومتے ہوئے سور.....

"یہ سور قبرستان میں کیوں گھومتے ہیں....."

یاد ہے۔ ایک بار ایسی ہی ایک ٹوٹی ہوئی قبر سے .....ڈرتے ڈرتے اندر کی طرف جھانکا تھا ......پھر جیسے پورے بدن میں کپکپی سوار ہو گئی تھی۔ اس دن ہلکی سی بارش بھی ہوئی تھی۔ زیادہ تر قبریں بھیگی ہوئی تھیں۔ اور ایک عجب سی بدبو قبرستان میں رچ بس گئی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، وہ بو کئی دنوں تک پورے ہوش و حواس پر سوار رہی تھی۔ نیند میں بھی مجھ پر آوارہ روحوں کے حملے ہوتے رہے اور میں چونک کر جاگ اٹھتا۔

تحسین آپا کے گھر کے پچھواڑے ایسا ہی قبرستان تھا...... پچھواڑے کی کھڑکی ہمیشہ بند رہتی۔ میں جب بھی آتا تجسس کے پرندے کو آزاد کر کے وہ کھڑکی ضرور کھولتا۔ اف کیسا پر اسرار سناٹا۔ کیسی ویرانی۔ قبروں پر ادھر ادھر

گھومتے، لوٹتے ہوئے سور۔ اور اچانک طلسماتی کہانیوں کے ہیرو جیسا، بوڑھا۔ خمیدہ کمر والا کر مونظر آتا۔۔۔۔ ان سوروں کو بھگاتا، کسی دھنستی ہوئی قبر کو مٹی سے برابر کرتا۔

کہنا چاہیے، میں اسی خوف کے ماحول میں آگے بڑھا۔ ذرا سا ہوش سنبھالا تو ٹوٹی کنڈیوں، جھڑتی دیواروں، ذرا سا زور لگانے پر ڈول جانے والے دروازوں، بنا سپیدی والے، بارش کے موسم میں دعاؤں کے آسرے پر ٹکے مکانوں کو دیکھتے دیکھتے ۔۔۔۔۔ کسمپرسی کی زندگی کے کتنے ہی باب نگاہوں میں روشن ہو جاتے۔ تب بے رونق دیواروں پر یونہی نگاہیں جمائی ہوئی تحسین آپا ہوتیں، جو ذرا سی آہٹ یا دستک پر اس طرح چونک جاتیں جیسے کسی مظلوم پرندے کو انجانے خطرے کا احساس ہو گیا ہو! سوپ سے چاول چھانٹتی، پھٹکتی ہوئی اماں کے پاس چپ چاپ آکر تحسین آپا یوں بیٹھ جاتیں جیسے بے مونہا گائے، ہوں ۔۔۔۔۔۔ جنے کب کیسے مالک کے سپرد کیا جانا ہے پتہ بھی نہیں۔ اماں بس ذرا سی نگاہ اوپر اٹھاتیں۔ دھیرے سے کچھ بڑبڑاتیں ۔۔۔۔ تحسین آپا کو دو چار کوسنے دیتیں اور سوپ سے چاول پھٹکنے میں لگ جاتیں۔

تب ۔۔۔۔ اس گھر میں ایک شہید بابا رہتے تھے۔ اب بھی رہتے ہیں۔ ایسا ہم نہیں کہتے، اماں کہتی ہیں۔ جب سے ڈولی میں بیٹھ کر یہاں آئی ہیں، تب سے، بڑے بوڑھوں سے شہید بابا کا ذکر سنتی آئی ہیں۔ شہید بابا اس گھر کی حفاظت کرتے ہیں۔ اماں سے یہ پوچھتے ہوئے ڈر سا لگا، کہ شہید بابا آخر کس چیز کی حفاظت کرتے ہیں؟ یہاں تھا ہی کیا؟ قارون کا کون سا خزانہ یہاں دفن تھا؟ شہید بابا کے بارے میں کیسی کیسی کہانیاں مشہور تھیں۔ ان کے سر نہیں ہیں ۔۔۔۔ رات کے وقت پورے گھر میں گھومتے رہتے ہیں۔ ٹھیک بارہ بجے ان کی سواری نکلتی ہے ۔۔۔۔ کھڑاؤں کھٹکھٹاتے پورے گھر میں گھوم جاتے ہیں۔ بہت پہلے، ایک بار گھر میں سیندھ پڑی۔ چور آئے، پتہ نہیں کیسے شہید بابا کی موجودگی میں بھی ۔۔۔۔ شاید اس وقت وہ کھڑاؤں کھٹکھٹاتے کہیں اور چلے گئے ہوں گے۔ رات گئے جب کسی کی

کھٹ کھٹ گونجتی تو میں بستر میں دبک جاتا۔۔۔ اور تب سڑے ہوئے سرکنڈے والی چھت، بنا سپیدی والا مکان، اور کھٹ کھٹ ۔۔۔۔۔ سب مل کر مجھے ڈرانے بیٹھ جاتے۔ میں ابا کے خراٹے سنتا، اور تحسین آپا کی سہمی آنکھوں کو دیکھتا۔۔۔۔ جہاں بھٹکتی روحوں نے اپنا ڈیرہ جما لیا تھا۔۔۔۔

میں نے چہروں پر دھیرے دھیرے آنکھوں کو ٹکانا شروع کیا۔ مجھے چہرے پڑھنے میں مہارت حاصل ہونے لگی۔ میں ابا کا چہرہ پڑھ سکتا تھا۔۔۔ کہ یہ چہرہ کتنا کرخت ہے۔ چھوٹا قد، پھولی ہوئی ناک، گہرا سانولا رنگ، خطرناک حد تک چھوٹی آنکھیں۔ اماں کی چوڑی پیشانی۔ آنکھوں میں تیرتی خوف کی ناؤ۔۔۔ اور گھبرائی گھبرائی سی، گھر کے کسی کونے میں دبکی ہوئی تحسین آپا۔ یہ وہ وقت تھا، جب گلی کے لونڈے لپاڑوں میں میرے بچپن نے انگڑائیاں لی تھیں۔ موج دمستی کی کتاب کھلی تھی۔ گندے فقرے اچھالے گئے تھے اور ۔۔۔۔ سڑکوں کی دھول، آوارہ گردوں کی بھیڑ تھی۔ اور آنے والے کل کے نام پر لمحہ وجود میں بیٹھتا ہوا خوف تھا۔

پھر مجھے اچانک محسوس ہوا جیسے وقت بدل رہا ہو۔ اس بغیر سپیدی والے گھر کا سب کچھ بدل رہا ہو۔ وہ بھرے بھرے توند، سخت چہرے اور، بوٹے سے قد والا" جو میرا ابا تھا، جو کبھی رات میں دیر تک اماں کو اپنے کھردرے ہاتھوں سے پیٹتا رہتا تھا گالی بکتا تھا ۔۔۔۔۔۔ پھر لنگی الٹی کر کے، پیر موڑ کر کسی بے تاج بادشاہ کی طرح دھوتی مار کر بیٹھ جاتا اور رعب سے کھانے کی فرمائش کرتا۔۔۔ پھر اماں کا آدرش چہرہ ہوتا جو یوں کھانے کی تھال لے کر حاضر ہوتیں جیسے کچھ تو ہوا نہیں ہو ۔۔۔۔۔ پھر یہ بوٹے سے قد والا ابا سختی سے میری آنکھوں میں جھانکتا تو ان آنکھوں میں بھی ناراضگی کے کانٹے اگ آتے ۔۔۔۔۔ کہ دیکھو خبردار۔۔۔۔۔ اب اماں کو مت مارنا۔۔۔۔۔ اور پھر سچ مچ اس بوٹے قد والے نے وقت کے ساتھ سمجھوتا کر لیا۔ وہ اماں کو نہیں مارتا تھا۔ بلکہ کبھی کبھی تو تعجب ہوتا ۔۔۔۔۔ ڈیوڑھی میں نکلتی تین پائے والی چوکی پر ابا اماں دونو پاس پاس بیٹھے کسی سنجیدہ گفتگو کا حصہ بنے

ہوتے...... اور ...... تحسین آپا...... وہ اب بھی بڑے سرکنڈوں والی چھت اور دھول جھڑتی دیواروں کو بوجھل تک رہی ہوتیں۔

تب پہلی بار...... اندر سرگوشی کا ایک کیڑا جنما تھا۔

تم...... تم سب ایک قرض کی پیداوار ہو...... ذرا سوچو...... اگر تم اس دنیا میں نہ آئے ہوتے تو کہیں کیا کمی باقی رہ جاتی ...... یا تم نے کون سی کمی پوری کی؟ تب لگتا...... مجھے نطفہ سے جدا کرنے والا بلیڈ بھی ادھار کا رہا ہوگا...... جس نے دھیرے دھیرے میری کھال ادھیڑنی شروع کر دی تھی۔

پھر رفتہ رفتہ میں لونڈے لپاڑوں کی بھیڑ سے کٹتا چلا گیا...... سرکاری ملازمت کی ایک چھوٹی سی ڈور میرے ہاتھ میں تھی اور تبدیلی کا ایک سرکش گھوڑا تھا جس کی زین میرے ہاتھوں میں تھی اور جسے میرے اشاروں پر بھی بھاگنا تھا۔ ابا کی جگہ ان کی جھڑپ کے قصے تھے۔ تین پائے والی چوکی پر اداس اداس سی اماں کا تنہا جسم تھا اور تحسین آپا تھیں۔ جو اپنی سسرال میں بھی، ویسے ہی چپ کے روزوں کے ساتھ موجود تھیں...... یعنی بدلنے پر بھی کہیں کچھ نہیں بدلا تھا۔ صرف اس سرکاری نوکری کے، جس نے ان دو آنکھوں میں مزید دیکھنے کے لیے سو سو آنکھیں پیدا کر دی تھیں۔

کبھی کبھی سوچتا، کل، آج کی اس تبدیلی کو تحسین آپا میں بھی دیکھوں ...... پوچھوں...... خوف سے اب تک تم الگ کیوں نہیں ہو سکیں تحسین آپا...... اب ...... اب تو گھر بھی بدل گیا ہے ...... پھر لگتا، تحسین آپا نے خوف کی دھند سے کوئی مسکراہٹ چرالی ہو...... لگے، کبھی کچھ نہیں بدلتا۔ کیا؟ کچھ نہیں بدلتا...... سب ویسے کا ویسا رہتا ہے...... میرے لیے صرف گھر بدلا ہے۔ آزمائش وہی ہے...... امتحان وہی ......

اور...... میں اسی پچھواڑے چلا آتا۔ کھڑکی کھولتا...... قبروں کی قطار کو غور

سے دیکھتا۔۔۔ چھوٹی بڑی، کچھ پکی، دھنسی، ٹوٹی قبر ۔۔۔۔ سرسراتی ہوا۔ ہلتے ہوئے درخت۔۔۔۔۔ سوروں کو ہکاتا ہوا کرمو۔۔۔۔ اور ۔۔۔۔ یہ سور قبرستان میں کیوں گھومتے ہیں؟

میں کرمو کو دیکھ رہا ہوں۔ جو ایک پرانی دھنسی ہوئی قبر کو برابر کرنے میں لگا ہے۔ ہاتھ میں کدال۔ آدھا دھڑ مٹی اور دھول میں سنا ہوا۔ چہرے پر عمر کی بڑھتی لکیروں کی جھریاں۔ اور قبر تھوڑی اونچی ہوئی ہے۔

منا بابو۔۔۔۔

اس نے میری طرف دیکھا۔۔۔ پاس ہی اس کی جھونپڑی ہے۔ باہر کھاٹ پڑی ہے۔ اسی کھاٹ پر بیٹھ گیا ہوں۔ ہاتھ پیر دھونے کے بعد کرمو نے وہیں آلتی پالتی مار کر بیڑی سلگالی ہے۔۔۔۔

"کرمو ۔۔۔۔ یہ ساری زندگی تمہاری۔۔۔۔ انہی قبروں کے درمیان گزر گئی۔۔۔ نا ۔۔۔۔ یعنی نئی قبروں کے کھودنے ۔۔۔۔۔ اور پرانی قبروں کو ۔۔۔۔ برابر کرنے میں ۔۔۔۔"

"ہچ۔۔۔اس نے ڈکار لی ۔۔۔۔ ایسے دیکھا۔۔۔۔ جیسے پوچھ رہا ہو۔۔۔۔ بابو۔۔۔۔ مدتوں بعد، یہ احمقانہ، مہمل ۔۔۔۔۔ بے معنی اور بچوں جیسا سوال ۔۔۔۔ تمہارے ہونٹوں پر کیوں آیا ہے۔۔۔۔۔ ہچ۔۔۔ یہاں تو ایک قبر میں جانے کتنے کتنے لوگ دفن ہیں۔ اور یہ سلسلہ تو یونہی چلتا رہے گا۔۔۔۔ وہ مسکرایا ہے۔۔۔۔ آنکھوں میں گڑے مردے چل رہے ہیں، دوڑ رہے ہیں ۔۔۔۔ منا بابو۔۔۔۔۔ کل ہم تم نہیں رہیں گے پھر کون جانے۔۔۔۔ ان قبروں میں رہنے والے کو کون کب تک یاد رکھے ۔۔۔۔ کسی کی قبر میں کوئی دوسرا آجائے۔۔۔ یہ سب ۔۔۔۔ہچ۔۔۔"

بیڑی پیتا ہوا کرمو کتنا خوف ناک لگ رہا ہے... جیسے ابھی اٹھے گا... کسی روح کی طرح... پھر کسی قبر میں اتر جائے گا... پیڑوں کے پتے ہلتے ہیں۔ ہوا سائیں سائیں کرتی ہے...

تحسین آپا پھر سامنے کھڑی ہو گئی ہیں۔۔۔اس دن پہلی بار لگا تھا، تحسین آپا نے اپنا آپ سمیٹ کر برسوں سے اندر بوند بوند کر جمع ہو رہے زہر کی جگالی کر دی ہو۔۔۔

میں چپ کیوں رہتی ہوں... تم یہی جاننا چاہتے ہو نا... تو سنو منا... لگا، ایک مردہ روح بول رہی ہے... روح، جس نے خوف کے کپڑے اچانک ہی خود سے جدا کر دیے ہوں... لڑکی ہوں نا... تم تو بچپن سے دیکھ رہے ہو... پہلے بے مونہا گائے تھی... گائے تھی جسے بولنا نہیں آتا تھا۔ نہ گھر والوں نے سکھایا۔ منا، تم غلط تو نہیں سمجھ رہے ہو نا... وہی جو میں کہنا چاہ رہی ہوں، سمجھ رہے ہو نا؟ میں بے مونہا گائے تھی اور گھر میں تھے ابا۔ قصاب کی طرح ایک چابک جن کے ہاتھ میں تھا۔ اور اس چابک کا مطلب تھا... تم ایک بے مونہا جانور ہو... بے زبان... جسے ہر ظلم سہنا ہے۔ اور اف تک نہیں کرنا ہے... جسے اپنوں سے پردہ کرنا ہے... جس کے دروازے باہری دنیا کی ہر چکاچوند کے لیے بند ہیں۔ کیا میں اس ماحول میں زندہ تھی منا؟ سچ کہنا اور کیا اب۔۔۔ زندہ ہوں۔۔۔ بتاؤ...

آپا کی آنکھیں ان آنکھوں پر ایسے ٹکتی ہیں، جیسے کبھی نہیں ہٹیں گی... آپا.. میں حیرت سے ان کا چہرہ تکتا ہوں... ان آنکھوں میں کرمو کیوں اتر رہا ہے... اور ڈھیر ساری روحیں...

سنو منا۔۔۔ آواز پھر حملہ کرتی ہے... میرے... میرے بچے نہ ہوتے تو... میں اس کا قتل کر دیتی... کیونکہ اپنے لیے، اب... میرا زندہ رہنا ضروری ہے... وہ سمجھتا ہے جیسے میری ذات پر حکومت کرتا ہے۔ حرامی...

جیسے اچانک کسی زلزلے سے بدن کی پوری عمارت ہل گئی ہو۔ آپا اور گالی۔۔۔ آنکھوں میں بس حیرت ہی حیرت تھی۔ اور ۔۔۔ آپا اٹھ کر اب کھڑکی کے پاس کھڑی ہو گئی تھیں... اور کھڑکی سے باہر قبرستان کو تک رہی تھیں ۔۔۔ میں آہستہ آہستہ ان کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ لیکن آپا کو پتہ تک نہیں چلا۔ میں نے دیکھا۔۔۔ کرمو کسی کی قبر کھودنے میں لگا ہے... اور آپا اسے بغور گھور رہی ہیں۔ اور

عجیب انداز میں اسے گھورے جا رہی ہیں۔۔۔

اس کے بعد بھی میں وہاں تین چار دن تک رہا ۔۔۔ اور اس بیچ میں نے کتنی ہی بار دیکھا۔ آپا جب بھی اپنے کاموں سے تھک جاتیں، تھک کر وہ اسی پچھواڑے والی کھڑکی کے پاس کھڑی ہوجاتیں۔۔۔ پھر وہ دیر تک قبروں کو گھورتی رہتیں۔

جانے سے ایک دن پہلے مجھے سلامت بھائی نے خوفزدہ کرنے والے انداز میں بتایا۔ تم نے محسوس کیا، تمہاری آپا پر کسی بد روح کا سایہ ہے؟

نہیں تو۔۔۔

تم نے اس کی آنکھیں نہیں دیکھیں؟

آپ مکان کیوں نہیں بدل لیتے ۔۔۔ یہاں قبرستان...

سلامت بھائی نے قہقہہ لگایا ۔۔۔ بھائی، آنا تو سب کو ایک دن یہیں ہے ۔۔۔ پھر ڈرنا کیا؟

جاتے وقت آپا نے ڈرتے ڈرتے میری طرف دیکھا تھا ۔۔۔ سنو، کچھ پیسے ہیں تمہارے پاس؟ رہنے دو.... ہزار... پانچ ہزار ۔۔۔ یہ چھوٹا موٹا کوئی بزنس کرنا چاہتے تھے۔ بہتر ہے... مت دو... سنو... جذباتی بن کر بھیج مت دینا...

آپا ۔۔۔ غور سے آپا کی آنکھوں میں دیکھا۔ سوچا کہوں... تم IMMUNE ہوتی جا رہی ہو آپا ۔۔۔ ایڈز کی طرح ، کینسر کی طرح، جب جسم پر کوئی دوا اثر نہیں کرتی... بیکار ہوجاتی ہے... اس طرح خود کو IMMUNE مت کرو ۔۔۔ اس طرح تو تم مر جاؤ گی آپا... ٹکڑے ٹکڑے... چپ چپ... ایک بے رحم موت...

لیکن آپا اچانک ہنس دیں۔ ڈرو مت اب میرے سینگ ہیں۔ جیسا تم سوچ رہے ہو... اب ویسا نہیں ہے... جانتی ہوں، سینگ بلانے کی قیمت بھی مجھے چکانی پڑ سکتی ہے... لیکن ڈرو مت آرام سے جاؤ ۔۔۔ جاؤ خدا حافظ ۔۔۔

جانے یہ سب کیا تھا، جس نے بہت دنوں تک مجھے چونکائے رکھا تھا۔ آپا

اور سینگ؟ پھر یہ سینگ اچانک ان کے خطوط میں نمودار ہو گئے مجھے حیرت تھی... لیکن یہ سینگ اب صاف صاف دکھائی دے رہے تھے... ایک بار آپا نے لکھا... بچارہ کرمو... وہ کرمو سے بہت ہل مل گئی تھیں۔ وہ قبرستان سے گونتھ کر ہار بھی اسے دینے لگا ہے... سلامت بھائی بگڑے تھے... پھینک دو اسے ... قبرستان کی کوئی چیز گھر میں مت لایا کرو..... ان پر روحیں سوار ہوتی ہیں..... آپا نے لکھا تھا، اب اس سے روز ہی ہار لے کر ان کے سرہانے رکھ دیتی ہو، روز ہی سلامت بھائی سے ان کا جھگڑا ہوتا ہے......

پھر آپا نے ایک دوسرے خط میں لکھا۔ سلامت بھائی ایک دن جھاڑ پھونک کرنے کے لیے ایک مولوی صاحب کو لائے تھے..... آپا نے ڈانٹ کر بھگا دیا.... غصے میں سلامت بھائی نے ان پر ہاتھ اٹھانا چاہا.... بدلے میں آپا نے بھی.... آپا نے ہنستے ہوئے لکھا تھا.... تمہارے دولہا بھائی سمجھتے ہیں، مجھ پر جنات سوار ہے ....ورنہ میری اتنی ہمت کہاں۔ وہ روز ہی پیر فقیر کے چکر میں رہنے لگے ہیں .... اب مجھ پر ہاتھ اٹھانے سے گھبراتے ہیں.... عجب عجب نظروں سے مجھے دیکھتے ہیں.... مجھ سے آنکھیں ملاتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں.... اپنا بستر بھی الگ کر لیا ہے ...... بچوں کو بھی مجھ سے الگ کر لیا ہے.... مگر ....

آپا نے آگے لکھا تھا "منا!، میں بھوت ہو گئی ہوں ..... کرمو بچارہ اللہ کو پیارا ہو گیا.... اب کوئی ہار گوندھ کر نہیں دیتا مگر ..... کوئی بات نہیں۔ اب میں کافی ہوں ..... ان کا عقیدہ مضبوط ہوتا جا رہا ہے کہ مجھ پر بد روح کا سایہ ہے، وہ جب ڈرتے ہیں تو میں بھی طرح طرح سے انہیں ڈرانے کی کوشش کرتی ہوں .... کبھی آواز بدل کر، ڈراونے پنجے بنا کر، آنکھیں نکال کر ..... وہ دیوار سے ٹکراتے ہیں۔ میں ہنس پڑتی ہوں ....اور ..... اب وہ طلاق کے لیے .... چلو! اچھا ہے.... قید خانے میں جتنے دن رہو..... دم گھٹتا ہے منا .... مجھے کوئی غم نہیں۔ مجھے صرف اس چہار دیواری سے باہر نکلنا ہے۔ بچوں کا کوئی نہ کوئی انتظام میں خود

کر لوں گی جانتی ہوں، ابھی ان کا اتنا حوصلہ نہیں کہ بچوں کو اپنے پاس رکھ سکیں۔۔۔ ہاں ان سے یہ حوصلہ چھین کر میں نے اپنی قوت بڑھائی ہے۔ اب میں گھٹنوں بال کھولے قبرستان کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے پاس کھڑی رہتی ہوں۔۔۔۔ اور۔۔۔۔

سنو منا! ۔۔۔۔۔۔ اگر اچانک کسی دن اپنے بچوں کے ساتھ تمہارے سامنے آجاؤں تو حیران مت ہونا۔۔۔۔ کوئی اپدیش مت دینا۔۔۔ میرے لیے دکھی بھی مت ہونا۔۔۔ ہاں اتنا ضرور ہے، تم پر بوجھ نہیں بنوں گی۔ تمہارے یہاں زیادہ نہیں ٹھہروں گی۔۔۔ سوچ لیا ہے۔۔۔۔۔ بس کچھ دن۔ ہاں کچھ دن۔۔۔ اس کے بعد کوئی نہ کوئی راستہ نکال کر بچوں کو لے کر چلی جاؤں گی۔ ہاں سنو۔۔۔ ایک بات غور سے سنو۔۔۔۔۔۔

مجھے لگا، آپا اچانک اپنی قبر کی خول کی باہر سے نکل کر میرے سامنے کھڑی ہو گئی ہوں ۔۔۔۔ اور دھند میں بسرے خوف سے خود کو مکت کر کے کہہ رہی ہوں۔

"سنو! ہم کوئی مردہ روح نہیں ہیں ۔۔۔۔۔ ہم تو زندہ ہیں ۔۔۔۔ زندہ ۔۔۔۔ تو یہ احساس ہمارے اندر کیوں نہیں رہنے دیا جاتا۔۔۔۔ سنو کچھ بدلتا ہے، ٹوٹتا ہے۔۔۔۔ تو اس کا آکار اور روپ بھی بدلتا ہے۔۔۔۔ تم چپ رہے تو تم بھی مردہ روح ہوئے ۔۔۔۔ ہے نا ۔۔۔۔ تو جو بدل رہا ہے۔۔۔ یا بدلنے والا ہے ۔۔۔۔۔ اسے خوش آمدید کیوں نہیں کہتے ۔۔۔۔ کیوں نہیں کہتے تم لوگ ۔۔۔۔۔؟"

○○

وہاں دیوار پر / جو پینٹنگس آویزاں ہیں /
نہیں، میں ان کے مطلب نہیں پوچھ رہا
نہیں، مجھے یہ جاننا ہے کہ وہ کون ہے /
جس نے دیوار کو بھی گمراہ کیا ہے۔

......ل۔ چیانگ کی ایک نظم 'پینٹنگس' سے

یہ
جدید لب و لہجہ کی کہانیاں ہیں،
جنہیں میں نے ردّ کیا۔

دابتہ الارض

"البتہ تو نہیں سنا سکتا مردوں کو اور نہیں سنا سکتا بہروں کو اپنی پکار جب لوٹیں وہ پیٹھ پھیر کر۔ اور تو نہیں دکھا سکتا راہ اندھوں کو جب وہ راہ سے بھٹکیں۔ تو تو سناتا ہے اس کو جو یقین رکھتا ہے ہماری باتوں پر۔ سو وہ حکم بردار ہیں اور جب پڑچکے گی ان پر بات تو ہم نکالیں گے ان کے آگے ایک جانور۔ جو ان سے باتیں کرے گا۔ اس واسطے کہ لوگ ہماری نشانیوں کا یقین نہیں رکھتے۔"

(سورہ نمل۔ آیات ۱۰۶۔۱۰۸)

ایسا کئی دنوں سے ہو رہا تھا بلکہ اگر سچ پوچھا جائے تو آسمان پر دھوئیں کے بادلوں کے پھیلنے کا یہ قصہ صدیوں سے چلا آ رہا تھا۔ کبھی آسمان کوؤں سے ڈھک جاتا۔ اور کبھی منحوس ابابیلیں اپنی چادر اجلے شفاف آسمان پر ڈال دیا کرتیں اور سارا شہر تاریکی میں ڈوب جایا کرتا۔ شمال اور جنوب کے علاقوں سے تیز چیخوں کی آوازیں ابھرتیں اور دھوئیں میں لپٹے آسمان پر ایک سرخ لکیر نمودار ہو جایا کرتی۔ اور جیسا کہ لوگ کہتے چلے آئے تھے کہ وہاں وہ غیر مہذب قومیں بسا کرتی ہیں۔ ستیزہ کاری جن کا شیوہ ہے اور وہاں سے آہ و بکا اور شیوہ و نالن کا شور شہر کی مختلف آبادی والے علاقوں میں گونجا کرتا۔ اور اس بیچ رہ رہ کر ارباب نشاط کے شور اٹھتے۔ اور یہ نقرئی بو جھل شور جھول بنتے ہوئے جسموں میں سما جایا کرتے۔ اور جسم کھوکھلا ہوتا جاتا۔

اور جیسا کہ لوگ کہتے ہیں۔ دھوئیں میں لپٹے آسمان پر جب بھی وہ سرخ لکیر نمودار ہوتی۔ زمین چیخنے لگتی۔ آسمانی عذاب سے ڈر کر اندر کی جانب دھنسنے لگتی۔ اور لوگ بتایا کرتے کہ ایسے موقعوں پر ان کے چہرے مسخ ہو جایا کرتے۔ آنکھیں اندر دھنس جایا کرتیں۔ شہر میں گھپ اندھیرا پھیل جاتا۔ اور آسمان کی جانب سے پتھروں کی یلغار شروع ہو جاتی۔ اور مسخ چہرے آبا واجداد کو اپنے گناہوں کا ثمرہ سمجھ کر ان پر گالیوں کی بوچھاریں کرنے لگتے۔ اور تب۔ سونی ویران عبادت گاہوں سے ابوالہول کا بت چپکے سے نکلتا۔ اور تاریکی کا فائدہ اٹھاتا ہوا شہر کی آبادی والی سڑکوں پر معلق ہو جاتا۔ لوگ باگ ڈر کر اپنے اپنے گھروں میں جا چھپتے۔۔۔ کنڈلیاں لگا دیتے۔ کھڑکیوں پر شیشے آویزاں کر دیتے۔ اور خوف سے تھر تھر کانپتے ہوئے اپنے بستروں پر جھول بن کر گر پڑتے اور باہر سے کاروان ارباب نشاط کے شور لمحہ لمحہ اپنی وسعت کو چھوتے جاتے۔ اور سارا شہر باجوں کی آوازوں میں گھر جاتا۔

ایسا کئی دنوں سے ہو رہا تھا بلکہ اگر سچ پوچھا جائے تو آسمان پر دھوئیں کے پھیلنے کا یہ قصہ صدیوں سے چلا آ رہا تھا۔ شمال اور جنوب سے بلند ہوتی ہوئی چیخیں رفتہ رفتہ اپنا رنگ دکھا رہی تھیں اور شہر کی مختلف آبادی والے علاقوں میں غیر مہذب قومیں بسنے لگی تھیں۔ آسمان کی وسعت پر پھیل رہی لہو کی سرخی اب دنوں دن گہری اور عمیق ہوتی جا رہی تھی۔ اور ایسا احساس تو سب کو ہونے لگا تھا کہ ان کے آگے ایک خوفناک آگ کا سمندر ہے۔ جو ان کی لہو رنگ تاریخ کے ابواب کو دیکھ کر ہر پل بھیانک صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔

اور ایسا یقین تو سب کو تھا کہ یہ آگ کا سمندر ایک دن سب کو نامعلوم سمتوں میں بہا کر لے جائے گا۔

اور آگ روشن ہوئی جا رہی تھی۔ اور جب جب دھواں آسمان پر پھیلنے لگتا۔ خون کی ایک سرخ موٹی لکیر وہاں نمودار ہوتی اور ابوالہول کا بت تنہائی اور تاریکی

سے ہوتا ہوا شہر کی آبادی والی سڑکوں پر نکل آتا۔ تب سڑکوں پر افراتفری بچھ جاتی۔۔ اور شناسائی جیسے ہر پل دھندلاتی ہوئی معلوم ہوتی۔ لوگ باگ ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکا کرتے تو وہاں سوائے مبہم دائروں کے اور کچھ بھی نظر نہ آتا۔ اور گرد و نواح سے اٹھتے ہوئے بوجھل شور آسمان کی وسعتوں پر پھیلتے جاتے۔

اور یہ سب کچھ معمول کے مطابق چل رہا تھا۔

مگر ایک دن شہر والوں نے دیکھا۔ جب آسمان پر دھواں چھایا اور سرخ لکیر نمودار ہوئی تو تنہائی اور تاریکی سے ہوتا ہوا ایک بوڑھا ایک بڑے دابہ پر بیٹھا ہوا سڑک پر نکل آیا۔ بوڑھے کے کپڑے پھٹے تھے۔ آنکھوں میں بے گانگی کے آثار تھے۔ گویا دنیا جہاں سے اسے کوئی مطلب ہی نہ ہو۔ اس نے ایک عجیب و غریب باجہ تھام رکھا تھا۔ جس کو بجاتا ہوا وہ ویران سڑک سے گزر رہا تھا۔ آسمان لہو سے اب بھی نہایا ہوا تھا۔ لوگ باگ اپنے گھروں میں سمائے ہوئے تھے۔ اور چھیدوں اور سوراخوں سے اس نیم پاگل بوڑھے کو تک رہے تھے۔ جو اپنے ہاتھوں میں پکڑا ہوا عجیب و غریب باجہ بجاتا ہوا، بڑے آرام سے دابہ پر بیٹھا ہوا مختلف شاہراہوں سے گزر رہا تھا۔ لوگ حیرت سے اس کی جانب دیکھ رہے تھے۔ کہ بوڑھا پاگل ہو گیا ہے۔ آسمانی پتھراؤ کا اسے ذرا بھی ڈر نہیں۔ اور نہ ہی سڑکوں پر چپکے سے نمودار ہونے والے ابوالہول کا ہی ڈر ہے۔

شاید بوڑھا پاگل ہو گیا ہے۔ یا اپنی حسوں کے جال سے باہر نکل آیا ہے؟ یا آدمیت کے احساس والی کینچلی کو پھینک آیا ہے؟

کچھ یہی خیالات تھے جو لوگوں کے اندر پیدا ہو رہے تھے۔ بوڑھے کو تنہا سڑک پر دیکھ کر تنہائی اور تاریکی کا ڈر لوگوں کے دلوں سے نکلنے لگا تھا۔۔۔ کھڑکیاں کھلنے لگی تھیں۔ بند دروازے ایک ایک کر کے کھل رہے تھے۔ اور لوگوں کا جم غفیر پل میں سڑک پر نکل آیا تھا۔

اب بوڑھا سیکڑوں ہزاروں لوگوں کے نرغے میں تھا۔ اور اپنی حیران کن

آنکھوں سے لوگوں کو گھورے جا رہا تھا۔

"تمہیں ڈر نہیں لگتا کہ تم آوازوں کے جنگل میں ہو؟"

"تمہیں آسمانی پتھراؤ کا بھی ڈر نہیں۔۔۔۔"

"اور تنہائی میں چپکے سے سڑکوں پر نکلنے والے ابوالہول کا۔۔۔؟"

بوڑھا سوالوں کے دائرے میں اب بھی گونگا بنا ہوا تھا۔ اور اپنی ویران آنکھوں سے لوگوں کو گھورے جا رہا تھا۔ اس کی گول گول پتلیاں آہستہ آہستہ سکڑ رہی تھیں۔

اور لوگوں کو ایسا احساس ہو رہا تھا جیسے بوڑھا ان سے کہہ رہا ہو.... "یہ ابوالہول کا بت تو تمہاری اپنی ایجاد ہے جو تمہاری سوچوں کی تنگ نظری کے باعث وجود میں آیا ہے۔ آسمان پر پتھراؤ تو تم کرتے ہو۔ اور آسمان پر بیٹھا ہوا وہ اس وقت تک ان پتھروں کو روکے رہتا ہے جب تک کہ وہ سنبھال پاتا ہے۔ پھر وہ تمہاری جانب سے پھینکے گئے لاتعداد پتھروں کی یورش سے گھبرا کر ان پتھروں کو تمہارے حوالے کر دیتا ہے۔۔۔۔"

لوگ اب بھی ششدر کھڑے تھے۔ تاریکی اب بھی ویسی کی ویسی تھی اور بوڑھا اب بھی اپنے گونگے پن میں کہے جا رہا تھا....

"آسمان میں سرخ لکیریں تم پارتے ہو.... زمینوں کو تم سرخ کرتے ہو.... اپنی چیخوں اور بوالہوسی کا دھواں تم چھوڑتے ہو.... اور تمہاری لہو رنگ داستانوں کی پوٹلی ہم کیا کھولیں۔ تم خود ہی سب کچھ دیکھ کر سمجھ سکتے ہو۔ اگر تم ایسا نہیں کرتے تو یہ سرخ لکیر آسمان میں کبھی نظر نہ آتی.... اور آسمان دھوئیں کے بادلوں سے کبھی نہ بھرتا۔ اور تم نے ہی اپنے اندر کی تنگ نظری کے باعث۔ اپنے اندر چپ بیٹھے ہوئے زرداں کو بیدار کیا ہے...."

بولو........!

بولو........!

بوڑھا دابہ کے ساتھ لپٹا ہوا خاموش تھا۔ اوز سوالوں کے عریاں جوابات لوگوں کے جسم سے چمٹ گئے تھے۔ اور ان کے زنگ لگے احساسوں والا آکٹوپس ان کے ارد گرد اپنا کساؤ تنگ کر رہا تھا۔ گھبرا کر ان لوگوں نے دوبارہ بوڑھے کی آنکھوں میں جھانکا اور اس کی آنکھوں کی گول گول پتلیوں کو بغور دیکھا۔ اور متعجب ہوئے کہ اس کی آنکھوں میں ان کی اپنی شناخت گم ہو گئی تھی۔

اور تب وہ لوگ گھبرائے۔ اور ایک دوسرے کی جانب دیکھ کر گویا ہوئے۔

"بوڑھا دابہ کے ساتھ رہ کر اپنی پہچان بھول گیا ہے۔"

"یا بوڑھا دابہ میں اپنی پہچان تلاش کر چکا ہے۔"

"یا دابہ میں بوڑھے کی اپنی پہچان کھو گئی ہے۔"

اب بس جھوٹی تسلیاں رہ گئی تھیں جو وہ لوگ اپنے آپ کو دے رہے تھے۔ اور بوڑھے کے متعلق طرح طرح کی رائے قائم کر رہے تھے۔ شاید ایسا سوچ کر وہ اپنے معصوم سوالوں کے زہریلے جوابوں سے پرے ہو جا رہے تھے۔ اور کسی قدر اپنی گم ہوتی ہوئی شناخت کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر بوڑھا اب بھی خاموش تھا۔ مگر اس کا خاکہ اب دھندلا پڑتا جا رہا تھا۔ شاید تاریکی کے بیچ سے سورج دوبارہ نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور اس سے پہلے کہ کرن نمودار ہو اور اجالا پھیلے۔ بوڑھا اپنی جگہ سے دابہ سمیت غائب ہو چکا تھا۔

وہ لوگ اپنی جگہوں پر ششدر کھڑے تھے۔ پہلی بار انہیں ایسا احساس ہوا تھا کہ وہ اندر سے بالکل ٹوٹ گئے ہیں۔ ٹوٹ تو وہ کئی صدیاں پہلے سے ہی گئے تھے۔ اور اپنے آپ کو شہر کی بے ہنگم فلک بوس چیخوں کے حوالے کر دیا تھا۔

آسمان شفق رنگ ہو گیا تھا۔ سہمے ہوئے لوگوں کا قافلہ شہر کے اس کھلے وسیع و عریض میدان میں اپنے وجود کو نیلگوں آسمان کے دھندلکے میں بکھرا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ اور سب کے ہونٹوں پر بس یہی سوال رہ رہ کر مچل رہا تھا ..... وہ بوڑھا کون

تھا؟ کہاں سے آیا تھا اور کہاں گم ہو گیا تھا....؟

لوگوں میں بے چینی کے جراثیم پھیل گئے تھے۔ سوال اپنی جگہ برقرار تھا۔ تب ایک باریش نورانی صورت والے بزرگ چند قدم آگے بڑھے۔ آسمان کی جانب دیکھا۔ اور لوگوں کے سہمے چہروں کو ٹٹولا.....اور اپنے پرکھوں سے سنی ہوئی روایت کو دہرایا......وہ بوڑھا آسمان سے آیا تھا.....ہماری بولیاں ہمیں واپس کرنے۔"

تب سب چونکے اور کہا۔ کہ ہماری بولیوں میں تو زہر بھرا تھا تو کیا ہم سب...؟

باریش نورانی صورت بزرگ نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ مترحم نظروں سے ان کی جانب دیکھا اور دوبارہ گویا ہوا.....

"ہاں۔ میرے عزیزو! افسوس کہ یہ سچ ہے۔ ہماری بولیوں میں جو زہر تھا وہ ہمیں واپس مل گیا تو ہم اپنی زہریلی بولیوں کی تاب نہ لاسکیں گے.....اور روایت تو یہی ہے کہ وہ بوڑھا.... آسمان پر بیٹھا ہوا برسہا برس سے.....جب سے کہ دنیا قائم ہے.....ہماری بولیاں.....ہماری چیخیں.....ہماری ننگی ہوتی ہوئی تہذیب کی شرمناک تصویریں.....ہماری گراوٹ.....ہماری بوالہوسی میں جھلسا ہوا مسخ چہرہ..... ہماری ختم ہوتی ہوئی شناخت کی دھندلی تصویریں.....سب کچھ عرصہ دراز سے جمع کرتا چلا آرہا تھا.....اور پھر....."

ہمارے پرکھے بتایا کرتے تھے ــــ کہ جب وہ بوڑھا ہماری چیخوں اور گرتی ہوئی تہذیب کی دیواروں کو سنبھال سکنے میں معذور ہو جائے گا.....تو ہماری غلاظت کی پوٹلیاں لے کر ہماری بولیاں واپس کرنے وہ آسمان سے اچانک دابہ کے ساتھ نازل ہو گا.....اور ہماری بولیاں ہمیں سونپ کر دوبارہ آسمانی سرنگ میں غائب ہو جائے گا.....

بوڑھے نے ٹھنڈی سانس لی۔ سب چونک کر اور خوف سے سہم کر اس کی جانب دیکھنے لگے۔ ان کے بدن کانپنے لگے تھے۔ اور آنکھوں کے آگے دھندلا اندھیرا

چھانے لگا تھا۔ لگاتار بولنے سے بوڑھے کی آواز بیٹھ گئی تھی ..... وہ قدرے رکا اور دوبارہ بھیڑ کو اپنی خوفزدہ پتلیوں سے گھورتا ہوا بولا......

"اور میرے عزیزو! روایت ہے کہ جب وہ آسمانی بوڑھا ہماری بولیاں ہمیں واپس کر کے خلاء میں گم ہو جائے گا تو شناسائی کا پرندہ بھی بوکھلا کر ہمارے درمیان سے پھڑپھڑاتا ہوا فضا میں پرواز کر جائے گا.....

بزرگ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے تھے۔ سر کو جھکا لیا تھا۔ اور ایک طویل چپی اختیار کر لی تھی۔

بوڑھے کی دیکھا دیکھی سب نے وہی کیا۔ سب خاموش ہو گئے۔ سروں کو جھکا لیا۔ اور اس سوچ میں گم ہو گئے کہ شاید طویل اور ختم نہیں ہونے والی چالیس چلتے چلتے ان پر تھکان حاوی ہو گئی ہے۔

پھر باریش بزرگ خاموشی سے بغیر کچھ کہے ایک جانب کو چل دیا۔ سب اپنی اپنی جگہوں سے ہلے اور مختلف سمتوں میں بٹ گئے سب کو اپنی اپنی بولیاں چھننے کا افسوس تھا۔

دوسرے دن کا آسمان معمول سے کچھ زیادہ ہی تاریک تھا.... لوگ اپنے کھوئے ہوئے چہروں کے ساتھ سڑکوں پر نکل آئے تھے۔ ان کے جسم جھول رہے تھے۔ اور آنکھیں بے حس ہو کر خلاء میں ٹنگی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ لوگ باگ ایک دوسرے سے باتیں کرنا چاہ رہے تھے تاکہ فرسودہ روایت کو چاک کر کے ان کے قد اور طویل ہو سکیں۔ اور بوڑھے کی بھوشیے وانی غلط ثابت ہو سکے۔ مگر آوازیں منہ سے باہر نہیں آ رہی تھیں۔ اور نہ ہی آنکھوں میں شناخت کی پرچھائیاں ہی اتر رہی تھیں۔

یہ یقین تو شہر کے لوگوں کو بہت پہلے ہی ہو گیا تھا کہ ایک دن سارے لوگ اپنی بولیاں بھول جائیں گے اور جانوروں میں اپنی بولیاں تلاشیں گے۔ کیونکہ جب

ان کی پرانی بولیاں انہیں واپس مل جائیں گی تو آدمیت کے رشتے میں زنگ لگ جائے گا اور تب شناسائی کی شناخت ماند پڑجائے گی....اور تب سب کے سب دابہ میں اپنی وفاداری ڈھونڈھیں گے۔ اسی میں اپنی بولیاں تلاشیں گے.......اسی میں اپنی پہچان ڈھونڈھیں گے....

شہر کے لوگ سڑکوں پر ضرور نکل آئے تھے۔ مگر اب بھی وہی بے حسی تھی۔ چمڑے کی زبانیں سوکھی ہوئی تھیں۔ آنکھوں کے آگے بس تاریکی کا غلاف تھا اور سب کو دابہ پر بیٹھا ہوا وہ بوڑھا دکھائی دے رہا تھا۔

اور سب کی نظروں میں اس وقت صرف دابہ تیر رہا تھا۔

دابہ ......جو نجات کا راستہ تھا۔

دابہ ....جو اپنے ختم ہوئے "میں" کو پانے کا واحد راستہ تھا۔

دابہ ہی مفلوج احساس کے رشتے کو دوبارہ بحال کرسکتا تھا۔ اور باجہ ان کے مفلوج احساس کا رشتہ یخ بستہ ذہن سے منقطع کرسکتا تھا۔ اور اپنے آپ کو بھول جانے کا ان کے سامنے بس یہی راستہ رہ گیا تھا۔ اپنی سمت متعین کرتے ہوئے باریش بزرگ نے ایک ٹھنڈی سانس لی....اور سوچا..."کیا شناخت کے گم ہونے کے بعد جنگیں نہیں ہوں گی؟ آسمان سرخ نہیں ہوگا؟ دھویں کا بادل شہر میں نہیں منڈلائے گا؟....؟

اور ایسے ہی متعدد سوالات تھے جو اس کے ہونٹوں پر بیک وقت رینگ گئے۔ وہ جانتا تھا کہ سوالات تو اسی وقت سے پیدا ہوچکے تھے۔ جب ازلی مرد اور عورت کو اس سرزمین پر بھیجا گیا تھا۔ اور دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں شناسائی کی شناخت کی تھی۔ اور تب سے یہ سوال تار عنکبوت کی طرح آدمیت کے احساس کے بیچ جھول رہا تھا۔ اور بس یہی سوال تھا جن سے کئی دوسرے سوال پیدا ہورہے تھے۔ اور ہر سوال اپنا خوفناک منہ پھاڑے نوع انسانی کی جانب تک رہا تھا۔ ان سوالوں سے چہرے کے مسخ ہونے کا ڈر تھا۔ اور یہی طے پایا کہ ان سوالوں کو پرے چھوڑ دیا

جائے اور ان سے الگ رہ کر زندگی گزاری جائے۔۔۔

بوڑھا خاموش تھا اور سب کے سب اپنے نمود کی عریاں تعبیر میں گم تھے۔
آسمان پھر دھندلا گیا تھا، خونی لکیروں نے آسمان کو ڈھک لیا تھا۔ دھویں کا بادل اچانک شہر کے آسمان پر چھا گیا۔۔۔ بارش نے سوالوں کے کوڑھ سے گھبرا کر اپنے ہاتھوں میں باجہ تھام لیا اور اچک کر ایک دابہ پر سوار ہو گیا۔

پھر سب نے یہی کیا اپنے ہاتھوں میں ایک باجہ اٹھالیا اور دابہ پر سوار ہو گئے۔
اور پھر یوں ہوا کہ فضا غراہٹوں سے بھر گئی۔ اور دواب اپنے اپنے سواروں کو لہو آگیں آنکھوں سے تکنے لگے اور ابوالہول کا بت ویرانے سے ہوتا ہوا چپکے سے ان کے سامنے آکر معلق ہو گیا۔

○○

۔۔۔۔ ادراک۔ ۱۹۸۲ء

اشغلا کی بند مٹھیاں

(۳۱/۱ اکتوبر ۳۰، ۱۹۸۴ء کے نام)

رات کے پرہول سناٹے میں بھی سنگ ملامت کے پھینکے جانے کا کام جاری تھا۔ اور چرخ۔ صلاہ سمرقندی پر اشک جگر سوز تھا۔

اور جب کہ رات کی تاریکی میں شہر کی تنہا و ویران سڑکیں گھوڑ سواروں کے اشعاع و ضو فگنی اور گھوڑوں کی چیختی ٹاپوں کو اپنے برہنہ سینے میں اتار رہی تھیں۔ کتنی ہی آنکھیں تھی جو نیند میں ڈوبی تھیں۔ کتنی ہی آنکھیں تھیں جو نیند میں رہ رہ کر چونک اٹھتی تھیں.... اور جب جب بے چینی کے کیڑے جسم میں رینگ جاتے.... پھیل جاتے.... مادرزاد ننگی شاہراہ سے گزرتی وسل دیتی جیپ اور گھوڑ سواروں کی ٹاپ ٹاپ سے دہشت زدہ آنکھیں جاگ اٹھتیں۔ چونک اٹھتیں.... تو سہمی سہمی آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھتی ہوئی پوچھتیں.... کہ بتاؤ اشقیا کے سینے میں رحم کا دودھ کب اترے گا۔

تو سوال گونگے تھے۔

کہ رات گونگی تھی۔

اور دھیرے دھیرے شب کا پرزور ظلم ٹوٹتا جارہا تھا۔

اور اشتعلا سب کی مٹھیوں میں بے چین پرندوں کی مانند پھڑپھڑا رہا تھا۔

اور جب صبح ہوئی.... اور صبح کی سرخی خوان کرم و خوان یغما پر ٹوٹ پڑیں تو بند دروازوں سے جھانکتی سہمی سہمی آنکھیں مادر زاد ننگی شاہراہوں پر نکل کر پھر سے وحشی بن گئیں۔ بند دو کانوں کے باہر جھنڈ کے جھنڈ کھڑے لوگوں کی مصلحت پسندانہ آوازیں اپنے منصب اپنے رتبے سے بلند ہو کر خود ساختہ بن گئیں اور خودستان کی تصویریں اپنے ہی آئینہ میں بوکھلا کر مضحکہ خیز دکھنے لگیں۔

تو جب سڑک پر بھیڑ تھی..... اور اس بات پر کہ کرفیو بھی لگا تھا۔ اور اس بات پر کہ ہر چند وقفہ بعد پولیس جیپ کا پاگل سائرن بھی گونج رہا تھا۔ اور اس بات پر کہ سلاح ساز ہنگامے کرتے ہوئے شاہراہ پر اپنی لاٹھیوں کے کرتب بھی دکھا رہے تھے اور اس بات پر کہ شہر جنگل ہو گیا تھا.... اور اس بات پر کہ ایک خاص فرقے کے دروازوں پر موت کا جا بجا لٹکا ہوا قفل آسیبی لمحوں کو اپنی گرفت میں لے رہا تھا ....اور اس بات پر کہ اس خاص فرقے کی جاگتی آنکھوں میں کتنی یادیں سو گئی تھیں اور کتنی یادیں جاگ جاگ کر پھپولے اگا رہی تھیں.....

تو ان تمام باتوں سے بے خبر ایک خود آرا پاگل منش سڑک کے کنارے کنارے اپنی ڈفلی اپنا راگ الاپ رہا تھا...... اور ایک شخص جو دیر سے اس کے تعاقب میں تھا..... اس سے ہاتھ ملایا اور ساتھ ہو لیا۔

تو وہ ..... جو درویش تھا۔ گنگنا رہا تھا ... تو شب آفریدی چراغ آفریدم تو شب آفریدی۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ جذب کی کیفیت میں داخل ہو گیا.... چہرہ لال سرخ ہو گیا..... آنکھیں باہر کو نکل آئیں.... تونے رات بنائی اور میں نے چراغ، آج میں نے چراغ کی لو بجھا دی ہے اور تو بھی اپنے گنجینہ عرفان میں رات کو چھپا لے ....نیند آ رہی ہے کہ تمام اصول سو چکے ہیں اور تمام سوئے ہوئے اصولوں کی بھبھوت سے ایک نیا قلب جنم لے رہا ہے...ڈفلی پھر بجی۔ تو شب آفریدی چراغ آفریدم.....!

اور حیرت کا مظاہرہ کیا اس کے نو وارد دوست نے.... کہ جنگل جنگل آگ لگی ہے پھرتا ہے دیوانہ کیوں۔

درویش پر ایک سکتہ سا طاری ہوا۔ ایک رنگ آیا۔ ایک رنگ گیا۔ ڈفلی روکی۔ دوست کے الجھے ہوئے گیسو دیکھے پھر لمبی سانس کھینچتا ہوا بڑبڑایا..... تو اندر کا حال کیا جانے اجنبی کہ اندر کیا ہے اور ڈفل سے کیسے کیسے راگ پھوٹتے ہیں.... وجد کی دنیا کیسی دکھتی ہے کہ اب تو ہم درویش ٹھہرے کہ پیروں کی زمین اچانک ہی کھسک گئی... مگر ٹھہر ٹھہر... تجھے بتلاتا ہوں کہ اب میں اس بات کا گواہ ضرور ہو گیا ہوں۔ کہ اس روز شہر کے سکوت پر کون سا قہر ٹوٹا تھا۔ اور برہنہ شاہراہیں کیونکر اسپ شر زور کے نعل لگے پیروں سے گونج اٹھی تھیں... اور اس بات کا بھی کہ خاص فرقہ کالی کالی بدلیوں میں اپنے چہرے کی مشابہت تلاش کر رہا تھا اور بدنصیب وقت کے خنجر بازوؤں میں اتار رہا تھا... اور اس بات کا بھی کہ ایک کل تم نے جہاں ایک خونی رقص پیش کیا انہیں خاکستروں سے انقلاب کا مردہ بچہ جنما تھا۔ مگر ٹھہر ٹھہر اتنا بتادے... کہ کچھ رات تو سویا نہیں اس کے سوا اور کیا ہوا... کچھ روز جنگل کے قانون شہر میں نافذ ہو گئے... اس کے سوا اور کیا ہوا؟... اور میری کچھ راتوں نے مجھے چھین لیا اور اس کے سوا کیا ہوا....؟

تو دوست چپ تھا کہ بات بھی درست تھی کہ اس کے سوا اور ہوا ہی کیا تھا۔

اور گواہ کل کائنات تھی کہ ذرہ ذرہ اپنے معمول پر تھا۔

اور گواہ سورج تھا.....

اور گواہ چاند تھا......

اور سب کے سب گواہ تھے کہ سب اپنے معمول پر تھے۔

کہ معمولات میں کبھی نہ کوئی فرق آیا ہے۔

کہ معمولات میں کبھی نہ کوئی فرق آئے گا۔

اور اس کے ساتھ ہی وہ خود آرائش اور اس کا دوست ماسوا کے گھنیرے

دشت میں گم ہوگئے۔

اب وہ آگے آگے تھا۔ لا پرواہ سا۔۔۔ بڑے بڑے بال کندھے پر جھول رہے تھے۔ گھنیری بے ترتیب بڑھی ہوئی داڑھی میں کبھی کھجلی سی ہونے لگتی تو اس کے گندے میلے ہاتھوں کی ٹیڑھی میڑھی انگلیاں بالوں کے جنگل میں گم ہو جاتیں۔ شجرۂ قلا اس کے کندھے پر جھول رہا تھا۔ پولیس کی دوڑتی بھاگتی گاڑیوں نے کوئی قانونی اعلان عوام کی جانب اچھال دیا جسے کھلتی اور بند ہوتی کھڑکیوں اور دروازوں نے اپنے اندر اچک لیا۔ اور ان اعلانات، پہرے اور سناٹے سے بے خبر ہو کر دونوں چپ چپ آگے بڑھتے رہے۔

ذرا تھک گئے تو دم لینے کے لیے ایک پیڑ کے سائے میں ٹھہر گئے پھر شجرہ قلا کھلا اس میں سے گٹھری نکلی۔ لاوے پھانکے گئے۔۔۔ اور پھر وہی اپنی ڈفلی اپنا راگ۔۔۔

اور اجنبی دوست نے جب درویش کو اس طرح زمانے سے بے خبر دیکھا تو کہا۔

"گرامی قدر! شہر کی چیخوں پر کان دھرو کہ یہ چیخیں کیا کہتی ہیں قانون و اعلانات کی زبانیں کتنی لمبی اور زہریلی ہیں ننگی شاہراہوں نے اداسی کی قبا کیونکر پہن رکھی ہے۔ تو گرامی قدر! کان دھرو کہ دو وحشیوں کی پاگل حرکتوں سے آسمان کیسا سرخ ہو گیا ہے۔۔۔۔ آرام میں کیسا خلل پڑا ہے کہ سب کے اندر وحشت کے چوہے دوڑ گئے ہیں اور نگاہ رکھو کہ سفر کی شروعات میں تمہارے سامنے بھی وہ سلگتے ہوئے مکانات ہوں گے اور جذباتی چہرے ہوں گے۔ اور شہر کے بیچ و بیچ تم نے انتقامی پرچم بھی لہراتے ہوئے دیکھا ہو گا۔ سلاح ساز کے مست گھوڑوں کی ٹاپیں سنی ہوں گی اور وہ سب کچھ دیکھا ہو گا جہاں آنکھیں سرخ رنگ تمام مناظر کو اپنے اندر اتار کر اب سے ہزاروں سال پیچھے لوٹ جاتی ہیں۔۔۔۔"

سن رہا ہوں۔۔۔۔۔ درویش ڈفلی بجاتا رہا۔

آہ! اجنبی کو افسوس ہوا۔ جب تم یہ سب سن رہے ہو پھر بھی اپنی بکواس

جاری رکھے ہوئے ہو تو میں یہ سمجھوں گا کہ آج کے جاگتے دور میں تم بے حس ہو گئے ہو۔ چیخوں پر کان دھرو بزرگ اور غم کدے میں شرکت کے لیے تیار ہو جاؤ....."

ٹھہر ٹھہر!! پہلی بار غضبناک نظروں سے درویش نے اپنے نووارد دوست کو دیکھا اور پھر اس کی ڈفلی اس کے لرزتے ہاتھوں میں کانپ گئی... کہ ٹھہر ٹھہر جلد بازی میں مجھے کوئی اپدیش نہ دے بلکہ میرا پچھلا سن کہ اس سفر میں مرے ساتھ میرا بچہ بھی تھا اور کان دھر کے سننا کہ اس بچے کے سر پر ایک خاص پگڑی تھی جیسے کہ اس خاص فرقے والے کی پگڑیاں اور ٹھیک ویسی ہی ایک پگڑی میرے سر پر بھی تھی۔ تو عزیزم! جس وقت شعاؤں نے آسمان کا رخ کیا، میرا مسکراتا ہوا بچہ آسمانی قہر کا شکار ہو کر ذبح کیا ہوا، میرے سامنے پڑا تھا اور اس کے سینے سے لہو ابلتا تھا۔ دروازے کے باہر چین کی بانسری بج رہی تھی اور اندر بچے کی مسکراہٹ... حسب معمول اس کے گھنیرے بال آسمان پر چھائی ہوئی گھن ٹوپ بدلیوں جیسے دکھ رہے تھے اور....."

درویش اپنے جنوں کا سر ٹٹول رہا تھا۔ عزیزم! جو تم یہ دیکھ رہے ہو وہ اپنے آپ کی قربانی ہے کہ ہم جب موت سے دست گریباں ہوں اور دوسرے تعلقات بھول جائیں تو اپنی جان اپنی زندگی... مذہب اور ملک کے تمام رشتوں سے کچھ زیادہ بلند ہو جاتی ہے....."

اندر کا ضبط بارش کی بوندوں کو میسر ہو گیا تھا۔ شاید... یہ اندر کا جھوٹ ہی تھا کہ درویش سسکیوں میں رو رہا تھا۔ اور اس کا نووارد دوست حیران حیران نگاہوں سے اسے تکے جا رہا تھا۔ ڈفلی چپ تھی اور ماحول میں کچھ بے رنگی سی گھل گئی تھی۔

اور پھر کتنی ہی بے چین نظریں تھیں جو پوچھ رہی تھیں کہ... بتاؤ نا اشقیا کے سینے میں رحم کا دودھ کب اترے گا؟

تو سوال گونگے تھے... کہ دن گونگا تھا۔

اور دھیرے دھیرے شب و روز کا یہ پر زور طلسم ٹوٹتا جا رہا تھا۔

اور اشغلا سب کی مٹھیوں میں بے چین پرندوں کی طرح پھڑ پھڑا کے اب خاموش ہو گیا تھا۔ اور کسی کونے سے درویش اب بھی گنگنا رہا تھا.... تو شب آفریدی چراغ آفریدم... تو شب آفریدی چراغ آفریدم...!

○○

(شاخیں، اندور ۱۹۸۵ء)

کھوئے ہوؤں کی جستجو

........**الف** تماشہ گاہ میں خاموشی سے داخل ہوتا...اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا پنجرہ ہوتا جس میں اس کی پالتو فاختائیں قید ہوتیں جنہیں وہ بڑے پیار سے دانا دنکا کھلایا کرتا....اور شام ہوتے ہی انہیں لے کر بازار کی جانب نکل کر اپنی خواہشیں خرید لاتا.....اور ٹریفک کے ہنگاموں.... کاروں، موٹروں کی بے ہنگم چیخوں میں اپنی خواہشوں کا نوزائیدہ جسم سنبھالتے ہانپتا کانپتا گھر روانہ ہوجاتا۔

صبح سے لے کر شام تک ذہن سے چیخوں کے بادل اٹھتے رہتے اور خلاء میں چھترا جاتے، فضا میں بکھر جاتے......

تو وہ اپنے ریزہ ریزہ وجود کے ساتھ اپنے واپسی قدموں کو صدا دیتا...

مگر جانے کیوں اسے یقین تھا کہ ایک دن......ایک دن ایسا ضرور ہوگا..

اور ہوا بھی......

گرد آلود فضا اور ابر آلود خلاء نے ان کے صدیوں کی بوجھل کثیف چیخوں کو جو وہ صد ہا ہزار ہا بلکہ لاکھوں سالوں سے نگلتے چلے آرہے تھے.....اچانک اگل دیا.. اور پھر آسمان سیاہ تھا اور اس کی فاختائیں خاموش...

ہوا بند تھی ... لوگوں کے چہرے فق تھے۔ تاثرات کے چلبلے پرندے کی

روح قبض کر لی گئی تھی۔

اور ایک جذبات سے عاری پرندہ افق کی سرحد کے پار سے جھانک رہا تھا۔

تو الف اپنی سوچ کے بے آب و گیاہ ریگستان میں تنہا کھڑا تھا..... کارواں رخصت ہونے والے نے اس کے ہاتھوں میں یہی فاختاؤں کا پنجرہ تھمایا تھا۔ اور جب وہ عقب کی خار دار جھاڑیوں میں گم ہو گئے تو بس یہی فاختائیں رہ گئی تھیں۔ جنہیں وہ شام کے دھندلکے میں فروخت کرنے کے بعد اپنی خواہشوں کا جسم پالیتا تھا.....

تو ایک دن وہ بھی ان فاختاؤں کو اپنے آنے والی نسلوں کے سپرد کر کے عقب کی خاردار جھاڑیوں میں گم ہو جائے گا.....

اس دن بھی شام کا وہی بے رنگ منظر تھا۔

اس سے قبل سڑک پر اتنی خاموشی اور اداسی نہ تھی...... الف کی جون میں آنے کے بعد سے لے کر اب تک بس یہی دوڑ کا سلسلہ جاری تھا۔

جب ننگ دھڑنگ ازلی مرد اور عورت انجیر کے پتوں سے اپنے بدن ڈھانپتے تھے۔ اور ریگستان کی تپتی ہوئی دھوپ میں خواہشوں کے لاوے چنتے تھے۔ تب شب کے بدن سے دھوپ سرک گئی۔ اور کشکول سے مٹھی بھر خواہشیں نکل کر چھترا گئیں۔

اور تب سے لے کر آج تک بدلی قدروں میں اس نے بس یہی محسوس کیا کہ سڑکوں پر ایک طویل مگر ختم نہیں ہونے والی دوڑ کا سلسلہ جاری ہے...

اور اس نے بھی فاختاؤں کا پنجرہ اپنے ہاتھوں میں مضبوطی سے تھام لیا۔ شاہراہوں پر ایک دوڑ تھی۔ ایک بھاگم بھاگ تھی۔ نہ کوئی ٹھہرنے کو کہتا اور نہ کوئی ٹھہرتا جو ٹھہرتا وہ دوڑتے قدموں کی چاپ میں روند ڈالا جاتا......اور سڑک پر لہو کی لکیر کھنچ جاتی.....

اور سب کو پڑی تھی کہ جب شام کا تھکا ماندہ سورج اپنے گھر لوٹ جائے تو وہ اپنے جیبوں کو بھاری بنالیں اور کاروں موٹروں کی بے ہنگم آوازیں بن جائیں۔ اور اپنے گھروں میں سما جائیں......

تب وہ بھی اپنے گھر میں داخل ہوتا.....اور مشین کی کنجی پیچھے کی جانب سرکا دیتا.....

سانسوں کا بدبو دار بھبکا ہونٹوں سے باہر چھلانگ لگاکر فاختاؤں کی آنکھ مچولی میں گم ہوجاتا۔

ذرا ٹھہر کر وہ پھر مشین میں کنجی بھرتا۔ اور بڑے پیار سے دوسری فاختاؤں کے پنجڑے کو دیکھتا..... پیاری فاختائیں.... میری خواہش بن جا.... اور خواہشوں کو جسم عطا کر۔

فاختائیں نخوت سے مسکراتیں... "تو مجھے فروخت کردو۔ اور اپنی خواہشوں کا جسم پالو"

تو وہ ہنسنے لگا..... کہ بیچ گزرے ہوئے کل سے اپنی کینچلی متعدد بار اتارتا ہوا کتنا کھوکھلا ہوگیا ہے کہ محض اس کی خواہشوں کا جسم بن گیا ہے۔

اور پھر اپنی نت نئی خواہشوں کا لبادہ اوڑھ کر گنگناتا ہوا شام کے دھندلکوں میں جب وہ گھر کی جانب روانہ ہوتا تو کچھ دیر کے لیے راستوں میں ملی ہوئی عبادت گاہوں کے قریب ٹھہر جاتا۔ وہاں ایک ہو کا عالم ہوتا۔ لحد جیسی ویرانی ہوتی.... جھینگروں اور ابابیلوں کی نحوست ہوتی اور شکستہ در و دیوار پر مکڑی کے جالے ہوتے۔ ......" تو عبادت گاہیں تار عنکبوت اور جھینگروں کی آماجگاہ بن گئی ہیں اور خدا ان منحوس بولیوں میں پوشیدہ ہوگیا ہے...."

کہ عبادت گاہیں روز بروز تاریکی کے غلاف میں چھپتی جارہی تھیں۔

کیا یہاں ٹھہرنا مقصود ہے؟

تو اس کی سانسیں پھولنے لگیں.... قدم آگے بڑھنے کے لیے حرکت میں

آجاتے۔ اور شاہراہ قہقہوں میں کھو جاتی..... گو عبادت گاہوں کا خدا اب جا بجا مکڑوں کی یورش اور جھینگروں، ابابیلوں کا ہی ہو کر رہ گیا ہے..... چلو..... چلو....."

ٹاپ ٹاپ.....

پھر دوڑ رہتی..... اور یہ سلسلہ رہتا.... اس طرح کہ سب ایک مشین بن گئے تھے۔ صبح کنجی دے دی جاتی اور مشین شام تک چلتی رہتی۔ شام واپسی میں پھر کنجی بند کر دی جاتی۔ اور مشین بے حس ہو جاتی۔ بے جان۔

اور ایک شام جب سورج کھروں میں چھپ گیا تھا آسمان اندھیرے میں ڈوب گیا۔ ہوائیں بند ہو گئیں۔

اور یہ لمبی، ختم نہیں ہونے والی دوڑ جاری تھی کہ اچانک سب ٹھہر گئے۔ دوسری جانب سے سفید کفن میں لپٹے اور سر پر کالا کپڑا باندھے لوگوں کی ایک لمبی قطار سڑک پر بڑھی جا رہی تھی۔ سب کے جسم ایسے لگ رہے تھے کہ جیسے ان میں جو ہوا بھر دی گئی تھی وہ نکال لی گئی ہو۔ اور بس ایک جھولتا ہوا گوشت پوشت کا ڈھانچہ رہ گیا ہو۔ آنکھیں بے حس ہو گئی تھیں۔ اور گول گول پتلیاں باہر کی جانب آکر لٹک گئی تھیں۔ ہونٹ سوکھے ہوئے تھے۔ خشک ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئی تھیں۔

ان کی آوازیں ایسی تھیں جیسے چیونٹیوں کی آوازیں ہوں..... جو اپنی جماعت کو انسانی لشکر کی قدم آوری سے آگاہ کر رہی ہوں "ہوشیار ہوشیار!! قافلہ آپہنچا ہے... ۔وہ تمہیں روند ڈالے گا.... اس لیے روزی روٹی کا حیلہ چھوڑو اور اپنی جان بچاؤ۔

نہ وہ کسی سے مخاطب تھے اور نہ کسی سے کچھ کہہ رہے تھے۔ ان کے ہونٹ بہت آہستہ کھل اور بند ہو رہے تھے۔ آوازیں نکلنا چاہ رہی تھیں مگر جیسے نقاہت آ گئی ہو۔

سب ایسے لگ رہے تھے جیسے ابھی ابھی قبرستان سے نکل کر سڑک پر بچھ گئے ہوں....

اس نے دھیرے سے اپنے بغل والے سے پوچھا بھائی صاحب۔ یہ لوگ کون

ہیں؟

"شی"

اس نے ہونٹ پر انگلی رکھ کر اسے خاموش ہو جانے کو کہا.....

بھول گئے ہیں اپنی آوازیں کہ ٹریفک میں گم ہو گئی ہیں ان کی آوازیں.....

کہ لہولہان ہو رہا ہے ان کا وجود......

اور سماعت گردو غبار میں کھو گئی ہے.....

کہ بصیرت سے محروم ہو گئے ہیں یہ۔"

تو قطار کافی لمبی تھی۔ اور بدبداہٹ مکھیوں کی طرح پھیل رہی تھی.....اور تب اسے خیال ہوا کہ اس نے سن رکھا تھا.....کہ ایک دن ایسا آئے گا کہ اپنے ہی عذاب میں گرفتار ہو جائیں گے لوگ۔ کہ اپنی آوازیں سڑکوں کے ٹریفک میں چھوڑ آئیں گے۔

کہ اپنی آوازیں اپنے دفتروں کی عالیشان عمارتوں میں دفن کر آئیں گے.....

کہ اپنی آوازیں موٹروں گاڑیوں کی چیخوں کے سپرد کر آئیں گے.....

اور اپنی آواز اس بے حس مشین کے حوالے کر آئیں گے جس کی کلید کو زنگ لگ چکا ہو گا۔

پس ایک جھولتا ہوا جسم رہ جائے گا ان کا کہ ان کی آوازیں ان کے اختیار میں نہیں ہوں گی.....

اور پھر وہ دن آئے گا.....جب چیخوں اور ہنگاموں سے گھبرا کر یہ اپنی آوازیں اپنے گھر بھول جائیں گے اور جب واپس لوٹیں گے تو دروازے پر سڑے ہوئے اور صدیوں کے بیمار کتے کو مرا ہوا پائیں گے۔ اور جسم ایک جھول بن کر خلا میں لٹک جائے گا۔ پھر چیخوں کا دائرہ تنگ ہوتا جائے گا.....اور رہ جائے گا محض ایک کھوکھلا وجود.....

تو زندگی اور اس کی معنویت چیخوں کی کثیف ہوا میں جذب ہو گئی اور سب

نجات..... نجات..... چلانے لگے.....

اور تب چپکے سے کسی نے الف کے اندر جھانکا۔

آہ وہ وقت آگیا.....

اور اسے احساس ہوا......

We Are the hollow Men

We Are the Stuffed Men

اور تب ایک کفن ہوگا اور ایک مٹی ہوگی۔ خلق الانسان من صلصال کالفخار۔ (میں نے پیدا کیا انسانوں کو بجیاتی ہوئی مٹی سے) اس نے ایک ڈوبتی ہوئی سانس لی اور اداس ہوگیا۔

".....اور پھر جب عزرائیل خاک لے کر بارگاہ خداوندی میں پہنچا تو حکم ہوا کہ خاک زمین پر بکھیر دی جائے۔ فوراً تعمیل ہوئی اور خاک زمین پر بکھیر دی گئی۔ پھر لمحے بیتے اور دو سال کا طویل عرصہ گزر گیا تو خاک گیلی ہونی شروع ہوئی۔ خالق نے خاک اٹھائی اور کالی متعفن مٹی سے ایک قالب بنا کر خشک ہونے کو چھوڑ دیا۔ پھر مزید برس گزرے اور قالب میں سختی کے آثار نمایاں ہوئے تو عزرائیل جو قریب تھا نے قالب کی جانب دیکھا۔ اسے علم تھا کہ جو خاک اسے قالب نظر آرہی ہے وہی ایک دن خلیفہ خالق بھی بننے والی ہے۔ تو غصے سے اس نے قالب کو ٹھوکر ماری۔ کھوکھلے قالب سے آواز پیدا ہوئی تو وہ حیران ہوا۔ اور جھک کر قالب کے پیٹ پر دوبارہ ہاتھ مارا اور فرشتوں سے یوں گویا ہوا.....یہ اندر سے خالی ہے جبھی آواز نکلتی ہے.....اس کی بنیاد مضبوط نہیں.....اس کی بنیاد مضبوط نہیں.....یہ اندر سے کھوکھلا ہے....."

تو انسان جنم کا کھوکھلا آیا ہے۔

الف کی خواہش کھوکھلی۔

ب کی غیر متوقع ہنسی کھوکھلی۔

اور اسی کھوکھلے پن سے وجود میں آیا ہوا الف کا کارواں۔

تو اس نے فاختاؤں کے پنجروں کو مضبوطی سے تھاما اور افسوس کیا.... کھوکھلے ڈھانچہ میں بھلا خواہش کب تک رہ سکتی ہے۔

تو کیا عجب کہ آدمی محض جھول بن کر رہ جائے اور خلا میں بے حرکت ہو کر ٹنگ جائے۔ تو کیا عجب کہ اس کی آوازیں موٹروں اور ٹریفک کے ہنگاموں میں کھو جائیں....

تو کیا عجب کہ اس پر اپنی حقیر حیثیت واضح ہو جائے.....

تو کیا عجب.....

سہمے لوگوں کی جماعت اب بھی آگے کی جانب رواں دواں ہے....

تو ہم تھکے ہارے ہیں.....

اور عالم وجود میں آنے کے بعد سے لے کر ابدی نیند اختیار کرنے کے مرحلے تک تھکی ہاری بوجھل سانسیں بن کر جیا کرتے ہیں.....

الف.....سوچ کا دریا بہت وسیع ہے اور بہت بیمار.....۔واپس جاؤ.....

وہ ٹھہرا۔ رکا۔ اور فاختاؤں کی چہچہاہٹ کے بیچ گم ہو گیا۔

اور جب قطاریں۔ معذور لوگوں کی قطاریں رات کی تاریکی میں کھو گئیں تو وہ سہمے ہوئے قدموں میں اپنے ٹوٹے بکھرے وجود کے ساتھ گھر روانہ ہو گیا۔

وہ پہلا دن تھا جب انسانی مجبوریوں کی لاش سے اسے بڑی زور سے گھن آئی۔

اور پہلا دن تھا۔ جب عبادت گاہوں کی۔ ہولناکیوں پر اس کی نظروں میں زعفران نہ اگا اور وہ خاموشی کی صلیب پر لٹکا ہوا گھر داخل ہوا تھا اور متعدد سوالات جو چہار جانب سے اس پر شب خوں مار رہے تھے، اور وہ اپنے بند دریچوں میں اپنے سہمے اور بھینچے خیالات کی دنیا کا اس وقت تنہا الف ہو گیا تھا۔

اور کوئی سانپ تھا جو ذہن کو بار بار ڈس رہا تھا۔

ایک ہی حمام تھا اور اس میں سارے الف اسے ننگے نظر آرہے تھے کہ سانپ

چہار جانب سے ان پر حملہ آور تھا۔ اور ہوش گنوا بیٹھے تھے۔

پھر فلک بوس عمارتیں تھیں۔

کئی کئی منزلہ دفاتر تھے۔

کمپیوٹر ورک شاپ تھے۔

مشینوں کی گھڑگھڑاہٹ تھی۔

مزدوروں، کام گروں کے شور تھے۔

اور چیخیں تھیں، صرف چیخیں تھیں۔

نفرت اور حقارت زدہ آنکھیں تھیں۔

اور پھر۔ چیخیں تھیں۔

جو سانپ بن کر فلک بوس عمارتوں سے نکل کر سڑک پر دوڑ جایا کرتی تھیں۔

اور گھر پہنچنے تک پیر تسمہ پا کی طرح لپٹی اور دوڑتی رہتی تھیں۔

پھر سب اپنی چیخوں میں الجھتے گئے اور محسوس ہوا چیخوں کا دائرہ تنگ ہوتا جا رہا ہے اور جسم جھول بن رہا ہے۔ اور یخ بستگی سرایت کرنے لگی ہے ان میں۔

اور تب ایسا سوچنے والوں کی ایک جماعت اٹھ کھڑی ہوئی اور جنوں میں مبتلا ہوتی گئی۔ پھر یہ جماعت اتنے زوروں سے چیخی کہ عمارتوں کی جڑیں ہل گئیں۔ زمین کانپ اٹھی۔ آسمان دہل گیا اور پھر سب کے سب صدیوں سے اندر پیوست چیخوں کو باہر نکال کر گونگے ہو گئے۔

تو یہ کہانی تھی جس کو الف اپنے آبا و اجداد کے ذریعہ سنتا چلا آیا تھا کہ آج حقیقت کی صورت اس پر عیاں ہو گئی تھی۔

وہ گھر آیا..... اور پنجرے میں قید فاختاؤں کو دیکھا۔ پھر گویا ہوا....

فاختہ.... فاختہ..... مجھے میری خواہش دے۔

تو فاختائیں خاموش رہیں۔

اسے ایک جھٹکا سا لگا.... وہ دوبارہ بولا۔

فاختہ.... فاختہ.... میری خواہش بن جا۔

تو فاختائیں دوبارہ گونگی بنیں اسے گھورتی رہیں۔

فاختہ، فاختہ وہ پھر چیخا۔ میری خواہشوں کو جسم عطا کر....

تو فاختائیں طنز سے ہنس پڑیں.....

افسوس ہے الف !! تم کمزور ہو گئے ہو.... اب تم خواہش لے کر کیا کرو گے۔ جبکہ اب تمہارے۔ بھی جسم میں خلا اور فضا کی چھوڑی۔ ہوئی ان گنت چیخیں موجود ہیں.... کیا تمہارا جسم تپتا نہیں.... تمہاری سانسوں میں ڈیزل اور پٹرول کی مہک نہیں بسی..... کیا تمہارے اندر حقارت زدہ قہقہے نہیں......

تو تم قہقہوں کی زد میں ہو الف۔ افسوس تمہاری خواہش کو جسم عطا کرنے والا تمہارا اپنا وجود لاغر ہو گیا ہے۔ بے حس۔ اور تمہارے وہ خواب بھی پھسل گئے جو بلند و بالا اور عظیم الشان۔ عمارتوں سے ہو کر گرد و خاک کی شاہراہوں سے گزر جایا کرتے تھے۔

تو الف نے ایک طویل خاموشی دھارن کر لی۔

مستقبل کا پرندہ گپھاؤں میں گم ہو گیا تھا اور گپھاؤں کا آدی مانو شرم و تہذیب کی علامت کو چاک کرتا ہوا برہنہ پا سڑکوں، شاہراہوں پر نکل آیا تھا....

اور فاختائیں اب بھی طنزیہ ہنسی ہنس رہی تھیں۔

"ٹھہرو..... یہ کہانی انتہائی افسوس ناک ہے..... بند کرو اسے۔"

وہ چیخا۔

فاختائیں قہقہہ مار کر ہنس پڑیں۔

بند کرو۔ للہ بند کرو.....

فاختائیں، ہنستی چلی گئیں۔

تو میں اپنی موت لکھنے والا ہوں۔

کہ میرے بعد بھی ایک لمبا قافلہ ہے جو اپنی فاختاؤں سے محروم ہو گا۔ اور گونگی

نسلوں کے خالق کہلائیں گے ہم۔

اور الف سناٹگی کی شاہراہ پر نکل گیا۔

صبح کا سورج لہو کے غازے میں لپٹا ہوا تھا۔

اس نے دوبارہ فاختاؤں کا پنجرہ تھام لیا اور بے حس لوگوں کے قافلے میں وہ بھی بے بس و مجبور کھڑا تھا۔ اس کے نفس کی چٹان ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئی تھی۔ اور کوئی فاقہ زدہ ہرنی تھی جو چہرے پر قلانچیں بھر رہی تھی۔

اچانک اسے احساس ہوا کہ اس کا جسم قدرے ہلکا ہوتا جا رہا ہے اور سانسیں گھٹ رہی ہیں۔ اور ہاتھوں میں قوت نہیں رہ گئی ہے۔

تو وہاں سب کا وہی حال تھا کہ چہرے پر بجھا ایک فق سورج تھا اور سب اپنی اپنی فاختاؤں کی زد میں تھے۔

شام کا دھندلکا بڑھتا جا رہا تھا آسمان لہو رنگ ہو گیا تھا۔ دفعتاً ہاتھوں سے پنجرے زمین پر چھوٹ کر گر گئے۔ سب نقاہت سے کانپنے لگے اور فاختائیں قلانچیں بھرتی ہوئی فضا میں پرواز کر گئیں۔

This is the Way the World Ends.
This is the Way the World Ends.
Not With a Barg But a Whimper

○○

ہم بے خبر ہیں /

بہت ساری باتوں سے /

اس لئے کہ اگر ہمارے گھر میں اور ہمارے ہی کمرے میں /

کوئی جانور سڑ گل گیا ہے

تو اس کے ذمہ دار بھی ہم ہیں

اور ایسا اس لئے ہے

کہ ہم میں سے زیادہ تر وہ لوگ ہیں

جنہوں نے اپنا مطالعہ اور محاسبہ کبھی نہیں کیا۔

○

جو چپ رہے گی زبان خنجر......

بھگوا

"لباس میں کیا رکھا ہے؟"

"کچھ بھی پہن لو..... کچھ بھی اوڑھ لو..... بدن چھپانے سے کام نا..... لیکن جوشی بھیا بولے ہیں..... لباس ہی تو اصل ہے..... لباس میں بہت کچھ رکھا ہے..... پہنو تو جانو..... لباس سے آدمی کی جات کھلتی ہے۔ اب مسلمانوں کو ہی دیکھ..... صافا صافا کرتا پائجامہ پہن لیا۔ سر پر ٹوپی چڑھالی تو بن گئے نا اللہ میاں کے بندے..... دیکھ کر لگتا ہے ضرور جمعہ ہوگا۔ نہاکر مسجد جارہے ہوں گے۔"

"ہاں لگتا تو ہے..... گننیں کے سر کے ساتھ اس کی چٹلی بھی ہلتی ہے۔ عبدلوا کتنا گندہ رہتا ہے لیکن مجال ہے۔ جمعہ کے روز دیکھو تو پہچان میں نہیں آئے گا۔ اس نے ایک بار اس کی چٹلی پکڑی تھی۔ جور سے۔ کتنا درد ہوا تھا سر میں..... بھک سے خالی چندیا میں جیسے بھوکنپ آگیا۔"

"چھوڑنا موسل....."

"لے چھوڑ دیا۔"

عبدلوا ہنس کر اپنی راہ ہولیا۔ بعد میں اس نے جوشی بھائی سے اس کی شکایت کی....." اونہہ..... دیکھونا..... سراب بھی جھنجھناتا ہے۔ سالے لمپٹ عبدلوا نے

چٹلی پکڑلی۔"

جوشی بھیا تو ایسے ناراض ہوئے جیسے کسی نے ان کی چٹلی پکڑ کر ان کا فیوز اڑا دیا ہو۔ غصے میں....

"مارا کیوں نہیں سالے کو؟"

"جی!"

"مار دیتے، جو ہوتا دیکھا جاتا۔"

"جی..."

وہ ایسے چونکا جیسے بچھوؤں کے بل میں ہاتھ پڑ گیا ہو۔ جوشی بھائی کا چہرہ غصے سے لال بھبھک.... کچھ دیر کے لیے تو جیسے وہ سکتے میں آ گیا۔ وہ کچھ غلط تو نہیں بول گیا۔ پھر جوشی بھائی کی چندیا کیوں ڈول گئی۔ ہونہہ، بولا ہوگا۔ آتے جاتے لوگ بھی تو کھیل کھیل میں اس کی چٹلی کھینچ لیتے ہیں....وہیں، ببن پان والے کی دکان پاسے....جس کے بغل میں رگھوا کی چائے کی دکان ہے....سامنے چار پائی نکلی رہتی ہے۔ لوگ بیٹھے ہنسی ٹھٹول کرتے رہتے ہیں۔ وہ گزرا نہیں کہ مجاک سروع۔

"اوے چندیل....ادھر آ...."

"او ببن کی مہرارو۔ چل ادھر بیٹھ...."

اس دن چودھری نے بھی چار پائی پر اپنے پاس بٹھا کر اس کی چٹلی کھینچی تھی۔ پھر سب مل کر کیا ٹھٹھا کر ہنسے تھے۔ اور یہ جوشیا....نہ نہ.....جوشی بھیا بھی ہنستے ہوئے مجاک بنائے تھے....اوے ببن کی مہرارو....پھر سب کیا ٹھہاکا لگائے رہیں۔

وہ غصے میں بگڑا تھا۔ "جیادہ ہنسی مت اڑاؤ۔ ہاں....میں کسی سے کم ہوں کیا۔ ہاں۔ کہے دیتا ہوں....ہاں جیادہ بنوگے تو نرک میں جاؤگے....ہاں...."

"لے۔" چودھری نے دونوں ہتھیلیوں کو ملا کر چہرہ مٹکایا...."رے ببن، دے نا چونا لگائی کے اس کو" سب پھر ہنسے۔ اسے غصہ آ گیا...."تم کیوں کہو گے۔ چونا

لگائی کے یا ۔ جو دیں گے وہی بن بھائی دیں گے" اس نے دنتی کی....." دے دے نا بن.....ایک پان کا بیڑا....."

وہ مسکرایا تو سب ٹھہاکہ مار کر ہنس پڑے۔

بن کھسیا کر فائر ہوا۔"چپ بیٹھ۔"

"ناراض کیوں ہوتا ہے....." چودھری نے بھی اٹھا ہاتھ نچایا۔ پھر بے سرے سر میں گلے کو اٹھایا......"دے دے میری اماں.....نا جی....."

چارپائی پر بیٹھے لوگوں نے تال ٹھوکا اور سر ہلایا۔ دیدے میری اماں.....ہاں جی۔ وہ بگڑا۔"یہ اماں،ابا کو کیوں یاد کرتے ہو۔ ہاں.....بن ایک پان بنا،نا..."

"بھاگ.....سا....."

بن نے اتنی زور سے ڈانٹا کہ اس کی موت نکلتے نکلتے بچی۔

"ہاں۔ ڈانٹو مت ... نہیں دینا ہے مت دو۔ مگر ڈانٹو مت۔ بڑے آئے ڈانٹنے والے۔"

وہ غصے میں چارپائی سے اٹھا۔ جاتے جاتے اسے چارپائی پر بیٹھے لوگوں کی تان دوبارہ سنائی پڑی۔

دے دے میری اماں.....ہاں جی

دے دے میری اماں.....نا جی

جوشی بھیا چٹلی کھینچے جانے والی بات پر آخر اتنا گرم کیوں ہوئے۔ اسے لگا، اس سے ضرور کوئی غلطی ہو گئی ہوگی۔ وہ بربک ہے نا۔ سمجھ میں تو کچھ آتا جاتا نہیں ہے.....بابا کہتے ہیں۔ صرف تاڑ جتنا لمبا ہو گیا ہے۔ عقل نام کو بھی نہیں۔ نا ہے جنترے سے۔ مت ہو۔ لیکن جو کام اچھا لگتا ہے وہ ضرور کرے گا۔ اب کیا ہے کہ.....یہ اجو.....بجو.....ڈفلوا.....بیگن کے ساتھ گلی ڈنڈا۔ کبڈی کھیلنے میں ہرج ہی کیا ہے.....ہے ڈنگاپائی ... اف کتنا بڑھیا کھیل ہے..... مجا آتا ہے ڈفلوا کو بھیلو

میاں کے کباڑ سے دھکا دینے میں.... کیسا جور سے چلاتا ہے۔ چلاتے ہوئے بھاگے گا.... گنیں نے مارا.... گنیسوا نے دھکا دیا.... پھر دوسرے ہی پل کھیل میں سامل۔ کبڈی میں بیگنوا اس سے تگڑا پڑتا ہے۔ ہونہہ.... نٹوا کہیں کا.... لیکن بدن کتنا جور دار ہے۔ آکھر لرکا کس کا ہے۔ جتو تیلی کا.... بابا بولتے ہیں نا.... کھوب تیل میں پیسہ بنایا ہے اس نے۔ ڈفلوا تیل لگالگا کر موٹا ہو گیا ہے۔ سارے بدن پر تیل ملے رہتا ہے لسپٹ.... پکڑو تو پھسل جائے گا۔ اور ایک وہ ہے..... جانگھیے کے نیچے سے نکلتی ہوئی پتلی پتلی ٹانگیں۔ ڈفلوا تو کبڈی میں ایسے تھام لے گا جیسے جندگی بھر نہیں چھوڑے گا۔ وہ پکڑا جاتا تو سب مل کر جور جور سے ہنستے.... آہا.... ہا۔ ..پکڑا گیا بیلچٹ....

ببلوا کہتا۔ "ذرا اپنا اینٹینیا تو دکھا"

"اینٹینیا دیکھے گا۔ بربک.... لے دیکھ...."

دونوں ہاتھ سے چٹلی پکڑ کر وہ سیدھ میں کرتا تو سب ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ کھیل کھیل میں ایک دن ڈفلوا نے بتایا۔ "یہ اینٹینیا نہیں ہے رے۔ وائرلیس ہے۔ اس کا سیدھا کنکسن بھگوان سے ہے۔ آنکھیں بند کر اور بتا کیا دیکھا۔"

"کچھ نجر بھی آئے گا؟"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ ایک سے کنکسن پکڑ۔ دوسرے سے آنکھیں موند لے۔"

"لے موند لیا۔"

اس نے سچ مچ ایک ہاتھ سے کنکسن دوسرے سے آنکھیں موند لیں۔ نجر کیا آتا۔ وہی گنیس جی۔ جن کی بتے بھر کی مورتی چھجے پر رکھی ہے۔ سروع سروع میں تو اماں اس کا کان پکڑ کر گنیس جی کے سامنے اسے لے کر آتی تھیں۔ بھگوان.... اسے بدھی دے.... بدھی دے بھگوان.... پھر کہتیں۔ پرنام کر.... روج باہر نکلنے سے

پہلے گنیس جی کا آسیرواد لے لیا کر۔

"یہ روج بدھی کیوں مانگتی ہو میرے لیے ہاں...؟"

وہ بگڑ جاتا۔

"تو گنیس جی کا ہی تو پرساد ہے" اماں کہتیں۔

"ہاں۔ ان کا؟"

اسے عجیب سا لگتا۔ آنکھیں بند کرتا، تب بھی لگتا گنیس جی اچانک نکل کر اس کے سامنے کھڑے ہوگئے ہیں۔ کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا، جاگتے کھیلتے میں بھی اسے لگتا، گنیس جی اچانک نکل کر اسے حیران کر دیں گے۔ اس لیے جب ڈفلوا نے آنکھیں بند کرنے کے لیے کہا تو آنکھوں میں بھگوان اتر آئے۔

"کیا دیکھا"

"آں....."

"آنکھیں کھول۔"

اسے ڈفلوا کی آواز سنائی پڑی۔ لیکن وہ تو مست تھا۔ وہ تو ساکچھات گنیس ہی کو دیکھ رہا تھا۔ چاروں طرف جیسے نیلے نیلے رنگ برنگے بلب جل رہے ہوں۔ ٹھیک ویسے جیسے درگا پوجا میں جلتے ہوں....

"کیا دیکھا؟"

"ہاں۔" اس نے آنکھیں کھول دیں۔ چہرہ مسکرا رہا تھا۔ "دیکھا۔ گنیس جی کو۔ ساکچھات درسن ہوئے میرے کیا۔؟" ڈفلوا کا رنگ بھک سے بدلا۔

"تو نے گنیس جی کے درسن کیے۔؟"

"ہاں۔ آنکھیں بند کیا۔ اور گنیس جی کو دیکھا۔"

"سچی؟"

"ارے بالکل سچی۔"

پھر تو وہ جیسے ایک دم چونک گیا۔ گنیسوا نے گنیس جی کو دیکھا، چلاتا ہوا ڈفلوا،

ببلو اور دوسرے بچوں کے ساتھ اڑن چھو ہو گیا۔

پھر اس دن شام کی بات۔ ڈیوڑھی میں پتا جی، اماں کے ساتھ بھولا بابو، جتو، چودھری صاحب اور دوسرے کئی لوگ اسے گھیرے کھڑے تھے۔

"ارے تو سچ بولتا ہے رے....؟"

اماں بولیں۔ "لو۔ اب ان کی بھی سنو۔ جھوٹ کیوں بولے گا بھلا۔"

"اس سے پوچھنے دو۔" چودھری غصہ ہوئے۔

"تو نے گنیس جی کو دیکھا؟ سچ بتانا۔"

اس نے دیکھا چودھری سنجیدہ تھے۔ چودھری نے آج اس کی چٹلی بھی نہیں کھینچی۔ چودھری نے اسے ببن کی مہرارو بھی نہیں کہا۔ اور وہ سب جو ببن کی چارپائیوں پر بیٹھے تھے، سب اسے ایسے تاک رہے تھے جیسے اس سے پہلے کبھی دیکھا نہیں ہو۔ چاند سے اڑ کر آ گیا ہو ان کے سامنے۔ بھک سے۔

"سچ بتانا۔"

"بالکل سچ۔" اس نے چٹلی پکڑ لی۔ "گنیس جی کی سوگندھ۔ آنکھیں بند کیں اور درسن ہو گئے۔"

"کیسا لگا۔؟"

"لگے گا کیسا۔؟ کھوب روسنی تھی۔ چاروں طرف روسنی۔ اور گنیس بھگوان کھوب کھوس لگ رہے تھے..."

"لو، بچوا پر کرپا ہے گنیس جی کی" اماں بولیں۔

پتا جی بولے۔ "میں پہلے ہی کہتا تھا بچوا کچھ کرے گا دنیا میں۔"

ان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

"اب میں جاؤں کھیلنے؟"

اس نے پیار سے مسکراتے ہوئے اماں کی طرف دیکھا۔

"جا۔ مگر جلدی آ جانا۔"

"کیا۔؟" اماں کی بات پر جیسے اسے وسواس نہیں ہوا۔ کھیل کی بات اماں اتنی جلدی کیسے مان گئیں .... کوئی انہونی ہو گئی کیا۔ اماں تو پہلے اسے دو ہتھڑے مارتیں۔ وہ اماں کو چونٹی کاٹتا۔ اماں، بپھر کر اسے گالیاں دیتیں۔ وہ بھاگتا۔ اماں ڈنڈا لے کر اسے مارنے دوڑتیں۔ مگر یہ اچانک۔ کچھ بھی نہیں ہوا۔ اماں پیار سے مسکرائیں۔ اس نے چٹلی تھام لی۔ سب کنکن کا کمال ہے جیو۔

لد پھداتی جانگھیا اور بنیان پہنے اچھلتا کودتا وہ باہر آیا تو چنو منو ڈفلوا، ببلوا سب ایک لائن سے بھیلو میاں کے ریکٹ پر براجمان تھے۔

"چل.... ڈنگا پانی...."

"نہیں۔" ڈفلوا اسے دیکھ کر ہنسا تک نہیں۔

"کیوں۔؟" وہ ان کے پاس آگیا۔ "کبڈی؟"

"نہیں۔"

"چل۔ پھر بیر توڑتے ہیں۔"

"نہیں۔" ببلوا ہولے سے مسکرایا۔

"کیوں؟"

"تیرے ساتھ نہیں کھیلیں گے۔ بس۔"

"لیکن کیوں نہیں کھیلیں گے۔" اس نے ڈفلوا کو ٹھوکر ماری۔

"مار لے۔ لیکن تیرے ساتھ نہیں کھیلیں گے۔"

"پگلا گیا ہے۔"

"نہیں۔ اماں نے منع کیا ہے۔" ڈفلوا کے چہرے پر اتنا پیلاپن اس نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ "تو نے گینس جی کے درسن کیے ہیں۔ اب تو بڑا آدمی ہے۔"

"کیا۔؟"

وہ ہنس پڑا۔ ایک دم بھونچک۔ "میں بڑا آدمی۔ لے دیکھ، کنکن پکڑتا ہوں...."

چل یہی کھیل کھیلتے ہیں۔"

"نا" ڈفلوا نے جور سے نا کی ہنکار لگائی۔ "کنکسن پکڑنے کے لیے نہیں ہوتا۔ جو چھوئے اسے ایک چانٹا۔"

"کیا۔؟" اسے لگا سب باتیں الٹی پڑ رہی ہوں۔ مطلب بدل رہے ہوں.....

"کل تک تو کہتا تھا کہ اس کا کنکسن بھگوان سے جڑا ہے۔"

"جڑا ہے۔ لیکن پکڑنا نہیں چاہیے۔"

"کیوں نہیں پکڑنا چاہیے۔؟"

"دیکھ۔ ہم تیرے ساتھ نہیں کھیلیں گے اب۔"

ڈفلوا نے مہر لگا دی۔ "اماں نے کہا ہے تو بدل گیا ہے۔"

"میں بدل گیا ہوں...."

اسے ہنسی آ گئی۔ اس نے ڈھیلی ڈھالی جانگھیا سے نکلتے ٹیڑھے لکلے پاؤں دیکھے۔ پتلے پتلے ہاتھوں اور سینے کی دھنسی ہڈیوں کو دیکھا۔ ٹنڈ منڈ سر پر ہاتھ پھیرا۔

"نہ .... میں کہاں بدلا ہوں۔"

"تم بدل گئے ہو۔ تم گھر جاؤ۔" ببلو نے کہا۔

"جاؤں ؟"

اسے لگا اس کے خلاف اچانک دوستوں نے بغاوت کر دی ہو۔ ہونہہ .... اسے غصہ آ گیا۔ سارا قصور چٹلی کا ہے .... اسے کیا ضرورت تھی سپنے کے بارے میں بتانے کی۔ سارا قصور ....

"جاؤ مت کھیلو۔ کٹیں .... کٹیں"

انگوٹھا دکھاتے ہوئے تقریباً تیزی سے وہ گھر کی طرف بھاگا۔ گرتے پڑتے .... رسوئی میں اماں کچھ پکانے میں لگی تھیں۔ اس نے اماں کو جاتے ہی جھنجھوڑ دیا۔

"اماں۔ قینچی کہاں ہے۔"

"قینچی ؟"

"ہاں۔ میری یہ چٹلی صاف کر دو۔ کوئی میرے ساتھ نہیں کھیلتا۔ سب مجھے دیکھ کر چپ ہو جاتے ہیں۔"

"مورکھ۔" اماں نے پیار سے اسے سینے میں بھر لیا۔ "چٹلی صاف کرنے کے لیے نہیں ہوتی مورکھ۔ تو بچپن سے گنیس بھگوان کو پرنام کرتا آیا ہے نا۔ تیرے اندر ان کا نواس ہو گیا ہے۔"

اماں پتہ نہیں کیا کیا بولتی رہیں۔ وہ غور سے اماں کا چہرہ پڑھ رہا تھا۔ اماں کہہ رہی تھیں... "اب تو یہ لباس بھی نہیں پہنے گا۔ سمجھ گیا نا.... تیرے لیے اب..... سمجھ گیا نا..."

رات میں جوشی بھیا آئے تھے۔ اس وقت وہ اپنے کمرے میں تھا جب اماں اسے بلانے آئیں۔

"چل جوشی بھیا آئے ہیں۔"

"نہیں جاؤں گا۔ وہ میرا مجاک بنائیں گے۔"

"نہیں رے۔ چل نا۔ وہ بالکل تیرا مذاق نہیں اڑائیں گے۔"

"ایسا۔"

وہ جھٹ اماں کے ساتھ چل پڑا۔ اور سچ مچ چونک گیا۔ جوشی بھیا کافی گمبھیر لگ رہے تھے۔ اپنے آپ میں کھوئے ہوئے۔ اسے دیکھ کر منڈی ڈلائی۔

"بیٹھ جاؤ۔"

اسے لگا، جیسے ماسٹر جی نے پڑھاتے پڑھاتے اسے ڈنڈا دکھا کر چپ رہنے کا اشارہ کیا ہو۔ اماں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ چو.... پ۔ اس نے ہونٹ پر انگلی رکھ کر پتا جی اور جوشی بھائی کی طرف دیکھا۔ جو دھیرے دھیرے آپس میں مشورہ کر رہے تھے۔

"ضرورت..... میٹنگ پارٹی...."

"اس کا فیوز تو سچ مچ اڑ گیا۔ یہ سب کیا ہے۔؟ کل جیسا سب کچھ کیوں نہیں ہے..... یہ لوگ پہلے کی طرح اس پر ہنستے کیوں نہیں ہیں۔"

اس کے دل میں آیا، وہ جور جور سے رونے لگے۔

جوشی بھائی نے کہا۔ "کل تم میرے ساتھ چلوگے۔ اور ہاں۔ اب بچوں کے ساتھ نہیں کھیلوگے۔ جو ہم کہیں گے۔ وہی کروگے۔ سن لیا نا۔

"پتا جی بولے۔ کرے گا کیسے نہیں۔؟"

اماں مسکرائیں۔ "گنیس جی کا بھگت جو ہے....."

"لباس میں کیا رکھا ہے؟"

جوشی جی دیر تک اسے سمجھاتے رہے تھے..... "لباس میں بہت کچھ رکھا ہے۔ لباس سے آدمی کی جات بدلتی ہے.... انتر پڑتا ہے دوسروں کے دیکھنے میں..... دھرم سنکٹ میں ہے..... دھرم کو بچانا ہے.... سمجھ گیا نا....."

"ہاں سمجھ گیا۔"

اسے یاد آیا، ایک بار بچپن میں ایک درخت کی ٹہنی اس پر ٹوٹ کر گر پڑی تھی۔ باپ رے..... وہ کتنے جور سے چیخا تھا۔ کتنا بڑا دباؤ پڑا تھا۔ ٹہنی کا..... اسے لگا..... وہ ٹہنی دوبارہ اس کے جسم پر گر پڑی ہو..... لیکن وہ چیخ نہیں سکتا۔ ہاں دب ضرور گیا ہے۔

○○

رام دین کچھ نہیں بولے گا

(۱)

رام دین چپ ہے۔ ہونٹوں پر جیسے کسی نے نوکیلی کیل ٹھونک دی ہو۔ کیل کے ٹھونکے جانے کا اثر پورے چہرے پر ہے۔ لہولہان مگر خاموش۔ جیسے کسی خوفناک حادثے کے بعد چہرے پر سناٹا چھا جاتا ہے۔ تب صرف خوف و دہشت کی جھلساتی ہوئی آگ ہوتی ہے۔ سوچنے کے لیے کچھ بھی نہیں رہتا۔ تب اپنے آپ سے چھپنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ لیکن اپنے آپ سے کہاں تک بھاگے گا رام دین؟ کہاں تک منہ چھپاتا پھرے گا؟ اندھیرے میں چھپتا چھپاتا بھاگتا تو ایسا لگتا جیسے خون میں لپلپاتی خبریں اس کے انتظار میں ہوں۔

"ارے رام دین! کہاں تھا تو؟ تھانے دار جی تجھے کتنی بار یاد کر چکے۔ چل، تھانے بلایا ہے۔" پھر وہی ڈنڈے کی زبان۔ "بول بابا کہاں گیا؟ نہیں بولے گا؟۔"

گھر میں لگتا جیسے اماں، گنگوتری اور گنیس، سب کے ہونٹوں پر اسے دیکھتے ہی چپ کے تالے پڑ گئے ہوں اور آنکھوں میں شدید نفرت۔ سب اسے ایسے دیکھتے جیسے بابا کی گمشدگی میں اسی کا ہاتھ ہو۔

"بابا کہاں ہے؟"

اماں نے اڑتی اڑتی خبروں میں، صرف ایک بار، بیوہ ہونے کا دکھ جھیلتے ہوئے زور سے اس کے گریبان کو پکڑا تھا۔ "سچ بتا۔ بابا کو کہاں مار کر پھینک دیا؟ جانتی ہوں۔ تو نے ہی بابا کو مارا ہے۔"

اماں کی لرزتی ہوئی آواز کے ساتھ گنگوتری کی تیز سسکیاں جب ماحول میں گونجیں تو اسے ایسا لگا جیسے احتجاج کے سارے کپڑے ان اپنے کہے جانے والے لوگوں نے مل کر اس کے جسم سے اتار دیئے ہوں۔ تب اس نے گنیش کو دیکھا، جو اپنے مستقبل سے فکر مند کسی چٹان کی طرح اس کے سامنے تن گیا تھا۔

"تم بولتے کیوں نہیں؟ تم نے بابا کو کیوں مارا؟"

ایک جھٹکے سے اپنا گریبان چھڑا کر کانپتے قدموں سے وہ اپنی کال کوٹھری میں تو آ گیا، لیکن دل کو چین نہیں ملا۔ سب اسے غلط سمجھتے ہیں۔ صرف ایک بھیانک سی چپ۔ گہری چپ۔ اس نے دروازہ بند کر لیا۔ اندھیرے کمرے میں، کھولتے دماغ میں جیسے ہزاروں بھوتوں کا تانڈو شروع ہو گیا۔ اور اس تانڈو میں اس نے بہت پہلے کا ایک منظر دیکھا۔ تب وہ بچپن کے دروازے پر تھا۔ شرارتی، بدمعاش۔ اماں کی نظروں میں نکما۔ پڑھنے سے زیادہ اس کا دل بدمعاشی کرنے میں لگتا تھا۔ اور بابا کو تو پوجا پاٹھ سے فرصت نہیں ملتی تھی۔ اماں کہتی تھیں، پتہ نہیں کیسے سادھو کے گھر شیطان نے جنم لے لیا۔ بابا سچ مچ گیانی تھے۔ مہاپرش نہیں کہہ سکتا۔ ہاں بابا کی جڑیں دھارمک سنسکاروں (روایتوں) میں اتنی گہری تھیں کہ پوری زندگی میں کبھی اس نے بابا کے اصولوں میں تبدیلی نہیں دیکھی۔ جاڑا ہو، گرمی یا برسات، بابا منہ اندھیرے ہی اٹھ جاتے۔ جم کر اشنان کرتے۔ پھر دیر تک پوجا پاٹ چلتا رہتا۔ سب کا بھلا چاہتے۔ مسکرا کر کہتے کہ پوجا پاٹھ کرنے سے من شانت رہتا ہے۔ سب سے ہنس کر ملتے۔ چاہے پڑوس کا بنیا ہو، یا گنگو چمار، سید چچا ہوں یا سلیمان میاں، بابا سب کے یہاں جاتے تھے۔ اور سب کا بابا کے یہاں آنا جانا تھا۔ ہاں تو، ان دنوں وہ بچپن کی سیڑھیوں پر تھا۔ اور ان دنوں آج کی طرح ہر روز فساد نہیں ہوا کرتے تھے۔ ہاں ان دنوں ڈاکوؤں کی باتیں ضرور

ہوا کرتی تھیں۔ اجمیر سنگھ ڈاکو، ڈاکو بھوانی سنگھ، ڈاکو نہال سنگھ۔ ڈاکو بنج رام، کھنیا ڈاکو۔ تب گھر کے دروازے، جہاں دو چار لوگ بیٹھ جاتے تھے ان ہی ڈاکوؤں کے قصے چھڑ جاتے۔ جیسے ڈاکو بھوانی سنگھ کے بارے میں اسے معلوم تھا۔ بابا کہتے تھے، ریاست پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو ریاست سے بے دخل ہو کر ڈاکو بن گئے۔ بیہڑ میں نکل گئے۔ آئے دن چوری اور ڈکیتی کے واقعات ہوتے، قصے سنے سنائے جاتے۔ تب اماں جب بھیگا چاول، چارپائی پر پسارنے آتیں تو وہ تالی بجا بجا کر اماں کو چڑاتا:

دروا جامت کھولیو اماں، باہر ڈاکو ہیں

چاول چھوڑ مت جیو اماں، باہر ڈاکو ہیں

سونا جیور مت پہنیو اماں، باہر ڈاکو ہیں

دونوں ہاتھوں سے تالی پیٹ کر وہ سر میں سر ملا کر گاتا تو اماں گالیوں کی بوچھار شروع کر دیتیں۔

"ارے ناسپیٹا!، کم بخت! پڑھنے پڑھانے سے تو کام نہیں تیرے کو۔ ابھی بتاتی ہوں۔"

اماں چاول کوؤں کے آسرا پر چھوڑ کر اس کے پیچھے دوڑتیں تو وہ ہنستا ہوا گلیوں میں نو دو گیارہ ہو جاتا۔

گزری باتیں۔ وقت سب کچھ کتنی تیزی سے اچک لیتا ہے۔

گھر کی یہ کوٹھری کسی کال کوٹھری سے کم ہے کیا؟ رام دین کو ایسا لگتا ہے کہ وہ یوں چپ رہے گا تو دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی۔ وہ کچھ نہیں بولے گا.... اسے بھوک محسوس ہوئی۔ چوکے میں نکلا تو چولہا ٹھنڈا پڑا تھا۔ برآمدے میں نکلی چارپائی پر اماں کی آنکھیں کسی جنگلی بلی کی طرح اسے گھور رہی تھیں۔ اس نے غور سے دیکھا۔ اماں کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ جیسے جی بھر کر روئی ہوں۔ اماں کی آنکھوں کا سامنا کرنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ چھجے سے جھانکتے ہوئے اس نے اندھیرے کا جائزہ لیا کہ کتنا

وقت ہوا ہوگا۔ شاید ساڑھے آٹھ نو کے آس پاس۔ دروازہ کھول کر وہ باہر نکلا تو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے سب کی آنکھیں اچانک اس کی جانب اٹھ گئی ہوں۔ اس کے ذہن میں مسلسل آندھیاں چل رہی تھیں۔ ایک ایک قدم جیسے برسوں کا فاصلہ طے کر رہا تھا۔ دبے قدموں چلتے چلتے وہ چائے کی دکان پر آگیا اور چائے کا آرڈر دے کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ اسے ایسا لگا کہ اشاروں اشاروں میں لوگ اس کے بارے میں باتیں کر رہے ہوں۔

"بے چارے گنگا پرشاد جی....."

کوئی دبی آواز میں بولا۔ "غائب کیا ہوں گے؟ ہتیا کر دی ہوگی اس نے...."

پھر اسے دھیمی دھیمی پھسپھساہٹ سنائی دی۔ "کہتے ہیں، لمبا معاملہ ہے۔ پولیس تفتیش کر رہی ہے۔"

"لیکن کس بات کی تفتیش؟ گنگا پرساد تو بڑے بھلے آدمی تھے۔"

اس کے سامنے چائے آگئی۔ اس نے چائے کا گلاس کانپتے ہاتھوں میں تھام لیا۔ کلیجہ جل رہا تھا۔ دماغ میں آگ لگی ہوئی تھی۔ پھر کوئی آواز ابھری

"تین دن جیل میں رہ کر آیا ہے پولیس کی کافی مار پڑی ہے۔ مگر کچھ بتاتا نہیں۔"

ایک آواز اور ابھری۔ "کہتے ہیں، بے حد پیچیدہ معاملہ تھا۔ یہ آدمی......"

اس کی نس نس میں کسی نے تیزاب انڈیل دیا۔

آواز بہت دھیمی تھی۔ "سنا ہے، یہ آدمی شہر میں دنگے بھڑکانا چاہتا تھا......"

چھناک کی آواز ہوئی۔ رام دین نے گلاس تیزی سے زمین پر پٹکا۔ سب کی نگاہیں چونک کر رام دین کی طرف اٹھ گئیں، جو دھیرے دھیرے چلتا ہوا باہر نکل رہا تھا۔ کسی میں بھی اسے روکنے یا ٹوکنے کی ہمت نہیں تھی۔ نہ رام دین نے ہی کسی کی طرف گھوم کر دیکھا تھا۔ اس نے گلاس پٹکا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

وہی کال کوٹھری۔ وہی اندھیرے کا سامراج۔ ایک نرک کمرے کا اور ایک

جسم کے اندر کا۔ سب اسی کو خطاوار ٹھیراتے ہیں۔ مگر بابا کہاں گئے؟ بابا کو اس نے آخری بار کب دیکھا تھا؟ اس کا قصور کیا ہے۔ اس کا قصور صرف اتنا ہے کہ اس نے ایک سچ کی وضاحت چاہی تھی اور نتیجہ میں بابا سے اس کی ہلکی سی جھڑپ بھی ہوئی تھی۔

وقت نے بابا کو بھی بدلا تھا۔

اور اس کی غلطی یہ تھی کہ اس نے بابا کو اسی پرانے گیانی کے لباس میں دیکھنے کی آرزو کی تھی۔ جس لباس سے اسے محبت تھی، عقیدت تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ بابا یہ لباس اپنے جسم سے اتار پھینکیں۔ مگر بابا یہ لباس اپنے جسم سے اتار پھینکنے پر مجبور کیے جا رہے تھے۔

اسے سب کے چہرے یاد تھے۔ تھانے دار دیس مکھ کا چہرہ، جو برسوں سے پرموشن کے لیے دوڑ لگا رہے تھے۔ ایس پی اجیت سنگھ، گوپی کلکرنی، جو ایک بڑی فرقہ پرست پارٹی کا مکھیہ کاریہ کرتا تھا۔ سب کے چہرے اس کے ذہن پر نقش تھے۔

دھیرے دھیرے یہ سارے چہرے اس کی آنکھوں میں اترتے ہیں۔ اسے ایسا لگتا ہے کہ اس کی حالت سیاسی گدھوں کے پنجوں میں پھنسی ہوئی ایک معمولی چڑیا کی طرح ہے۔ معصوم بے زبان چڑیا۔ گدھ کے خونی پنجے مسلسل اس چڑیا کی طرف بڑھتے جا رہے ہوں......

بابا اس روز رات بھر نہیں آئے۔ رات کے آٹھ بجے تک یہ پوری پلٹن اس کے یہاں موجود تھی۔ ایس پی اجیت سنگھ، گوپی کلکرنی اور تھانے دار دیس مکھ۔ وہ چائے لے کر کمرے میں داخل ہوا تھا۔ اس وقت وہ واقعہ ہوا تھا۔

بابا اس پوری رات نہیں آئے۔ رام دین رات کے ساڑھے گیارہ بجے گھر لوٹا تو اماں کی آنکھیں فکر میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

"بابا نہیں آئے؟"

"میرے ساتھ تو نہیں گئے تھے۔"

"تیرے ساتھ نہیں گئے تھے؟" گنگوتری کی آنکھوں میں تشویش تھی۔ "ایسا تو بابا نے کبھی نہیں کیا!"

اماں نے اس کی طرف دیکھا۔ "کہیں ایسا تو نہیں....."

"ہو سکتا ہے، ان ہی لوگوں کے ساتھ چلے گئے ہوں... ٹھیرو۔ میں دیکھ کر آتا ہوں۔"

پہلا گھر ایس پی اجیت کا تھا، جہاں اسے سوتے سے جگانے پر زوردار پھٹکار ملی۔

تھانے دار دیس مکھ نے اسے شک کی نظروں سے دیکھا۔ "ابے کوئی نئی چال تو نہیں چل رہا تو؟ ٹھیک۔ کل صبح دیکھا جائے گا۔"

گوپی کلکرنی کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ "ہم تو آٹھ بجے نکل گئے تھے۔ اتنی رات گئے کہاں ہوں گے گنگا پرساد جی؟ اچھا، ایسا کرو، صبح خبر کرنا کہ گھر آئے یا نہیں۔ سمجھا؟"

وہ اکیلا گھر لوٹا تو اماں اور گنگوتری کے صبر کا باندھ ٹوٹ چکا تھا۔ رام دین نے ٹہلتے ٹہلتے پوری رات گزاری۔ کوئی نہیں سویا۔ اماں پر بے ہوشی کا دورہ پڑ گیا۔ صبح ہوتے ہی تھانے دار دیس مکھ وردی پہنے، جیپ میں سوار آدھمکا۔

سب سے پہلے تھانے دار نے اماں کو دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا۔ "وہی تو کہہ رہا ہوں، کہاں چلے گئے....."

دھیرے دھیرے ہاتھوں میں ڈنڈا نچاتے ہوئے وہ رام دین کی طرف بڑھا۔ اور رام دین ایک دم چونک گیا۔ دیس مکھ کی آنکھوں میں گرگٹ کی تصویر بنی ہوئی تھی۔

"سچ سچ بتا۔ کہاں گئے گنگا پرساد؟"

"جی......"

گھر والے اچانک شک کے دائرے میں اسے دیکھنے لگے۔

"ناٹک مت کر۔ میں پھر پوچھ رہا ہوں، سچ سچ بتا!" ڈنڈا اس کے جسم پر لگا۔ "بول۔ کہاں گئے گنگا پرساد؟" ڈنڈا دوبارہ پڑا۔ اچانک مار سے وہ بوکھلا گیا۔

"بہت دیکھ چکا ہوں تیرے جیسے ناٹک کرنے والے۔ بول، کہاں مار کر پھینک دیا؟"

اس نے اماں کی طرف دیکھا، جو اچانک بلکتی ہوئی چیخ پڑی تھیں۔

دیس مکھ چیخا۔ "سب بتائے گا، بتائے گا کیسے نہیں؟ باپ سے لڑتا تھا؟"

اس نے دوسری چیخ گنگوتری کی سنی۔۔۔۔

"دنگا کرائے گا شہر میں۔ کیوں؟" دیس مکھ نے پینترا بدلا۔ "گنگا پرساد جی کہہ رہے تھے، آوارہ نکل گیا ہے سالا۔"

اس کی آنکھوں کے آگے گہرا اندھیرا چھا گیا۔ اندھیرا پھیلتے پھیلتے اس نے صرف اتنا دیکھا کہ گنیس نے چیختے ہوئے اس کا گریبان تھام لیا۔ "چھوڑوں گا نہیں تجھے۔ بابا کہاں ہیں؟"

دیس مکھ نے پھر اسے ڈنڈے سے پیٹا۔ "چل تھانے!"

جلتے ہوئے دماغ میں پھر بھوتوں نے تانڈو شروع کر دیا۔

یقین اور بے یقینی میں کتنے قدموں کا فاصلہ ہے۔ بابا کی گمشدگی سے زیادہ بڑا صدمہ اسے اس بات کا تھا کہ دیس مکھ نے اس پر شہر میں دنگے بھڑکانے کا الزام لگایا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ یقین اور بے یقینی میں اتنے قدموں کا فاصلہ ہے کہ اس کے بدن پر لباس اور دوسرا لباس کے ہونے کو جھٹلا رہا ہے۔ ایک بار بہت پہلے اس نے دیس مکھ چاچا سے کہا تھا "مجھے جیل نہیں دکھاؤ گے؟" تو دیس مکھ نے ڈانٹ دیا تھا، "وہاں گندے لوگ ہیں۔" لیکن اب کال کوٹھری میں گھستے ہی اسے ایسا لگا جیسے ملک کا یہی حصہ ہے جو گندگی سے محفوظ رہ گیا ہے۔ کون کہتا ہے کہ یہاں گندے لوگ بستے ہیں؟

دیس مکھ نے ڈنڈا نچایا۔ "بول! گنگا پرساد کہاں گئے؟"

"کہاں مار کر پھینک دیا؟"

"تو ایسے نہیں بولے گا۔ یہ ڈنڈا بڑے بڑوں کو بولنے پر مجبور کر دیتا ہے۔" دیس مکھ پر جیسے جنون سوار ہو گیا۔ "بول کہاں مار کر پھینک دیا؟"

اسے محسوس ہوا کہ دیس مکھ کی آنکھیں اسے ٹٹول رہی ہیں کہ بول، جس وقت ہماری بیٹھک چل رہی تھی، تو سن رہا تھا کیا؟

دیس مکھ نے پھر پینترا بدلا۔ "ہم جانتے ہیں، تیرے سے خوش نہیں تھے گنگا پرساد جی۔ اس دن بیٹھک کے بعد تو کہاں چلا گیا تھا؟ گنگا پرساد بھی تیرے ساتھ گئے تھے؟"

دیس مکھ اس کا کندھا پکڑ کر جھنجھوڑتا رہا۔ "کچھ بولتا کیوں نہیں؟"

(۲)

یہ اتفاق کی بات تھی کہ ان دنوں میں ایک ضروری کام سے باہر گیا ہوا تھا۔ واپس آیا تو بابا کی گمشدگی، رام دین کی گرفتاری پھر اس کے چھوٹ جانے کی خبر ملی۔ اور یہ بھی کہ قتل کے شک سے وہ ابھی بری نہیں ہوا ہے۔ تفتیش چل رہی ہے۔ ثبوت کی غیر موجودگی میں وہ رہا ضرور ہو گیا ہے، لیکن شک کی سوئی گھوم پھر کر اسی پر واپس آجاتی ہے۔ پولیس بار بار اسے پریشان کرتی رہتی ہے۔ اصلیت کا پتہ لگانے کے لیے گنگا پرشاد کی لاش کا ملنا ضروری ہے۔ رام دین میرا دوست نہ ہوتا تو شاید میں بھی گنگا پرشاد کے قتل کا شبہ اس پر کر سکتا تھا۔ مگر رام دین تو ایک چڑیا کا پر بھی نہیں کتر سکتا تھا، چڑیا کو مارنا تو دور کی بات۔ گنگا پرشاد کے بارے میں مجھے اتنا پتہ تھا کہ وہ مذہبی خیالوں والے آدمی ہیں اور بلا ناغہ پوجا پاٹھ کرتے ہیں۔ ان کی دوستی سب سے تھی۔ وہ اس برہمن واد کے خلاف تھے جہاں ذات پات کی نفرت جیسی بیماریاں فروغ پاتی ہیں۔

مجھے یاد آیا اس دن رام دین کہہ رہا تھا۔ "بابا بدلنے لگے ہیں۔ اب ان کی

آنکھوں میں مندر، مسجد، رام، رحیم الگ الگ خانوں میں بٹنے لگے ہیں۔"

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "جو لوگ مذہب کو مانتے ہیں، یہ خانے تو ان کے ذہن میں ہوتے ہی ہیں۔"

"نہیں یار۔" رام دین نے بوجھل سانس لی۔ "بابا کے ذہن میں یہ خانے پہلے نہیں تھے، لیکن اب آگئے ہیں۔ اور آئے نہیں ہیں بلکہ وہ یہ خانے بنانے پر مجبور کیے جا رہے ہیں۔" اس نے دبی آواز میں بتایا۔ "یہ کلکرنی وغیرہ کا بابا سے ملنا مجھے پسند نہیں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ لوگ بابا کے اثر و رسوخ سے غلط فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔"

"میرے زور دینے پر اس نے مزید بتایا۔" کلکرنی پارٹی میں اپنی پہنچ بڑھانا چاہتا ہے۔ اس لیے۔ خیر چھوڑو۔" اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ "بات اگر صرف آنکھوں کے بدلنے کی ہوتی تو مجھے اعتراض نہ ہوتا۔ بابا سچ کو پہلے ویسا محسوس نہیں کرتے تھے، لیکن اب دھیرے دھیرے کرنے لگے ہیں۔ میری ان سے جھڑپ بھی ہوئی۔"

"کیا کہہ رہے ہو! میں کچھ سمجھا نہیں۔"

لیکن رام دین نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں۔ وہ اپنی دھن میں کہتا رہا۔ "کوئی اور بدلتا تو شاید مجھے اتنا دکھ نہ ہوتا، جتنا بابا کے بدلنے سے .... بابا دھارمک ضرور تھے، لیکن .... مجھے شردھا اس لیے تھی کہ وہ سب دھرموں کا احترام کرتے تھے۔ اسی لیے دھرم کے بارے میں میری اپنی الگ طرح کی سوچ تھی۔ فرقہ پرست وہی لوگ ہوتے ہیں جن کا ٹھیک طرح اپنے دھرم پر جماؤ نہیں ہوتا۔ اور جو بابا کی طرح دھرم پر جماؤ رکھتے ہیں، وہ کسی بھی دھرم کے ہوں، غلط نہیں ہو سکتے۔ یاد ہے، ایک بار محلے کے ایک مسلمان لڑکے کی شکایت کرنے پر بابا نے مجھے تھپڑ مارا تھا۔ وہ تھپڑ آج بھی محسوس کرتا ہوں۔ دیکھو۔"

اس نے گال کی طرف اشارہ کیا۔ "ہاں.... اب بھی اس مار کی یاد سے کھال پر جلن ہوتی ہے۔ یہاں مارا تھا بابا نے.... کہ یہ مسلمان کیا ہوتا ہے اور ہندو کیا ہوتا

ہے۔ بچپن سے صحیح تربیت نہ ملے تو انسان غلط راستوں پر چلا جاتا ہے۔ ہاں ای کہا تھا بابا نے۔ برسوں بعد جب ای بات میں نے بابا سے کہی تو بابا جڑ سے اکھڑ گئے۔"

"کیوں؟"

"بابا بولے: میں جانتا ہوں، دیس مکھ اور بابو کلکرنی کا یہاں آنا تمہیں اچھا نہیں لگتا۔ تم سمجھتے ہو وہ لوگ مجھے بہکا رہے ہیں۔ یہ کہہ کر بابا نے تیز آنکھوں سے مجھے گھور کر دیکھا۔ پھر بولے: اپنے ملک کو اپنا ملک کہنے میں کاہے کی شرم؟ اور یہی بات کلکرنی اور دیس مکھ مجھے بتاتے ہیں تو اس میں غلط کیا ہے؟ بابا کا چہرہ خوفناک ہونے لگا۔ انہوں نے کہا: ادھرمی ہو تم۔ نئی پڑھی کے ہو۔ بیچ دینا چاہتے ہو اپنے دیس کو۔ ارے یہ فرنگی، مسلمان سب ودیشی ہیں۔ سب باہر سے آئے ہیں اور ہندوؤں پر راج کیا۔ یہی تو سمجھاتے ہیں کلکرنی بابو۔ مل کر رہنے کو کہتے ہیں۔ ایکتا چاہتے ہیں ہماری۔"

رام دین نے گہری سانس کھینچی اور پھر کہنے لگا "کتنے ہی موقعوں پر میں نے بابا کو سمجھانا چاہا مگر ایسا لگا کہ۔ گوپی کلکرنی، ایس پی اجیت اور دیس مکھ کی باتوں کا دھواں بابا کی رگ رگ میں سما چکا ہے۔ میں جتنا سمجھاتا، بابا اتنا ہی بھڑک جاتے۔ آخر میں صرف اتنا کہا "آپ ان کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں۔ وہ آپ کو مہرہ بنا رہے ہیں۔ آپ کے اثر ورسوخ کا فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ اس لیے کہ سماج میں بات آپ کی مان لی جائے گی۔ ان کی نہیں۔ اور آپ کے ایک اشارے پر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اور ......"

رام دین کی آنکھوں میں خوف سما گیا۔ "شہر کی حالت بھی اچھی نہیں ہے۔"

رام دین نے بہت دیر کے بعد میری آنکھوں میں جھانکا۔ سچ بتانا۔ یہ وہی شہر ہے نا جہاں ہم ہندو مسلم ملاپ کے قصے سنتے ہوئے بڑے ہوئے ہیں۔ کیا آج کی فضا میں یہ سارے قصے فرضی نہیں لگتے؟ کچھ ہلکا سا غم و غصہ تمہیں ان کی آنکھوں میں سلگتا نظر نہیں آتا۔ جیسے سب ناٹک کر رہے ہوں۔ مندر، مسجد جانے والوں کی تعداد تو بہت کم ہے، مگر یہ مندر، مسجد جیسے سب نے اپنے اپنے دلوں میں بنا رکھے ہیں۔ ہم، تم سب

دو غلے ہو چکے ہیں۔ میز پر، چائے خانوں میں خالی لفظوں کے سہارے دوستی ہوتی رہتی ہے، لیکن سچائی اتنی ہے کہ ایک طرف مسجد اور دوسری طرف مندر۔ اور جب تک فیصلہ نہیں ہوتا آگ بھڑکتی رہے گی۔"

"مجھے یاد آیا، پچھلے سال کئی بار شہر میں دنگے بھڑکتے بھڑکتے بچے تھے۔ بقرعید کے موقع پر، پھر رام نومی، درگا پوجا کے موقع پر۔ لیکن دونوں بار بات آگے نہیں بڑھی۔ رام دین کے کھولتے ہوئے چہرہ میں مجھے لرزتے ہوئے شہر کا عکس نظر آیا تھا۔ رام دین کی ایک ایک بات یاد آرہی تھی۔ گنگا پرشاد کی گمشدگی کی خبر سن کر رام دین سے ملنا اور بھی ضروری ہو گیا تھا۔

اس وقت بھی رام دین اسی کال کوٹھری میں تھا۔ لٹا لٹا سا۔ چہرے کا رنگ اڑا ہوا۔ داڑھی کئی دن کی بڑھی ہوئی۔ کپڑے بھی گندے میلے ہو رہے تھے۔

"یہ سب۔؟"

اس نے میری طرف دیکھا۔ کچھ بولا نہیں۔ چپ چاپ کمرے میں کنارے پڑی کرسی پر بیٹھا دیوار کو گھورتا رہا۔

"کچھ بتاؤ گے نہیں؟ بابا آخر گئے کہاں؟"

اچانک اس کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ آئی۔ "تم بھی اسی طرح پوچھ رہے ہو، جیسے دیس مکھ پوچھتا ہے۔"

"رام دین۔" مجھے اس پر ترس آیا۔ "کچھ بولو گے نہیں تو ثابت کیسے ہو گا؟"

رام دین کی آنکھوں میں پھر خون اتر آیا۔ "کیا بولوں؟ یہ کہ میں نے ہتیا نہیں کی؟ بابا کی گم شدگی میں میرا کوئی ہاتھ نہیں؟ اتنا تو وہ بھی جانتے ہیں۔"

"پھر ....؟"

اس کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ تھی۔ "تم نہیں سمجھو گے۔ دراصل وہ لوگ مجھ سے کچھ اگلوانا چاہتے ہیں اور جو اگلوانا چاہتے ہیں وہ میں کہوں گا نہیں۔"

مجھے سکتہ مار گیا۔ "لیکن کیا اگلوانا چاہتے ہیں؟"

وہ تلخی سے ہنسا۔ "ساری کہانی تو بس یہی ہے۔"

"تو تم سچائی ظاہر کیوں کر دیتے؟"

اس بار رام دین نے مجھے ایسے دیکھا جیسے کسی بچے نے کتاب میں گائے کو بندر، پڑھ دیا ہو۔ وہ پھر چپ ہو گیا۔

میں نے اسے تھوڑا سا اور کریدا تو وہ لاوا کی طرح پھٹ پڑا۔ "کیا سننا چاہتے ہو؟ خیر سنو، تم کو یاد ہو گا، پچھلے سال تین بار شہر میں فساد کرانے کی پوری تیاری کی گئی جو ناکام رہی۔ یعنی فساد نہیں ہو سکا۔ فساد کیوں نہیں ہوا؟ فساد اس لیے نہیں ہوا کہ ان کی پلاننگ آدھی کچی آدھی پکی تھی۔ آدھی پکی کا مطلب یہ کہ پولیس تو ان کے ساتھ تھی مگر عوام میں جتنا زہر بھرا ہونا چاہیے تھا، اتنا بھر نہیں پایا تھا۔ اور جب تک یہ زہر اندر اندر رگوں میں بھرا نہیں جاتا، فساد تو ممکن ہی نہیں تھا۔"

رام دین کی آنکھیں سلگ رہی تھیں۔ "دیس مکھ کو پروموشن کی پڑی تھی۔ ایس پی اجیت سے کلکرنی نے کافی پیسہ دلانے کا وعدہ کر رکھا تھا۔ اور کلکرنی اپنی فرقہ پرست پارٹی کا دل جیت کر پارلیمنٹ کے الیکشن میں کھڑا ہونا چاہتا تھا۔ اور ان سب کے لیے شہر میں ایک بڑے دنگے کی ضرورت تھی۔ بابا بہت اچھا بولتے تھے اور بابا کی بات سب مانتے تھے۔ کلکرنی امن مارچ کا سہارا لے کر بابا سے وہ سب کہلوانا چاہتا تھا جس سے شہر کا رنگ بدل جائے۔ اور اس بدلے ہوئے رنگ کو بھی کیش کیا جا سکے۔ جس دن بابا غائب ہوئے اس سے دو روز پہلے بھی ہمارے یہاں ان سب کی بیٹھک ہوئی۔"

رام دین کی آنکھوں میں سایہ سا لہرایا۔ پرانے منظر پھر اس کی آنکھوں میں زندہ ہو گئے۔ کمرے کے اندر جاتے جاتے وہ ٹھہر گیا تھا " کلکرنی کہہ رہے تھے شہر کے لوگوں میں چیتنا جگانے کے لیے ضروری ہے کہ آپ ان کے اندر کے ہندوتو، کو جگائیں۔ سوچیے آپ کا کتنا مان دان ہو گا اور پھر یہ دھرم کا کام بھی ہے۔"

دیس مکھ نے سگریٹ کا دھواں چھوڑا۔ "آپ بتائیں گے کہ یہ ملک ہمارا ہے۔ باقی وویشی ہیں۔ اور جو وویشی ہیں وہ یا تو باہر چلے جائیں یا اس ملک میں رہنا ہے تو ہماری ہر بات ماننی ہوگی۔"

رام دین جس وقت کمرے میں داخل ہوا،اس کے چہرے پر غصے کا ابال آیا ہوا تھا۔ اندر آتے ہی وہ پھٹ پڑا۔ "آپ لوگ بابا سے کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا کرانا چاہتے ہیں بابا سے آپ لوگ؟"

"رام دین!" بابا چیخے!

رام دین تمیز اور اخلاق بھول کر چیخا" بابا! یہ لوگ آپ سے خون کرانا چاہتے ہیں۔ ہزاروں....."

ایس پی اجیت نے کرسی سے اٹھ کر ایک زور کا چانٹا اس کے گال پر مارا۔ دوسرا تھپڑ دیس مکھ نے لگایا۔ "اپنی اوقات سے زیادہ بول رہا ہے تو!"

رام دین نے دیکھا، گوپی کلکرنی فکر میں کرسی سے سٹ کر بیٹھ گئے۔ بابا لال لال آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے چیخے" سمجھ میں کچھ آتا واتا نہیں۔ جو چاہا بول دیتا ہے۔ اندر جا کم بخت!"

اس رات رام دین نے دیکھا بابا دیر تک کمرے میں ٹہلتے رہے۔ اس رات، ساری رات رام دین اپنے شہر کو شعلوں میں جلتا ہوا دیکھتا رہا۔ پتہ نہیں کیوں بار بار ایک ہی منظر اس کی آنکھوں میں ابھرتا رہا۔ بابا کے پیچھے ایک لمبا کارواں ہے۔ سب کے ہاتھ میں مشعلیں ہیں۔ پورا شہر جل رہا ہے۔ دوسرے دن اس نے بابا کو دیکھا۔ بابا کا چہرہ اترا ہوا تھا۔

رام دین سارے منظر تازہ دیکھ کر چپ ہو گیا تو میں نے پوچھا "یہ باتیں تم نے بتائیں کیوں نہیں؟"

"کیسے بتاتا؟ اس کے چہرے پر زہریلی مسکراہٹ تھی۔ "اس لیے کہ اتنا تو وہ بھی جانتے ہیں کہ میں بابا کی ہتیا نہیں کر سکتا۔" اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ "اس

دن، یعنی اس واقعہ کے تیسرے روز ۲۰۰ مارچ کو یہ تینوں بابا کے گھر آئے تھے۔ لیکن تین دنوں میں، میں بابا کے چہرے پر ہزار اتار چڑھاؤ دیکھ چکا تھا۔ پھر بھی مجھے بابا کے فیصلے کا انتظار تھا۔ رات کے آٹھ بج گئے تھے جب میں چائے لے کر اندر داخل ہوا۔ کمرے سے تیز تیز بولنے کی آواز آرہی تھی۔ میں چونک گیا۔ آواز بابا کی تھی جو غصے میں بھرے کہہ رہے تھے۔

"نہیں، میں نہیں جاؤں گا۔ میں آپ لوگوں کا منشا سمجھ گیا ہوں۔ رام دین ٹھیک کہتا ہے۔"

رام دین کے ہاتھوں میں چائے کی ٹرے کانپ گئی۔

بابا زور سے بول رہے تھے۔ "آپ لوگ اچھے بھلے شہر کی شانتی ختم کرنا چاہتے ہیں۔ آپ لوگ دنگا کرنا چاہتے ہیں....."

اس سے پہلے کہ کلکرنی یا دیس مکھ کچھ کہہ پاتے، رام دین سے ایک غلطی ہو گئی۔ وہ چائے لے کر اندر داخل ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ کلکرنی کچھ کہتے کہتے رک گیا ہے۔ بابا کے منہ سے لمبی لمبی سانس نکل رہی تھی۔

دیس مکھ نے غصے سے اسے دیکھا۔ "ابھی باہر جاؤ۔"

اس کے پاؤں کانپ گئے۔ آنکھوں میں خوف کی لرزش تھی۔ اسے ایسا لگا کہ سب کچھ جل جائے گا۔ سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ پتہ نہیں کیوں، وہاں وہ ٹھہر نہیں سکا۔ وہیں سے باہر نکل گیا۔ چپ چاپ۔ گیارہ ساڑھے گیارہ تک آوارہ گردی کرتا رہا۔ پھر گھر لوٹا تو بابا گھر میں موجود نہیں تھے۔

یہ بتانے کے بعد رام دین نے گہری سانس کھینچی۔ پھر میری طرف دیکھا۔ "سارا قصور شک کا ہے اور وہ اس شک کو لگاتار کرید رہے ہیں۔ کبھی کبھی حیرت ہوتی ہے کہ میں کیوں انکار کر دوں کہ جب میں چائے لے کر کمرے میں گیا تھا تو میں نے ان کی کوئی بھی بات نہیں سنی تھی۔ مگر کیا میرے انکار سے ان کی تسلی ہو جائے گی۔ شاید نہیں۔ انکار کے باوجود وہ شک کے گھیرے میں ہی رہیں گے کہ رام دین پتہ نہیں

کب اپنی زبان کھول دے۔ ابھی چپ ہے، موقع کے انتظار میں ہے، سنو۔"

وہ میرے کانوں کے پاس اپنے ہونٹ لایا۔ "میں کب تک ان لوگوں سے بھاگتا پھروں گا۔ صرف ایک جھوٹے شک کے لیے جو ہے، اور جو وہ جان رہے ہیں اور پھر بھی ماننے کو تیار نہیں۔ سنو، اب ایک شک میرے اندر بھی آگیا ہے۔ جب کہ یہ شک نہیں حقیقت ہے۔ کہ بابا کی طرح یہ لوگ میری بھی .... میں آخر کب تک بھاگتا رہوں گا....."

میں نے دیکھا، رام دین کا چہرہ اب بچوں جیسا پر سکون تھا۔ وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا۔ "سنو تم کیا کہتے ہو؟ کیا اس شک سے باہر نکل آؤں اور ان کی ہتیا کر دوں؟ کیونکہ اب ایک ہی راستہ رہ گیا ہے میرے پاس۔"

OO

شمع ۱۹۹۳ء

قومی آواز.....۹۳ء

میرا ملک گم ہو گیا ہے

(۱)

صبح اٹھے تو سب کچھ بدلا بدلا سا لگا، ابراہیم بھائی کو۔ در، دروازے، کھڑکیاں اور گھر.... وہ آنکھیں پھاڑے اپنے گھر کو ایسے گھور رہے تھے جیسے کسی انجانے گھر میں آ گئے ہوں... کمرہ... ادھر ادھر چھترائے سامان...... بے رونق دیواریں۔ اندر دل نہیں لگا تو باہر نکل آئے۔ ایک لمبی سڑک مکان سے ہوتی ہوئی آر پار گزر گئی تھی۔ سڑک پار دو چار کپڑے کی دکانیں تھیں۔ ملکانی صاحب، ابھیمنیو یادو وغیرہ کے مکان... یعنی سب جان پہچان والے... نہیں جان پہچان والے نہیں، غیروں کے۔

گھر سے باہر نکلے تو بدن میں جیسے خوف ہی خوف پسر گیا۔ ٹھیک اسی وقت پولیس کی ایک جیپ دھواں چھوڑتی ہوئی گزری۔ ابراہیم بھائی ڈر کے چھپ گئے... جیسے پولیس کے سپاہی نے اگر دیکھ لیا تو فوراً جیپ روک دے گا۔ پھر ان سے انکا

---

(۱) یہ کہانی بابری مسجد شہادت سے پانچ دن پہلے لکھی گئی۔ مجھے احساس ہے کہ کہانی میں میرا لہجہ ذرا سخت اور جذباتی ہو گیا ہے۔ مگر ایسا شاید اس لیے ہوا کہ اس وقت میں کچھ ایسے ہی واقعات سے دوچار رہا۔ میں ایک کرائے کے گھر میں تھا اور رتھ یاتراؤں کے مستقل عذاب جھیل رہا تھا۔

نام پوچھے گا۔ وہ نام بتائیں گے تو وہ زور زور سے ہنسے گا۔ پھر..... انہیں چپ چاپ، شوٹ کر دے گا، جیسے عام طور پر لوگ پاگل کتوں کو شوٹ کر دیتے ہیں۔

جیپ آگے بڑھ گئی تو تیز تیز چلتی ہوئی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے انہوں نے سڑک کا جائزہ لیا۔ دل اچانک پھر زور زور سے دھک دھک کرنے لگا۔ انہیں لگا، ابھی اچانک دنادن زور زور سے سڑک پر گولیاں چلنی شروع ہو جائیں گی.... دنا... دن۔ پھر سڑکوں پر لاشیں ہی لاشیں بچھ جائیں گی۔ چیختے چلاتے لوگوں کی بھیڑ ان کے گھر پر دھاوا بول دے گی۔ دروازہ نہیں ٹوٹے گا تو مشتعل لوگ دروازے میں آگ لگا دیں گے۔ پھر چیختے چنگھاڑتے، دھکم پیل کرتے اندر گھس جائیں گے اور....

"چھپاؤ..... چھپاؤ..."

کمرے میں دوبارہ واپس آتے ہی ابراہیم بھائی نے چیخنا شروع کر دیا۔ "سب کچھ چھپا لو.... کچھ بھی سامنے نہیں رہنا چاہیے۔ جس سے پتہ چلے کہ تم کون ہو..... سمجھے ......ایسا کچھ بھی یہاں نہیں رہنا چاہیے۔"

دیوار پر اسلامی کلینڈر ٹنگا تھا۔ ایک چھوٹا سا بچہ قرآن شریف کی تلاوت کر رہا تھا۔ انہوں نے جھٹ آگے بڑھ کر کلینڈر اتار لیا۔ اسے موڑنے لگے۔ ریک پر اردو کی کتابیں ایک قطار سے سجی تھیں۔ انہوں نے ذرا بھی دیر نہیں کی۔ مسہری سے چادر کھینچ لیا۔ اردو کی کتابیں جلدی جلدی ریک سے نکال کر چادر پر پھینکنے لگے۔ ان کی سانس تیز تیز چل رہی تھی..... "کچھ بھی نہیں رہنا چاہیے۔ کچھ بھی نہیں۔"

چادر کی گٹھری اتنی ہی وزنی تھی۔ جتنا ان کے دماغ پر رکھا ہوا وزنی پتھر۔ اٹھانا چاہا تو ٹھہر گئے۔ " کمبخت...اب اٹھاؤ تو اٹھتی نہیں...... یہاں چھوڑ بھی نہیں سکتے۔ کوئی آ گیا تو؟ کسی نے دیکھ لیا تو؟ گٹھری کے چاروں طرف جھانکتے کونوں سے اردو کے حروف تو نظر ہی آ رہے ہیں۔" انہیں لگ رہا تھا، قصاب کا چھرا ہر وقت ان کی گردن پر تیار ہے..... کسی وقت بھی یہ چھرا ان کی گردن اتار سکتا ہے.....

گٹھری کو جھٹک کر آنکھیں سیدھی کیں تو طاق پر جزدان میں رکھے کلام پاک پر نظر چلی گئی۔ بدن میں سمائی کپکپی جیسے ان کا پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھی۔ اب کلام پاک کا کیا کریں؟ وحشی گھر میں گھس جائیں تو۔ جان تو جائے گی ہی۔ ایمان بھی سلامت نہیں رہے گا... آگے بڑھے ابراہیم بھائی۔ کلام پاک کو ہاتھوں سے اٹھایا۔ آنکھوں سے چوما۔ سینے سے لگایا۔ وحشت اور گھبراہٹ کے عالم میں آگے بڑھنا چاہا تو ٹھٹھک گئے۔ لگا، دروازے کھڑکیوں میں سو سو آنکھیں پیدا ہو گئیں ہیں۔ اور یہ آنکھیں بری طرح سے انہیں گھور رہی ہیں.....

...۔ کہاں جاؤ گے ؟

...۔ کہیں بھی۔

...۔ کہیں بھی ؟

...۔ ہاں۔ جہاں سکون ہو۔

...۔ تمہارے لیے ؟

...۔ "کیوں؟"

وہ سہم گئے....

جواب ملا۔ "تمہارے لیے کہیں سکون نہیں ہے۔ یہ طے ہے تم مارے جاؤ گے۔"

لگا، دیوار کی آنکھوں نے اپنا کھرا فیصلہ سنا دیا۔ کہیں بھی جاؤ گے، نکالے جاؤ گے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا، دو چار برس کہیں بھی مہاجر بن کے جی لو گے۔ آخر میں موت یقینی ہے۔ مارے جاؤ گے۔ یہی سچ ہے۔

وہ ایک دم سے ڈر گئے۔ گھگی بندھ گئی۔

"...۔ کہاں جاؤں؟"

"[illegible] گئے ... یہاں سب، آس پاس [illegible] لے تمہارے مسلمان بھائی مکان خالی کر گئے۔ اکیلے تم رہ گئے ہو۔ اور یہ سب..."

دیوار میں لگی آنکھوں نے جیسے ان کے سازو سامان کی طرف اشارہ کیا۔۔۔

انہیں جلادو۔۔۔ ان کے نشان مٹادو۔۔۔ یعنی اپنی شناخت کی ساری نشانیاں۔۔۔۔

"نہیں "۔۔۔ ابراہیم بھائی کے بدن میں ٹھنڈی لہر دوڑ گئی۔۔۔ ان میں تو کلام پاک بھی ہے۔۔۔ اردو کی کتابیں بھی۔۔۔ بچپن میں اردو کا کوئی ورق آنگن یا ڈیوڑھی میں پڑا ملتا تو اماں کان مروڑتی تھیں۔۔۔ پگلے۔۔۔ ان میں اللہ کا نام ہوتا ہے۔ اسے ایسے پھینکتے ہیں کیا۔۔۔ پہلے انہیں چومو۔۔۔"

"۔۔۔ تمہارا ایمان ہے۔ مگر مارے جاؤگے تب؟ وہ آکر ان کی بے حرمتی کریں گے، تب؟ انہیں پیروں کے نیچے کچلیں گے۔ آگ دکھائیں گے، اس وقت؟"

اس نے گھٹی گھٹی سانس چھوڑی۔۔۔ "میں نہیں کرسکتا۔ میں مجبور ہوں۔"

"۔۔۔ تو پھر مارے جاؤ۔ مرنے کے لیے تیار ہوجاؤ۔۔۔"

دیوار پر لگی آنکھوں نے اس کی طرف نفرت سے دیکھا۔۔۔ ان میں لکھا ہے کہ تم مسلمان ہو۔۔۔ اور ڈر اسی بات کا ہے کہ تم مسلمان ہو۔ اور مسلمان ہو اس لیے یقیناً مارے جاؤ گے۔ دیکھو، آس پاس کے سب مسلمان بھاگ گئے۔۔۔"

انہیں یاد آیا، رات انہوں نے ایک ڈراؤنا خواب دیکھا تھا۔ خواب میں دیکھا کہ چاروں طرف ہتھیار سے لیس ڈاکو گھوم رہے ہیں۔ مسجدیں توڑی جارہی ہیں ۔۔۔ بسوں میں، گاڑیوں پر، دیواروں پر، ہر جگہ بھڑکیلے نعرے لکھے ہیں۔۔۔ مسلمان اپنے اپنے گھروں کو چھوڑ کر راتوں رات بھاگ رہے ہیں۔ دور تک لمبا قافلہ۔۔۔ ڈاکوؤں کو پتہ چل گیا ہے۔ ڈاکو قافلے والوں پر ٹوٹ پڑے ہیں۔ اور ایک ایک کے سر تن سے جدا کیے جارہے ہیں۔ جن کے سر کٹتے ہیں، ڈاکو غصے اور حقارت سے ان کے منہ پر تھوکتے ہیں یا پینٹ کی زپ کھول کر۔۔۔۔ پیشاب کی دھار بہادیتے ہیں۔ ملیچھ۔۔۔ سپنولیا۔۔۔ انہوں نے دیکھا۔ راتوں رات لوگ گھر کے باہر لگے نیم پلیٹ کو اکھاڑ

رہے ہیں، توڑ رہے ہیں۔ اور گھر کے باہر گیروا کپڑوں کے جھنڈے لگا رہے ہیں۔ انہوں نے دیکھا۔ ایک مسلمان گیروا کپڑوں میں ہے۔ ٹانگوں میں دھوتی۔ ماتھے پر چندن۔ پیچھے سے ایک ڈاکو آتا ہے۔ اس کی تلوار چمکتی ہے۔ مسلمان چیختا ہے۔ بچاؤ۔

ڈاکو تلوار اڑا کر ہنستا ہے۔ "سانپ کا بچہ سانپ ہی رہے گا۔ جو بھی بھیس بدل لے.... مار ڈالو...."

انہوں نے یہ بھی دیکھا۔ جو لوگ بچ گئے ہیں وہ اپنے اپنے ماتھے پر چندن اور بھبھوت مل رہے ہیں۔ کلام پاک پر رامائن یا مہابھارت کا کور چڑھا کر، تہ خانے میں بند بند تلاوت کر رہے ہیں۔ اور گھر کے باہر آکر دھوتی پہن کر، ٹیکا لگا کر بھارتیہ، بن جاتے ہیں۔

وہ دیکھ رہے تھے۔ بادشاہت اور غلامی کا زمانہ ایک بار پھر لوٹ آیا ہے۔ انہوں نے کہیں سنا تھا۔ انگریزوں کے زمانے میں، انگریز ڈنڈے کے ایک چھور پر ہیٹ رکھ کر ہندوستانیوں کو سلام کرنے کو بولتے تھے۔ اور جو ہیٹ کو سلام نہیں کرتا تھا، انگریز اس پر ہنٹر برساتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔ انہوں نے دیکھا۔ سب کچھ ویسا ہے۔ صرف منظر بدل گیا ہے۔ ہیٹ کی جگہ ڈنڈے پر گیروا کپڑا پڑا ہے۔ اور ایک آرمی کا آدمی سہمے سہمے سے مسلمانوں کو بلا کر کہہ رہا ہے۔ پرنام کرو۔ جو ہاتھ نہیں اٹھتے، ان پر ویسے ہی ہنٹر برس رہے ہیں۔ چیخ۔ تیز چیخ۔ وہ صرف چیخیں سن رہے ہیں۔

وہ دور تک دھواں دیکھ رہے تھے۔ جلتے ہوئے مکانات... آسمان چھوتے ہوئے شعلے...

وہ دیکھ رہے تھے۔ جو بچ گئے ہیں، آرمی کے لوگ انہیں غلاموں کی طرح کھینچتے ہوئے لیے جا رہے ہیں۔ اور سہمے بھیڑوں کی طرح سر نیچا کیے، ہاتھ جوڑے مسلمان چلے جا رہے ہیں...

انہوں نے دہشت سے آنکھیں موند لیں۔ انہوں نے دیکھا۔ انہوں نے ایسا

بہت کچھ دیکھا۔ بہت کچھ دیکھا جسے بتایا نہیں جاسکتا۔ کسی کو سنایا نہیں جاسکتا، لکھا نہیں جاسکتا۔ انہوں نے دیکھا، ایک بار پھر پرانے زمانے کی طرح پھانسی دیئے جانے کے قصے عام ہیں۔ شاہراہوں پر جا بجا لکڑی کی صلیبیں جھول رہی ہیں۔

"۔۔۔قصور؟"

ایک آدمی چیختا ہے۔۔۔

"۔۔۔سرکار... یہ نماز پڑھتا ہوا پکڑا گیا۔"

"۔۔۔ہینگ"۔۔۔

"۔۔۔سرکار اس کے گھر میں اردو میں لکھا ہوا...."

"۔۔۔ہینگ"

"۔۔۔سرکار یہ آدمی دو پلی ٹوپی پہنے تھا...."

"۔۔۔ہینگ"

انہوں نے دیکھا.... ایک تیز الاؤ ہے۔ الاؤ میں ڈھیر ساری ٹوپیاں، تسبیحیں پڑی ہیں... الاؤ کے شعلے دہک رہے ہیں۔ انہوں نے دیکھا صبح ہوگئی ہے۔ غلام، پنجروں میں قیدیوں جیسے کپڑے پہنے قید ہیں۔ ہاتھ پیروں میں زنجیریں پڑی ہیں۔ انہوں نے دیکھا۔۔۔ ہلکی ہلکی صبح نمودار ہوگئی ہے... پولیس کا آدمی آتا ہے۔ غلاموں کے پنجرے کھولتا ہے۔۔۔ چابک ہوا میں لہراتا ہے، اور....

رونگٹے کھڑے کردینے والے اس خواب کے بعد اب باقی ہی کیا تھا۔ وہ اٹھے تو جیسے سب کچھ بدل چکا تھا۔ وقت... زمانہ ۔۔۔۔ کمرہ وہی تھا۔ دیوار پر اسلامی کلینڈر، جھول رہے تھے۔ پائینتانے ان کی ٹوپی پڑی تھی۔ وہ جیسی لنگی پہنے تھے، ایسی چٹائی دار لنگیاں زیادہ تر مسلمان ہی استعمال کرتے ہیں۔ سہمے سہمے سے وہ آئینہ کے سامنے کھڑے ہوگئے۔ پیشانی پر سجدے سے گٹھا پڑ گیا تھا۔ سیاہ گٹھا۔ بڑے بوڑھوں سے سنتے آئے تھے۔ قیامت کے دن اس گٹھے سے روشنی کی کرنیں پھوٹتی ہیں... مگر اس وقت ۔۔۔ یہ سب کچھ انہیں کاٹ رہا تھا... جیسے یہ پورا گھر جل رہا ہو۔

وہ تیزی سے ہتھوڑا لے کر باہر نکلے۔ سڑک ابھی سناٹے میں ڈوبی تھی۔ دور دور تک کوئی نہیں۔ سامنے والی دکانیں ۱۰۔۹ بجے سے پہلے کھلنے کا سوال ہی نہیں۔ انہوں نے دروازے پر جھولتے نیم پلیٹ کو دیکھا... محمد ابراہیم ..... آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھایا۔ ہتھوڑا نیم پلیٹ پر مارنا چاہا تو پیچھے سے کسی نے دبوچ لیا۔ وہ سہم گئے۔ خوفزدہ ہوکر گھومے تو شبن سے ٹکرائے۔

"دولھا بھائی۔ یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟"

"شی"... انہوں نے انگلی سے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

شبن کنارے ہو گیا۔ "اپنا نیم پلیٹ توڑ رہے ہیں؟"

"ہاں"....

"خالی نیم پلیٹ دیکھ کر بھی تو۔ کچھ لوگ..." شبن کہتے رکتے رک گیا۔ انہیں یاد آیا۔ خواب والے لوگ اپنے نیم پلیٹ کی جگہ دوسرے فرقے کی نیم پلیٹ ڈال رہے تھے۔ وہ بس خوف میں گھرے تھے۔ انہوں نے جیسے کوئی دھیان نہیں دیا...

"ٹھک... ٹھک... ٹھک..."

نیم پلیٹ کے ٹکڑے ٹکڑے بکھرے تھے۔

ایسا کرتے ہوئے انہوں نے دیکھا، سڑک کے اس طرف والے مکان کے چھجے سے ملکانی صاحب ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ حیرت سے۔ اور دن ہوتا تو شاید وہ مسکراتے۔ باتیں کرتے، مگر نہیں۔ انہوں نے ہاتھ جھٹک دیا۔ شبن کا ہاتھ پکڑا۔ جھٹ دروازہ بند کیا۔ کمرے میں آگئے...

"یہ سب؟"

شبن کی آنکھوں میں خوف ہی خوف تھا۔ انہوں نے شبن کی آنکھوں میں جھانکا، جہاں ایک سہما سہما بھگوڑا، موجود تھا۔ جو اپنے محلہ کی فضا خراب ہوتے ہی بیوی بچوں کے ساتھ ان کے یہاں آد...۔

"تم کیوں بھاگے تھے شبن میاں؟"

شبن نے گہری سانس لی۔ "کچھ کہہ نہیں سکتا دولہا بھائی۔ کچھ نہیں۔ فضا خراب ہوئی تو انہوں نے کہا۔ "بہتر ہے تم ابھی چلے جاؤ۔ اس لیے کہ جب جنون حد سے گزرتا ہے تو ہماری نظریں بھی بدل سکتی ہیں۔ ہاں یہ کہا انہوں نے۔ جن کے ساتھ دن بھر کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ یہ کہا انہوں نے۔۔۔"

ابراہیم بھائی نے شبن کی پیٹھ تھپتھپائی۔۔ دیکھا، شبن کی آنکھوں میں ایک قطرہ طوفان کانپا اور تھم گیا۔۔ شبن مندر مارگ پر ہندوؤں کے گھر میں کرائے دار تھا۔ بڑے اچھے لوگ... ہر وقت اٹھنا بیٹھنا۔ دکھ سکھ میں ہر لمحے کا ساتھ۔ جہاں بیٹھے وہیں ایک دوسرے کا کھانا پینا تک ہوگیا۔ کوئی چھوا چھوت نہیں۔ مگر ادھر جنون کے بارود بھڑکے، ادھر مالک مکان نے شبن کو بلاکر عملی بات سمجھادی۔ کہ میاں ایسے میں جذباتی بن کر کچھ کہنا اچھا نہیں ہوتا۔ یہاں اکیلے صرف تم مسلمان ہو اور تم سے دستخط کراکر لے جانے والے بھی جان گئے ہیں کہ تم ۔۔۔ تمہارے یہاں اردو میں خط آتے ہیں۔ پرچے آتے ہیں۔ تمہارے بیٹے تم سے ملنے آنے والوں کو باہر نکل کر زور زور سے خدا حافظ اور سلام عرض کرتے ہیں۔ پوسٹ مین سے لے کر آس پاس والے سب جانتے ہیں کہ تم ۔۔۔۔ کچھ ہوگیا تو ۔۔۔۔ ہم تو بچالیں گے ۔۔۔۔ مگر..... کیا خبر جنون میں ہماری آنکھیں بھی بدل جائیں۔۔۔۔۔"

شبن میاں نے پھر دیری نہیں کی۔ بستر اٹھایا اور ان کے یہاں چلے آئے۔

شبن نے ان کی طرف غور سے دیکھا۔ "لیکن..... یہاں بھی تو سب جانتے ہیں آپ کو۔۔۔"

"ہاں" ۔۔۔۔۔

"پاس پڑوس کے مسلمان بھی چلے گئے؟"

"ہاں" ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

"کچھ ہوا تو سب سے پہلے ہم ہی....."

اچانک وہ ٹھٹھک گئے۔ کان کھڑا کیا تو معلوم ہوا کلام پاک کی تلاوت کی صدا

دھیرے دھیرے دالان خانے سے نکل کر ان کوٹھریوں سے ہوتی ہوئی باہر کی ہوا میں گونجنے لگی ہے۔ کون ہے......؟ نصیبن ہوگی......وہی......اتنی صبح صبح اٹھتی ہے، پھر فجر کی نماز پڑھنے کے بعد کلام پاک لے کر بیٹھ جاتی ہے۔ لیکن اتنے زور زور سے.....

وہ تلملائے ہوئے دالان خانے میں آئے۔ نصیبن جانماز پر جھکی ہوئی۔ دھیمی آواز میں تلاوت میں مصروف تھی۔

"بند کرو۔ بند کرو۔" وہ تیز آواز میں چیخے۔ "لپیٹو۔ جزدان میں لپیٹو۔"

نصیبن چونک گئی۔ "یہ کیا ہے؟"

"ایک دن تلاوت نہیں کروگی تو قیامت نہیں ٹوٹ پڑے گی۔"

"چھپاؤ۔ میں کہتا ہوں چھپاؤ۔"

انہوں نے جھپٹا مارنا چاہا تو نصیبن نے ہاتھ تھام لیا۔ "آپ نے وضو نہیں بنایا۔"

"میں کہتا ہوں" وہ تلملا گئے۔

"یہ کیا ہوگیا ہے آپ کو۔" نصیبن نے کاغذ کی نشانی بنا کر صفحہ موڑ دیا۔ ان کی طرف پیار سے دیکھنا چاہا۔ مگر ٹھہر گئیں۔ اتنی ساری جھریاں......ایک ہی دن میں میاں کے چہرے پر کیسے اگ آئیں۔

"یہ کیا ہوگیا ہے آپ کو؟"

وہ جیسے غصے میں چیخے۔ "کیا ہوگیا ہے۔ خوف کی بیماری لگ گئی ہے مجھے.... سب سے ڈر لگ رہا ہے۔ سب سے۔ سبزی والے سے......دودھ والے سے......مہتر سے......بجلی والے سے......سب سے......ہر اس شخص سے، جو میری ذات کا نہیں ہے۔ سب ہم سے اچھے ہیں......بہتر ہیں۔ سب زندہ رہیں گے اور ہم ......"

ان کی آدھی آواز اٹھتی چڑھتی سانسوں کے زیر و بم کا شکار ہوگئی۔ مجھے ٹی وی سے ڈر لگتا ہے......اخباروں سے ہول آتا ہے......لاؤڈ اسپیکر پر ہونے والی اذان سے وحشت ہوتی ہے......مجھے لگتا ہے ٹوپی پہنے ہوئے لوگ نکلیں گے اور مارے جائیں

گے۔ اذان ہوگی اور مؤذن منبر سے اتار کر ہلاک کر دیا جائے گا۔ لوگ نماز پڑھ رہے ہوں گے اور کاٹ ڈالے جائیں گے......"

وہ چیختے ہوئے کمرے میں آئے تو سانس پھول چکی تھی۔ سر میں چکر آ رہا تھا۔ غش کھا کر ایک دو جگہ لڑکھڑائے۔ سماعت دھندلی سی ہوتی معلوم ہوئی۔ نیم غنودگی میں ڈوب گئے۔ پھر آنکھیں کھلیں تو جیسے سب کچھ جھل مل جھل مل کر رہا تھا۔ در، دروازے، کھڑکیاں، سب جیسے انجانے لگ رہے تھے۔

وہ خود سے بڑبڑائے...... "میرا وطن گم ہو گیا ہے......"

انہیں لگا، وہ لوگوں سے پوچھیں گے تو لوگ ہنسی اڑائیں گے۔ ٹھہاکا لگائیں گے۔ وہ ایک دم سے خود کو اکیلا اور اجنبی پا رہے تھے...... یہ...... کہاں ہیں وہ؟...... یہ کمرہ...... یہ کس کا کمرہ ہے......؟ وطن؟ ان کا وطن کون سا ہے..... سب جیسے مذاق اڑا رہے ہوں...... تم بے وطن ہو۔ تمہارا وطن ہی کب تھا۔ لڑاکو، جنگجو۔ تم لٹیروں کی طرح باہر سے آئے۔ جی بھر کر لوٹا پھر لاچار مظلوموں پر حاکم بن کر راج کرنے لگے۔ یہاں...... یہاں تھا وطن...... انہوں نے جیسے کہنا چاہا...... اس مٹی میں..... جسے باپ دادا، پردادا نے بنایا...... آشیاں..... سب رہتے تھے..... پیدا ہوئے۔ یہاں۔ اسی مٹی میں...... لیکن...... اچانک جیسے سب کچھ اجڑ گیا۔ علاء الدین کا جن وطن کو اٹھا کر ہوا میں کہیں دور پھینک آیا۔ اور وہ...... بھک منگوں جیسے انداز میں آتے جاتے لوگوں سے دریافت کر رہے ہوں...... صاحبو، میرا وطن کہاں ہے..... میرا ملک کہاں ہے..... میرا ملک گم ہو گیا ہے......

انہوں نے دیکھا، وہ بستر پر پڑے ہیں۔ بستر سے ذرا فاصلے پر نصیبن، شبن میاں، ان کی بیوی بچے، اقبال میاں ان کے بڑے لڑکے کھڑے ہیں۔ آپس میں کچھ باتیں کر رہے ہیں۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارہ سے سب کو اپنی طرف آنے کو کہا۔ ذہن کی نسیں اب بھی چیخ رہی تھیں۔ انہوں نے دیکھا بچے، بیوی، شبن پاس آنے میں تامل کر رہے ہیں۔

انہوں نے اشارہ کیا۔۔۔۔

شبن آگے بڑھا۔ پیچھے اقبال میاں، ان کے پیچھے نصیبن، مہرو.....ان کی کالج میں پڑھنے والی لڑکی۔

"طبیعت کیسی ہے آپ؟"

انہوں نے اقبال کو دیکھا۔ افسوس آیا۔ "بے چارہ.....بے وطن...."

"ایسے کیا دیکھ رہے ہیں۔"

"کیسا لگ رہا ہے آپ کو۔" اقبال سرہانے بیٹھ گیا۔ اور ہولے ہولے ان کا سر سہلانے لگا۔ ہاتھوں کی تمازت پا کر آنکھیں جیسے ساون بن گئیں۔

"میرا وطن گم ہو گیا ہے.....میرا وطن......"

اقبال پلنگ سے ایسے اچھلا، جیسے بجلی کا شاک لگ گیا ہو.....ابا جان.....اس نے کانپتی نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ شبن غصے میں بولے۔ "یہی باتیں.....یہی باتیں ہمیں ذلیل کرتی ہیں۔"

ذلیل؟ ان کا جی چاہا، اٹھ کر شبن کو طمانچہ لگائیں۔ "اس میں ذلیل ہونے کی کون سی بات ہے۔ جس کے ماں باپ مر جائیں وہ یتیم کہلاتا ہے۔ جو ہجرت کر جائے وہ مہاجر۔ جس کا گھر بار، وطن چھن جائے وہ بے وطن ہی تو کہلائے گا۔"

"آپ سو جائیے" نصیبن آگے بڑھی۔

اندرونی جذبات کی چبھن سے وہ پھر چیخے۔ "میرا وطن گم ہو گیا ہے۔"

نصیبن کی آنکھوں میں پھر ایک قطرہ طوفان مچلا۔ اس نے آہستگی سے سورۂ یٰسین کی تلاوت کرنی چاہی۔ ابراہیم بھائی گلہ پھاڑ کر چیخے۔ "بند کرو، ہونٹ سی لو.....چپ رہو۔ خاموش....." وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔

اقبال کمرے میں ٹہلنے لگا..... پھر اماں کا ہاتھ تھاما۔ "چلو ابا کو اکیلے چھوڑ دو۔"

شبن کی بیوی، مہرو سب باہر نکل گئے۔ اکیلا شبن رہ گیا اور وہ۔ انہوں نے دیکھا شبن پتھر کی مورت کی طرح دھیرے دھیرے ان کی طرف بڑھ رہا ہے۔ پلنگ کے قریب

آکر جیسے وہ کسی بم کی طرح پھٹ گیا۔

"دولہا بھائی.... مجھے بھی ......" اس کے لفظ تھرتھرائے..... "مجھے بھی یہی لگ رہا ہے..... میرا وطن کہیں گم ہو گیا ہے....."

پھر وہ ٹھہرا نہیں۔ اپنے کمرے میں تیزی سے لوٹ گیا۔

(۲)

ڈاکٹر پرکاش ان کے یہاں سے چار قدم کے فاصلے پر تھے۔ کہا جائے تو خاندانی ڈاکٹر۔ جب کبھی گھر بلانے کی نوبت آئے تو گھر بلالو۔ دکھالو.... فیس دو، نہ دو کوئی بات نہیں۔ دماغ جس طرح پھٹ رہا تھا، اس سے لگتا تھا، ٹیومر ہو گیا ہے..... یوں بھی بڑھاپے میں مرض چھپانا اچھا نہیں ہوتا۔ ڈسپنسری میں پہنچ کر اس نے ڈاکٹر کو نمستے کیا تو ڈاکٹر نے انہیں اشارہ سے قطار میں بیٹھ جانے کو کہا۔ ایک لمحہ کو وہ ٹھٹھک گئے۔ ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا۔ قطار میں سب سے پیچھے ان کا نمبر تھا۔ چار و ناچار بیٹھ گئے.... کیا کرتے.... مگر ایسا پہلے کبھی.... انہوں نے یوں ہی آس پاس گھورنا شروع کیا۔ اچانک وہ ٹھہرے۔ ڈاکٹر پرکاش کے ماتھے پر چندن کا ٹیکہ تھا۔ کمرے میں پہلے دھارمک کلنڈر نہیں ہوتے تھے، اب جا بجا لٹکے تھے۔ طاق پر دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں براجمان تھیں۔ اگربتی جل رہی تھی۔

وقت بدل گیا ہے۔ بدل گیا ہے۔ وہ خود سے بڑبڑائے۔

آدھے گھنٹے بعد ان کا نمبر آیا۔

ڈاکٹر پرکاش مسکرائے۔ انہیں لگا، اس مسکراہٹ میں بھی مذاق کے پہلو چھپے ہیں! "ساری، صبح کا وقت تھا۔ اس لیے انتظار کرنا پڑا۔ نبض دکھائیے...."

انہوں نے نبض دکھائی۔

"ہوا کیا ہے؟"

"دماغ میں چکر رہتا ہے۔"

"اور؟"

"بلڈ پریشر......"

ڈاکٹر نے بلڈ پریشر چیک کیا۔ پھر مسکرایا۔ "نارمل!"

"نارمل۔" وہ چونک پڑے۔ انہیں لگا، ڈاکٹر انہیں اصلیت بتانا نہیں چاہتا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"نارمل ہے بس۔" ڈاکٹر مسکرایا۔ "ویسے تکلیف کیا ہے؟"

"جی۔ دماغ میں بم کے گولے سے پھوٹتے ہیں۔ آنکھوں کے آگے گول گول دائرے بنتے ہیں۔ جیسے کئی تصویریں چٹخ گئی ہوں.... ٹوٹ گئی ہوں.... کبھی کبھی چکر اور اندھیرا سا آجاتا ہے۔"

"گول گول RINGS .... جیسے بجلی چمکتی ہے؟"

"ہاں...... بالکل۔ اور...." وہ بے دھیانی میں بولتے چلے گئے.... "اور بس سر پھٹنے لگتا ہے.... پھر لگتا ہے.... کسی کو پہچان نہیں رہا ہوں.... میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ ملک نہیں ہے۔ میرا ملک گم ہو گیا ہے......"

"وہاٹ ..." پرکاش اتنے زور سے چونکے کہ کئی مریض ان کی طرف دیکھنے لگے۔

"جی۔ یہی لگتا ہے...."

انہوں نے دیکھا۔ ڈاکٹر کی پیشانی پر لکیریں پڑ گئی ہیں۔ وہ کچھ دیر تک انہیں گھورتے رہے۔ پھر سنبھل کر بیٹھ گئے.... "کچھ الگ سا سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔ بتائیں گے؟"

"ضرور ممکن ہوا تو۔" وہ دل ہی دل میں ڈر گئے۔

"سڑک پر مرے ہوئے دو آدمی پڑے ہوں.... ایک ہندو ایک مسلمان۔ آپ پہلے کسے بچائیں گے؟"

"جی...." وہ اٹک گئے۔ ڈاکٹر مسکرا رہا تھا۔

"عمران اور کپل میں آپ کو زیادہ کون پسند ہے؟"

"جی....."

"ہند پاک ٹیسٹ میچ چل رہا ہو، آپ کس کی جیت پر خوش ہوں گے؟"

"جی....."

ڈاکٹر کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ "آپ بالکل ٹھیک ہیں۔ آپ کو کوئی بیماری نہیں۔ آپ صرف ڈر گئے ہیں۔ آپ بہت ڈر گئے ہیں۔ آپ گھر جائیے۔ اگلا نمبر۔"

انہوں نے آواز لگائی۔ آگے بڑھتے بڑھتے ان کو ڈاکٹر کی آواز سنائی پڑی۔ "سن آف بچ۔ یہ آج بھی سمجھتے ہیں کہ یہ یہاں رول کرتے ہیں۔ پتہ نہیں کب ان مسلمانوں کی ذہنیت بدلے گی۔ رہتے یہاں ہیں۔ کھاتے یہاں ہیں اور....."

وہ سر سے لے کر پیر تک جیسے لرز گئے۔ بدن میں کاٹو تو خون نہیں۔ لرزتے قدموں سے باہر سڑک تک آگئے۔ مگر جیسے خوف سے شرابور تھے۔ بس یہی لگتا تھا، چاروں طرف سے اسٹین گن، کلاشنکوف اور طرح طرح کے ہتھیاروں کی جدید ماڈل سے لیس لوگ آئیں گے۔ گھیر لیں گے۔ دنادن گولیاں چلیں گی۔ کوئی ان کے منہ پر حقارت سے تھوکے گا۔ جیب میں موڑ کر رکھی ہوئی دو پلی ٹوپی کانپ گئی۔ آرمی کا آدمی قہقہے بکھیرتا جیب سے یہ دو پلی ٹوپی کھینچے گا اور اسے ہوا میں لہرا دے گا..... جیسے لاکھوں کی وحشیانہ ریلی نکلے گی..... جیسے رتھ یاتراؤں کا خونی سیلاب سڑکوں پر بہے گا۔ خونخوار چہروں والے ہاتھوں میں مشعل لیے انہیں گھیر لیں گے..... بیہودہ باتیں بکیں گے۔ "دیکھیں کون بچاتا ہے تمہیں۔ تمہارے اللہ میاں آسمان سے آتے ہیں یا نہیں۔"

نظر اٹھاتے ہیں تو دور دور تک کوئی بھی ان کے قبیل کا نظر نہیں آتا۔ مندروں کی گھنٹیاں ٹن ٹنا رہی ہیں۔ ہوا میں شنکھ پھونکے جا رہے ہیں۔ لاؤڈ اسپیکر سے بھجن کی آواز ۲۴ گھنٹے کانوں میں گونج رہی ہے۔ وہ ذرا آگے بڑھتے ہیں۔ مولانا محمد علی روڈ، مولانا ابوالکلام آزاد روڈ، سر سید روڈ، نور علی گلی، قریش محلہ.....اب ان سارے گلی محلوں کے

نام بدل چکے ہیں۔ ان کی نشانیاں، ان کے قصے ایک ایک کر کے مٹائے جا رہے ہیں۔ بدن میں پھر لرزہ سا طاری ہوا.... ہونٹوں سے کپکپی چھوٹی..... میرا وطن .... گم ہو گیا ہے... اب جیسے خود پر اختیار نہ تھا۔

آگے بڑھے ......

سڑک بارود اڑا رہی تھی۔

رکشہ والے کو روکا.... "میرے بھائی، میرے وطن کو دیکھا ہے۔ میرا وطن.....؟"

پیدل چلنے والے ایک مسافر کا ہاتھ تھام لیا۔ "سنو بھائی! ایک منٹ کے لیے رک جاؤ۔ ... میرا گھر میرا وطن ... کچھ یاد نہیں آ رہا ہے۔ سب گم ہو گیا۔ راستہ بتا سکتے ہو؟"

آنکھوں کے آگے جیسے نیلے پیلے اندھیرے جمع ہو رہے تھے۔ یہاں کہاں ڈھونڈیں گے وہ باپ داداؤں کے قصے، ولی، صوفی، پیغمبروں کی کہانیاں، ان کی شناخت، ان کی نشانیاں، یہاں۔ کم از کم اب یہاں کی مٹی میں تو محفوظ نہیں۔ نہ ہی یہاں کے میوزیم میں.... نہ تواریخ کی کتابوں میں.... سب گم کر دیے جائیں گے تو وہ.... کہاں ڈھونڈیں گے.... اپنے آپ کو؟ اپنے آج کو؟ اپنے کل کو.... اپنے باپ داداؤں کو.... اپنی تہذیب کو.....؟

وہ اپنے دو چار رشتہ داروں، عزیز، شناساؤں سے ملے۔ سب سے وہ یہی پوچھتے تھے.. "صاحبو، میرا ملک، میرا وطن کہیں گم ہو گیا ہے۔ آپ کو..... آپ کو بھی کیا ایسا ہی لگتا ہے؟"

ہر جگہ انہیں یہی ٹکا سا جواب ملتا...." آپ ڈر گئے ہیں۔ آپ خوف زدہ ہیں۔ جائیے ہمیں تنگ مت کیجیے۔"

لیکن وہ کہاں جائیں۔ گھر آتے ہیں تو بیوی بچے سہمے سہمے سے ان کی طرف ایسے دیکھتے ہیں جیسے ابھی رو پڑیں گے۔ ابا کو کیا ہو گیا ہے.... اور یہاں ان کی دماغی کیفیت روز بروز خراب ہوتی جا رہی ہے۔ گھر سے باہر نکلتے ہیں تو بس یہی جی چاہتا ہے کہ

لوگوں کو روک روک کر اپنے گم شدہ وطن کے بارے میں پوچھیں۔

اس دن اتفاقیہ طور پر ان کے ایک کلیگ مل گئے۔ وہ ان کے سوال پر چونکے۔ پھر زور سے ہنسے۔

"آپ نے کبھی اس ملک کو اپنا وطن سمجھا بھی؟"

ان کے دماغ میں دھماکہ ہوا۔۔ انہوں نے غور سے دیکھا۔ یہ آدمی..... اس آدمی کو وہ برسوں سے جانتے ہیں۔ برسوں انہوں نے ساتھ ساتھ مل کر کام کیے ہیں۔ اور تو اور.... سیکولر منچ سے بھی اس آدمی کی کتنی بار للکارتی آواز کو سنا ہے انہوں نے۔ یہ آدمی۔ انہوں نے گھور کر دیکھا۔

وہ آدمی مسکرایا۔ "سب بکواس ہے۔ سچ یہ ہے۔ یہاں" اس نے اشارہ کیا۔ وہ تھم گئے۔ آدمی جہاں اشارہ کر رہا تھا، وہاں اس کی پیشانی تھی اور پیشانی پر ترشول بنا تھا۔

"تم بدل گئے؟"

"سب کو بدل جانا ہے ایک دن"

"لیکن تم تو....؟"

"غلطی کی جا سکتی ہے تو سدھاری بھی جا سکتی ہے" وہ ہنسا۔

"میرا وطن".... وہ لرز گئے۔

"پاگل پن چھوڑو۔ تمہارا وطن کہیں کوئی تھا ہی نہیں۔ تم شروع سے لٹیرے تھے۔ لٹیرے۔"

اس نے زور دیا۔ "ہمیں بھی پہلے تواریخ کا صحیح گیان نہیں تھا۔ مگر اب۔ سچ یہی ہے۔ تمہیں یہاں نہیں رہنا چاہیے۔"

اس کی آواز بہت مناسب تھی۔ سنبھل سنبھل کر۔ "تمہیں خود ہی یہاں سے چلے جانا چاہیے۔ یا یہاں کے طور طریقے، چال چلن اختیار کر لینا چاہیے۔ اس میں غلط ہی کیا ہے؟"

ابراہیم بھائی نے آنکھیں سیدھی کیں تو لگا، سڑکوں پر اس طرح کے جیسے

آدمیوں کا ایک ریلا امڈ آیا ہے۔ سب یہی چیخ رہے ہیں ...." اس میں غلط کیا ہے۔" وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ مگر کہہ نہیں پاتے .... وہ دیکھتے ہیں .... وہ اوپر سے لے کر نیچے تک بدل گئے ہیں۔ دھوتی کرتا، ماتھے پر چندن، گھر کے باہر بدلا ہوا نیم پلیٹ، اپنے آپ کو چھپانے والی ساری تدبیروں کے باوجود وہ ہار گئے تھے۔ PSYCHIATRIST ابراہیم بھائی نے سوچا ممکن ہے، نفسیاتی معالج کے پاس ان کے زخموں کا علاج ہو۔

(۳)

PSYCHIATRIST نے ان کی آنکھوں میں جھانکا۔ " گھبرائیے نہیں۔ سچ سچ بتائیے۔ آپ کو ایسا کب سے لگ رہا ہے۔؟"

"ادھر چند ماہ سے۔"

"پہلے نہیں لگتا تھا؟"

"اتنا بھیانک نہیں۔ لیکن یہ ضرور لگتا تھا کہ ایسا کچھ ہو سکتا ہے۔"

"اب؟"

"اب صرف اسٹین گن اور اسلحہ دھاری پولیس کے بھیس میں ڈاکو نظر آتے ہیں .... ڈر لگتا ہے .... وہ آئیں گے۔ ہماری شناخت مٹائیں گے۔ گھر میں آگ لگا دیں گے۔ ہماری لڑکیوں کی عزت لوٹیں گے۔ لڑکوں کو بندوق سے شوٹ کریں گے اور ہماری الہامی کتابوں کو ...." وہ ہانپ رہے تھے۔ " آنکھوں کے آگے گول گول دائرے بنتے ہیں۔ یہ دائرے آپس میں ٹکراتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے RINGS .... بلیک اسپاٹ ..... پھر آنکھوں میں نیلی پیلی روشنیاں۔ کہیں اندھیرا سا لپکتا ہے۔ اور لگتا ہے ...." وہ تیز تیز سانس لیتے ہیں .... میں بے گھر ہوں، بے وطن ہوں .... سب کچھ الٹ پلٹ گیا یا غائب ہو گیا ...." میں سڑک پر آتا ہوں ..... لٹالٹا .... لوگوں سے پوچھتا ہوں .... میرے وطن کو دیکھا ہے۔ صاحبو! میرا وطن گم ہو گیا ہے۔"

وہ دیکھتا ہے۔ PSYCHIATRIST کے چہرے پر بل پڑ گئے ہیں۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا ہے۔ کافی دیر تک وہ ان کے چہرے کو پڑھتا رہا۔ پھر دنیا بھر کی ادھر ادھر کی باتیں پوچھتا رہا۔ باپ کو کیا بیماری تھی۔ دادا کو کیا تھی۔ بچپن میں اس کے ساتھ کیا کیا ہوا۔ وہ کیا کیا شوق سے کھاتے ہیں۔ کون سا رنگ اچھا لگتا ہے۔ چور ڈاکو، ہتھیار کیسے لگتے ہیں۔ عجب اٹ پٹے سوال۔ سرخ مرچ اچھا لگتا ہے کہ ہری مرچ۔ گلاب اور کانٹے میں کیا پسند ہے....

"صاحب۔" انھوں نے غصے میں اس کی طرف دیکھا۔ "سوال اس کا ہے کہ میرا وطن...."

وہ کچھ ITIS A MATTER OFSHAME۔ PSYCHIATRIST اٹھ کر کھڑا ہوا۔ کہتے کہتے رک گیا۔..... "ٹھہرئیے.... کیا آپ نے کسی مسلم آتنک وادی کو کبھی اپنے یہاں پناہ تو نہیں دی؟"

"جی"

"سوچیے۔ خوب سوچیے۔ کبھی انجانے میں۔ ممکن ہے آپ کا رشتہ دار ہو۔"

"جی"

"سوچیے، کبھی، کسی برے موقع پر۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا.... آپ نے اپنے گھر پر ہتھیار، بارود وغیرہ تو نہیں بنائے؟"

"جی؟"

"دنگوں اور فسادات میں آپ نے کسی ہندو کو....؟"

وہ گھبرا کر چیخے...... "پاگل ہیں آپ۔ آپ علاج نہیں کر رہے .... آپ پریشان کر رہے ہیں مجھے...."

PSYCHIATRIST ان سے بھی زیادہ غصے میں چیخا۔ "گیٹ آوٹ۔ نکل جائیے یہاں سے۔ آپ کو کوئی بیماری نہیں ہے۔ آپ کسی موذی مرض میں مبتلا ہیں۔ آپ..." وہ کہتے کہتے ٹھہرا..... "آپ ایک خطرناک اپرادھی ہیں۔ مجرم۔ آپ کے

ذہن میں جو بھیانک باتیں ہیں۔ جو اٹھتے بیٹھتے سوچتے ہیں آپ، وہ انتہائی خطرناک ہیں اور ملک کو نقصان پہنچا سکتی ہیں۔" وہ ٹھہرا۔ پھر آنکھ کا اشارہ کیا۔ "آپ چلے جائیے یہاں سے؟"

وہ نڈھال قدموں سے باہر نکل آئے۔ قدم شل۔ کہاں جائیں۔ کیا کریں۔ ذہن کو سمجھانے کی کون سی تدبیریں کریں۔ یا اللہ کہتے ہوئے بھی ہونٹ سکڑ کر برف کی طرح ٹھنڈے ہوئے جا رہے تھے۔

وہ خود چاہتے تھے کہ اب یہ مکان چھوڑ دیں۔ کہیں دور چلے جائیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ وہ تہیہ بھی کر چکے تھے۔ مکان کے خریدار تو پہلے سے ہی تیار تھے۔ مگر عین وقت پر پاس پڑوس والوں کو خبر مل گئی۔ وہ ہاتھ جوڑے ہوئے چلے آئے۔ انہوں نے یقین دلایا۔

"ڈریے نہیں۔ کچھ نہیں ہو گا آپ کو۔ آپ کہیں نہیں جائیں گے۔ یہیں رہیں گے۔"

ان کی آواز کمزور سی پڑ گئی۔ "لیکن ہم تو یہاں اکیلے پڑ گئے ہیں۔"

"ہمیں آپ اپنا نہیں سمجھتے۔ آپ کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

ابراہیم بھائی کو تب پہلی بار لگا تھا، وہ کسی غیر ملک میں ہیں شاید، جہاں انہیں اپنی پناہ گاہ کو، اپنے گھر کو اپنا گھر کہتے ہوئے بھی پڑوسیوں کی صلاح لینی پڑ رہی ہے..... وہ اپنی ہمت، اپنی مضبوطی سب کچھ ان کے سپرد کر چکے ہیں۔ ایک دم سے کمزور، اکیلے اور دبو آدمی۔ بس ان کے بھروسے۔ PSYCHIATRIST کے یہاں سے لوٹے تو طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب ہو گئی۔ گھر آئے تو کمرے میں بوجھل بوجھل، افسردہ، تنہائی کے نوحے کھلے تھے۔ نصیبن، شبن، شبن کی بیوی، اقبال میاں، سب انہیں دیکھ کر کسی حادثہ کی طرح چونک پڑے۔

"آپ یوں کہاں چلے گئے تھے؟"

انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اقبال دھیرے سے آگے بڑھے۔ کان میں پھسپھسایا۔ "شبن پر بھی دورہ پڑا تھا۔

عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگے۔ اچانک زور زور سے چیخنے لگے۔"

"کیا.......؟"

"ہاں وہی الٹی پلٹی باتیں۔ میرا گھر کہاں ہے۔ میرا وطن کہاں ہے۔ میرا مکان کہاں ہے۔ میرا ملک گم ہو گیا ہے۔ ابا" وہ دھیرے سے وحشت کے انداز میں پھسپھسایا۔ "سچ تو یہ ہے کہ اب یہ دورے مجھے بھی پڑنے لگے ہیں۔"

انہوں نے سر جھکا لیا۔

ابراہیم بھائی پھر ٹھہرے نہیں۔ انہیں لگا، وہ غش کھا جائیں گے۔ چکرائے تو جھڑتی محرابوں والی دیوار کو پکڑے کمرے میں آ گئے۔ پتہ نہیں کب آنکھ لگ گئی۔ اور آنکھیں لگتے ہی وہ ایک بار پھر سے... خوابوں کے اس خوفناک ہجوم میں گھرے ہوئے تھے۔

کیا دیکھتے ہیں۔ کہیں جائے اماں نہیں ہے۔ مسلمان یا تو مارے گئے یا بھاگ گئے۔ یا کونے میں نام اور بھیس بدل کر زندگی۔ نہیں، دوزخ بھری زندگی کی کڑواہٹ جھیل رہے ہیں۔ انہیں چاروں طرف چن چن کر مارا جا رہا ہے۔ اخبار، الکٹرانک میڈیا، عام بحث و مباحثہ، مشاعرے، ادبی گوشٹھیاں... سب تصویریں بدل گئیں۔ بس وہ بھاگتے پھر رہے ہیں۔ بھگوڑوں کی طرح۔ ایک جگہ مشاعرہ ہو رہا ہے۔ وہ پہنچتے ہیں۔ تالیاں بج رہی ہیں۔ چہرے پر چندن، پیروں میں دھوتی۔ ان کا پورا حلیہ بدلا ہوا ہے۔ ایک ۳۲ سال کا نوجوان کچھ پڑھ رہا ہے۔ لوگ تالیاں بجا رہے ہیں۔ ہنس رہے ہیں۔ یہ لڑکا۔ انہیں یاد آیا، ایک بار فرقہ واریت کے خلاف ہونے والی کانفرنس میں دریاں بچھاتے ہوئے انہوں نے اس لڑکے کو دیکھا تھا۔ لڑکا کچھ پڑھ رہا ہے... وہ سنتے ہیں۔

"ایک دن پرانی تہذیب، پرانی سبھیتا کی طرح
دفن کر دیے جاؤ گے تم
اتنے گہرے میں، اتنی گہرائی میں
کہ کبھی کسی کھدائی سے برآمد نہیں ہو گے تم"

انہیں لگا ان کی سانس، ان کی گرفت سے پھسل رہی ہے۔ دھونکنی کی طرح چل

رہی ہے۔ نہیں، وہ تیز چیخ مارتے ہیں۔ ہیبت ناک وحشی ہو رہی آنکھیں ان کی طرف اٹھتی ہیں۔ وہ سرپٹ بھاگتے ہیں۔

آواز چیختی ہے۔ "پکڑلو۔ مسلمان ہے۔ بھاگنے نہ پائے۔ فائر۔ شوٹ۔"

کئی دنوں کی مسلسل تھکن، مسلسل بھاگ دوڑ۔ چور ڈاکوؤں کی طرح چھپنے چھپانے کے نتیجے میں ان کی داڑھی بڑھ چکی ہے۔ بھاگتے بھاگتے وہ ایک جگہ ٹھہرتے ہیں۔ ایک پیڑ ہے۔ پیڑ کے نیچے حجام بیٹھا ہے۔ وہ حجام کے سامنے بیٹھ جاتے ہیں۔ استرا بجاتے ہوئے حجام ان کے حلیے کو غور سے دیکھتا ہے۔ پھر، چندن ٹیکے کے پاس ابھرے ہوئے سیاہ گٹھے کو.....

"تم....."

انہیں لگا، یہ دو کوڑی کا حجام بھی جانتا ہے کہ جو مسلمان بچ گئے ہیں وہ حلیہ بدلے گھوم رہے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں حجام کے استرے کی دھار نوکیلی ہو چکی ہے اور چمک رہی ہے۔ وہ پھر وہاں سے بھاگتے ہیں حواس باختہ۔ ایک جگہ سے فائرنگ کی آواز فضا میں پھیل رہی ہے۔ رہ رہ کر گھگھیائی چیخ فضا میں گونج جاتی ہے۔ زمین پر لاشیں بچھی ہیں۔ چاروں طرف آرمی کے لوگ کھڑے ہیں۔ وہ ایسے خوش ہیں جیسے عام طور پر فتح یابی کے بعد ہوتے ہیں۔ کمانڈر جیسا آدمی گنتی گن رہا ہے...."نور محمد، غلام بخش، سہیل انصاری.....سب مر گئے۔ لاشوں پر پیر دھرتا وہ قہقہہ لگاتا ہے.....سب مر گئے۔ ۱۲۰۰۔ ۱۲۰۰سال بعد اب ہمارا رول ہے یہاں....."

جیسے کبھی پولیس نکسلیوں کا صفایا کرتی تھی۔ جیسے پولیس چمبل جیسی جگہوں میں چھپے ڈاکوؤں پر حملہ بولتی تھی.....ویسے ہی اب......کونے کترے میں چھپے ہیں ابراہیم بھائی۔ ڈرے ڈرے۔ خوف زدہ۔ کمانڈر فتح سے چیختا ہے......"سب مر گئے.... با مہ.....مہ....."

ابراہیم بھائی کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ یہ سب.... یہ خواب.....وہ ایسے خواب

کیوں دیکھتے ہیں۔ یہ خواب ان کا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتے۔ وہ جتنا ان مناظر سے فرار حاصل کرنے کی کوشش کرتے، یہ مناظر اسی شدت سے انہیں دبوچ لیتے۔ کہاں جائیں۔ کہاں امان ڈھونڈیں۔ گھر سے باہر نکلنا چاہا تو ملکانی صاحب سامنے آگئے۔ وہی جو سڑک پار دو دکان چھوڑ کر تیسرے والے بنگلہ میں رہتے ہیں۔ اور برسوں سے انہیں اپنے گھر کے لیے نوکر ڈھونڈھنے کے لیے کہتے ہیں۔ جب بھی کہیں ملاقات ہو جاتی ہے نوکر کا ذکر ضرور چھیڑ دیتے ہیں۔

"نوکر ملا۔؟"

انہیں لگا، ملکانی ان کا مذاق اڑانا چاہتے ہیں۔

"سنا ہے آپ کافی پریشان ہیں آج کل۔"

ان کا جی چاہا، ملکانی کو بھی اپنی بپتا سنا دیں۔ "میرا ملک گم ہو گیا ہے....." لیکن چپ رہے۔

"جی اچھا نہیں ہے آپ کا۔ وقت ملے تو میرے لیے نوکر ضرور تلاش کیجیے گا۔"

انہوں نے جھٹ دروازہ بند کیا۔ ایسے جیسے امید کے، زندگی کے دروازے ان پر بند ہو گئے ہوں۔ اچانک یاد آیا۔ پڑوس میں ہی تو ابھیمنیو یادو رہتے ہیں۔ ایک آنکھ خراب ہے۔ کالا چشمہ لگاتے ہیں۔ سگار پیتے ہیں۔ مکان نہ چھوڑنے کی فرمائش کرنے والوں میں ابھیمنیو یادو بھی تھے۔ کہا تھا۔ "آپ بھی چلے گئے تو ہمارے عقیدے اور بھی کمزور ہو جائیں گے۔ لکھتے پڑھتے رہتے ہیں۔ اندر جمی بھڑاس کو نکالنا ان کے لیے ضروری تھا۔ تین کمروں کی بڑی سی آفس۔ جہاں سے وہ اپنا ادبی رسالہ بھی نکالتے ہیں۔ ان کا اپنا ایک چھوٹا سا کمرہ..... کرسی میں دھنسے آپ کی بات پر مسکراتے بھی رہتے ہیں اور سگار کا شغل بھی جاری رہتا ہے۔

نمستے آداب کے بعد وہ سامنے بیٹھ گئے..... ذرا دیر میں مطلب کی بات پر آگئے.. ..وہی بھیانک خواب کی تفصیلات۔ چھوٹے چھوٹے RINGS اور اندر سے حرکت کرتی آواز..... "میرا ملک گم ہو گیا ہے۔"

"گم ہو گیا ہے۔؟"

ابھیمنیو یادو نے چونک کر، سگار کا کش کھینچا۔ پھر گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ دھیرے سے بدبدائے۔ "یہ آثار اچھے نہیں ہیں..... "اچھے نہیں ہیں"..... وہ پھر سوچ میں پڑگئے.... پھر کافی دیر بعد ان کا سکوت ٹوٹا۔

"سچ ہے۔ آپ مانیں گے آپ لوگ کبھی LOYAL نہیں رہے۔ اس کنٹری کے لیے۔ لائیل؟ سمجھ رہے ہیں نا؟"

"ایں۔ ...." وہ ایک دم سے چونک گئے۔

"تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ اسلام کی پوری تاریخ۔ آپ بھگوڑے تھے۔ یہاں آگئے۔ لوٹا تو لوٹا۔ یہیں جم گئے۔ بس گئے۔ کبھی ہندوؤں کو جزیہ کے نام پر نام نہاد تحفظ دیا۔ کبھی تلوار کے زور پر مسلمان بنایا۔" وہ مسکرائے.... "ہو سکتا ہے، آپ بھی پہلے ہمارے ہی جیسے ہوں۔ آپ کے پوروج کو بھی زبردستی ایمان لانا پڑا ہو۔" وہ رکے۔ "سمجھ رہے ہیں نا، آپ لائیل کبھی نہیں رہے۔ تواریخ، گھٹنائیں بھری پڑی ہیں۔ آپ نے مندروں کو توڑا۔ مندر کی جگہ مسجد بنائی۔ نادر شاہ، چنگیز، ہلاکو، بابر، غوری، اورنگ زیب.... سمجھ رہے ہیں نا.... آپ کو....." وہ پھر مسکرائے۔ "یہاں رہنا ہے تو اسلام کا بھارتیہ کرن، کرنا ہوگا۔ اور اس سے بھی زیادہ مسلمانوں کو اپنی لائیلٹی ثابت کرنی پڑے گی۔ اپنی لائیلٹی۔"

سگار بجھ گئی۔ ابراہیم بھائی نے غور سے ابھیمنیو یادو کا چہرہ دیکھا..... وہاں ایک بدلا بدلا سا آدمی تھا..... آنکھوں میں ویسی چمک تھی۔ جیسی زہریلے سانپوں میں ہوتی ہے۔ انہیں لگا، سیاہ چشمے کے اندر کوئی خطرناک منصوبہ پل رہا ہے..... جو ابھی کاغذ پر اترے گا.... اور آگ لگا دے گا۔ انہیں لگا.... وہ زور زور سے ابھیمنیو یادو کے سامنے کھولتے ہوئے لاوے کی طرح ابل پڑیں گے.... مجھ سے لائیلٹی چاہتے ہو۔ مجھ سے۔ ارے خاندان در خاندان.... یہیں جنمے ہم.... یہیں رہے ہم.... مدتوں سے۔ برسوں سے.... اسی مکان میں.... پلے بڑھے.... اور اب اس جگہ رہنے یا مستقبل میں رہنے کے لیے

وفاداری کے ثبوت اور دستاویز چاہتے ہو تم.... مگر کس سے کہتے.... آواز لڑکھڑائی.... آنکھوں میں اندھیرا پن اترا.... ہونٹ سکڑ گئے.... سب کچھ بھول گئے.... وہی کمزور دبی آواز منہ سے پھسل پڑی.... "کہاں جاؤں.... میرا ملک گم ہو گیا ہے۔"

ان پر جیسے دورہ پڑا تھا۔

یادو نے ایش ٹرے میں سگار کی راکھ جھاڑی۔ "آپ غلط سمجھے۔ آپ کا یہ ملک تھا ہی نہیں جو کھوتا یا گم ہو گیا۔"

کالا چشمہ اتار کر انہوں نے میز پر رکھ دیا۔ کوئی فائیل اٹھالی.... کچھ پڑھنے لگے....

پھر ابراہیم بھائی وہاں بیٹھ نہیں سکے۔ اٹھ کھڑے ہوئے۔

گھر آئے تو دیکھا۔ تکیہ پر سر رکھے مہرن سسک رہی ہے۔ زور زور سے۔ وہ کانپ گئے۔ مہرن میری بچی.... مہرن کو گھیرے ہوئے شبن، نصیبن اور اقبال میاں کھڑے تھے۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے....؟" ان کے منہ سے ڈری ڈری آواز نکلی۔

نصیبن لاغر اور کمزور جانگر کو اٹھائے، بمشکل اٹھی۔ ان کا ہاتھ پکڑا۔ باہر لائی۔ اس کی آنکھیں برس پڑی تھیں.... "یہ سب کیا ہو رہا ہے.... پہلے آپ، پھر شبن میاں، پھر اقبال اور اب مہرن۔ مہرن کو بھی دورہ پڑا ہے۔ بار بار غش آتا ہے۔ روتی ہے اور پوچھتی ہے۔ میرا ملک کہاں ہے۔ میر ملک گم ہو گیا ہے۔ پھر بے ہوش ہو جاتی ہے۔"

ایک بار پھر وہ سن سے تھے۔ غور سے پیلی پڑی مہرن کا چہرہ دیکھا۔ یا اللہ کہنا چاہا۔ آواز نہیں نکل سکی.... ادھ مرا سا محسوس کیا خود کو.... کلیجہ کانپا.... مگر آنکھوں سے آنسو کے سوتے بھی سوکھ چکے تھے۔ پھر ٹھہرے نہیں۔ لرزتے قدموں سے کمرے میں لوٹ آئے۔ کچھ ہونے والا ہے.... کا احساس رہ رہ کر دل میں ڈر اور خوف کی بارش کر رہا تھا۔

شام ہو گئی۔ شام کو ملکانی صاحب، ابھیمنیو یادو، اور پاس پڑوس کے کئی لوگ ان سے ملنے آئے۔ جیسے کوئی انہونی ہو چکی ہو.... اندر تک ٹھنڈی لہر اترتی چلی گئی۔

"آپ.... آپ لوگ....؟"

انہیں محسوس ہوا.... آواز طاقت کھو چکی ہے۔

ابھیمینو یادو آگے بڑھے۔ "ابراہیم بھائی، ہم آپ کو اندھیرے میں رکھنا نہیں چاہتے۔"

ان کی آواز ڈوب گئی.... "کیا کہہ رہے ہیں آپ لوگ... میں کچھ سمجھا نہیں۔"

ملکانی آگے بڑھے۔ "فضا ٹھیک نہیں ہے ابراہیم بھائی۔ اگر کچھ ہو گیا تو، ہم الزام اپنے سر نہیں لے سکتے۔ ہماری جانیں بھی جوکھم میں پھنسی ہیں۔"

یادو بولے۔ "بہتر ہے آپ آج رات ہی.... یا بہت بہت کل صبح۔ کہیں بھی چلے جائیں۔" ان کے آخری الفاظ پھس پھسے تھے۔

"کسی محفوظ جگہ......"

"ڈم.....ڈم.....ڈم....."

جیسے ڈرم پیٹا جاتا ہے۔ جیسے قبائلیوں کا رقص ہوتا ہے۔ فلموں میں، قصوں میں، کہانیوں میں، جیسے کسی انسان کی بلی چڑھاتے ہیں.....ڈم.....ڈم.....ڈم.....انہوں نے محسوس کیا.....ان کے اپنے مکان نے بھی انہیں پہچاننے سے انکار کر دیا۔

مہرن ڈرتے ہوئے قریب آ گئی۔ "کون کون سا سامان باندھوں، ابا؟"

کوئی سامان نہیں جائے گا۔ پہلی بار نصیبن باآواز بلند چیخیں۔ پھر انہوں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے گھر کو دیکھا اور پھر وحشت سے ان کی طرف..... "سچ کہتے ہو.... کچھ بھی اپنا نہیں لگتا.... میرا وطن....." ان کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

رات کی سڑکوں پر جیسے بارودی سرنگیں بچھ گئی ہیں۔

(۴)

انہوں نے سوچا، موت کی راتیں شاید ایسی ہی ہوتی ہیں..... صبح، جیسے کسی مجرم

کو پھانسی ہونے والی ہے۔ سب بکھرا بکھرا سامان..... انہیں لگا، چاروں طرف شنکھ بج رہے ہیں.... اور بہت سے لوگ.... بہت سے خوانخوار لوگ، ہاتھوں میں اسلحے اٹھائے ان کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ "مارو.... کوئی مسلمان بچنے نہ پائے۔"

وہ مسہری سے لگ کر بیٹھ گئے۔ صبح یہ جگہ خالی کرنی تھی۔

شبن، نصیبن، مہرن، اقبال..... ادھ مرے سے بیٹھے ہیں۔ ان کا دماغ سن ہو رہا ہے..... جیسے چاروں طرف گولیاں چل رہی ہوں..... اور اب گولیوں کا رخ ان کی طرف ہو..... فائر......

جیسے سامنے موت کھڑی ہو.... ان کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ اس رات انہوں نے پھر ایک خواب دیکھا۔

دیکھا وہی ڈراونے، خونخوار لوگ اسلحے لے کر ان پر پل پڑے ہوں۔ سب موت کے گھاٹ اتار دیے گئے... اکیلے وہی بچ گئے ہیں۔ پاگل سے۔ پاگل سمجھ کر ہتھیاروں نے انہیں بخش دیا ہے۔ ان کا مکان ڈھا دیا گیا ہے۔ پاگلوں جیسی حرکتیں کرتے وہ ادھر ادھر گھوم رہے ہیں۔ ملکانی انہیں دیکھتے ہیں۔ اپنے یہاں بلاتے ہیں۔ انہیں نوکر کی ضرورت تھی۔ وہ اپنے یہاں انہیں نوکر رکھ لیتے ہیں۔ ایسی ہی ایک بوجھل صبح ہے۔ ملکانی ان کے قریب آکر پوچھتے ہیں... "جھاڑو دیا۔ پوچھا لگایا... کپڑے دھوئے۔؟"

وہ غلام کی طرح آقا کے سامنے سر ہلاتے ہیں۔ وہ باہر بیٹھتے ہیں۔ باہر پانی کا برگونا پڑا ہے۔ برگونے میں دھوئے ہوئے کپڑوں کا گندہ پانی رہ گیا ہے۔ وہ آگے بڑھ کر گندے پانی کو ہاتھ سے ہلاتے ڈلاتے ہیں۔ پانی میں بلبلے پھوٹ پڑتے ہیں..... وہ دیکھ رہے ہیں..... کئی بلبلے.... چھوٹے بڑے۔ بلبلے بنتے ہیں.... پھیلتے ہیں.... دائروں کی شکل میں اتپلاتے ہیں.... پھر مٹ جاتے ہیں.... پھر ان میں سے کوئی ایک چھوٹا بلبلہ پیدا ہو جاتا ہے..... وہ پھر ہاتھ ڈلاتے ہیں....

وہ گم سم، خود میں ڈوبے۔ اس کھیل کو جاری رکھتے ہیں۔

○○

لال سلام صاحب

۱

"ہاں میں ہار رہا ہوں، اس جنگ میں شاید ہم سب ہار جاتے ہیں۔"
رگھوبیر کے چہرے پر سلوٹیں پڑ گئی ہیں۔ " کبھی کبھی لگتا ہے یہ سب کچھ بے معنی ہے۔ پڑھنا بھی۔ سوچنا بھی۔ کوئی فائدہ نہیں۔ یہ دنیا جیسی ہے۔ ویسی ہی چلتی رہے گی۔ کوئی ضرورت نہیں ہے۔ دیوستھا میں کیڑے نکالنے کی۔ کسی تبدیلی کی بات مذاق سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ مگر تم بتاؤ مہیتوش ۴۵ گھر بغیر کسی بات کے پھونک دیے جاتے ہیں۔ مذہب کے نام پر۔ ذات پات کے نام پر۔ اور ہم کچھ بولنے کی آزادی بھی نہیں رکھتے۔ کچھ کہنے کے لیے ہونٹ کھولنے کی، اور ہونٹ کھولو تو دھمکی بھرے خط ملتے ہیں۔ فون ملتے ہیں اور گرفتاری ملتی ہے۔ ایک پستول چاہیے مجھے اس پرساشن، ویوستھا کے بت کے پرخچے اڑانے کے لیے۔"

"جس مضبوطی کے نام پر ہم لڑائیاں لڑ رہے ہیں شاید وہ مضبوطی محض کتابوں میں اگتی ہے۔"

مہیتوش نے رگھوبیر کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ "انیس سو ستاسی میں اگر

اٹھارہ سو ستاسی جیسا ماحول نظر آئے تو تکلیف تو ہوگی ہی۔"

میز پر خاموشی پسر گئی ہے۔ رگھوبیر کی آنکھیں گہری سوچ میں ڈوب گئی ہیں۔ جانتا ہوں ان آنکھوں میں کیا ہے۔ ان آنکھوں میں اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے، اپنی ایمانداری کے نام پر پوری آگ سلگ رہی ہے۔ رگھوبیر ابل رہا ہے۔ دو دن پہلے ہی اس کی گرفتاری ہوئی تھی۔ جب اس نے سرکار کے سخت رویے پر اپنا غصہ ظاہر کیا تھا۔ یوں گرفتاری اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ایک صحافی کی حیثیت سے ایمانداری کو ہی اس نے اپنا مذہب مانا تھا۔ اور اپنے صحافتی اصولوں پر وہ سختی سے قائم تھا۔ سرکاری پابندیوں کے باوجود اس کا قلم سچ اگلنے کو مجبور تھا اور جب جب اس کے قلم نے سچ اگلا، حوالات کی سلاخیں اس کی منتظر رہی تھیں۔

کچھ دن پہلے بھی تو اس کی گرفتاری عمل میں آئی تھی جب اس نے اروِل کانڈ کے سلسلے میں اپنی زبان کھولی تھی۔ حکومت کی نا اہلی پر قلم چلایا تھا۔ رولنگ پارٹیوں کے چمچوں کو دل کھول کر کھری کھری سنائی تھیں۔ پھر اورنگ آباد کانڈ کو لے کر اس کے اندر کا کھولتا ہوا انسان باہر آیا۔ اور ان انسانوں کا خون اخبار کے صفحوں پر پھیل گیا تھا۔ اس کے قلم کے ذریعہ..... کون سی صدی ہے یہ؟ اٹھارہ سو ستاسی، آزادی کے اتنے سالوں بعد بھی بھارت کے اس پچھڑے ہوئے صوبہ میں لا اینڈ آرڈر زمینداروں کے گھر کی داسی بنی ہوئی ہے؟ سرکار چپ چاپ تماشہ دیکھتی ہے اور کس کے اشارے پر دیکھتے ہی دیکھتے ۴۵ خاندان موت کی نیند سلا دیے جاتے ہیں۔ ظلم اور بربریت کی بھی حد ہوتی ہے۔ آنکھیں موند کر حکومت نہیں ہو سکتی۔ سرکار فوراً استعفی دے۔" آواز اٹھائی تھی رگھوبیر نے، مگر احتجاج کی یہ آواز اچانک سرکاری وارنٹ کے بیچ دب گئی۔ سرکار استعفی کیا دیتی۔ حکومت پر لگائے گئے الزام کے جرم میں اسے حوالات میں ڈال دیا گیا تھا۔

رگھوبیر باہر تو آگیا مگر خود کو اپنے اندر کی اس چنگاری سے مکت نہ کرا سکا جو

دھیرے دھیرے آگ کی بڑی بڑی لپٹوں کی شکل اختیار کرتی جا رہی تھی۔ ہر شہر آرہ، بیگوسرائے، اردل، گیا اور اورنگ آباد بنتا جا رہا تھا۔ کتنے دنوں بعد مہیتوش سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ میز پر خاموشی پسری تھی اور دونوں سر جھکائے حالات حاضرہ کا جائزہ لے رہے تھے اور رگھوبیر کھولتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔

"یہ سیکولر ملک ہے مہیتوش! کیا تم اب بھی پریس کو آزاد سمجھتے ہو۔ بابری مسجد اور رام جنم بھومی کی لڑائی سے سرکار جو ہارا ہوا مورچہ جیتنے کی تیاری میں لگی ہے، اس کی مخالفت کرنے والوں کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے جانا پڑتا ہے اور جو یہ مذہب کے نام پر سیاست کی لڑی جا رہی جنگ میں ہزاروں معصوم لوگ شہید ہو رہے ہیں، ان کے بارے میں ایک کلمۂ حق بولنے کی بھی ہم صحافیوں کو اجازت نہیں ہے۔"

ذرا ٹھہر کر اس نے کہا "تم میرے ساتھ اس علاقہ میں چلنا چاہو گے؟"

میز پر بیٹھے بیٹھے اس کی مٹھیاں بھنچ گئی تھیں۔

"وہاں.....؟"

"ہاں، ہاں ..... جہاں پہنچنے میں مجھے کچھ دیر ہو گئی تھی اور سارا راستہ سونا پڑا تھا اور سو سے زیادہ لوگوں کی لاشیں شمشان میں ایک ساتھ جل رہی تھی۔ بس اتنا ہی نظارہ تو دیکھ سکا تھا میں۔"

اس کی آنکھوں میں دہشت اگ آئی تھی۔ "میں ایک بار پھر وہاں کے لوگوں سے ملنا چاہتا ہوں۔ کیا اب بھی وہاں وہی سرد مہری ہے یا کچھ گرمی آئی ہے۔ رونے والے لوگوں سے ملنا چاہتا ہوں۔ کیا وہ اب بھی مرنے کے لیے تیار ہیں۔"

"میں خود تمہیں وہاں لے چلنے کی دعوت دینے آیا ہوں۔"

مہیتوش کافی دیر بعد بولا۔

رگھوبیر چونک گیا تھا۔ "کوئی خاص بات ہے۔"

ہاں! صرف یہ کہ تم دیکھ سکو...... رونے والے لوگوں نے اب پوری طرح رونا بند کر دیا ہے اور یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اب وہ کبھی نہیں روئیں گے۔ میرے دوست

تمہاری غیر موجودگی میں ایک مراکل ہوا ہے معجزہ..... تم چل رہے ہو،نا۔ تم کو ایک تھوڑی سی جھلک دکھاتا ہوں ان کی مضبوطی کی، جو اپنی کمزوری کے نام پر ہو ہو کر کے جل اٹھتے تھے۔ وہی منتری جی کی گاڑی کو دیکھ کر ہری، جھنڈی لے کر کود پڑتے ہیں..... سالے واپس جاؤ۔ آگئے دنگے کروانے سالے ..... چمچے......"

"اچھا کیا۔ یہی ہونا ہی چاہیے تھا مگر....." رگھوبیر نے آہستہ سے کہا۔ "سسٹم ورثے میں ملی ہوئی کمزوری۔ ہم صحافی ہیں مہیتوش۔ برسوں نکڑ ناٹکوں میں، تقریروں میں، جنوادی منچ سے جڑ کر جس برابری کا سپنا دیکھا ہے ہم نے۔ یہ وہ نہیں ہے۔ انہیں وہ مضبوطی دو کہ وہ تمہارے پنجوں سے بچ لڑا سکیں۔"

"یہ مورچہ لڑا جا رہا ہے۔"

دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ اب سفر سامنے تھا۔ بس سے چار گھنٹے کا سفر۔ اور وہاں سے دو میل دھول بھری سڑکوں پر چلنا پڑا تھا۔ دھوپ کی تپش اندر سلگتی ہوئی آگ سے زیادہ نہیں تھی۔ چار گھنٹے باتوں باتوں میں گزر گئے تھے۔ آڑی ترچھی پگڈنڈیاں بچھی تھیں۔ دور تک شیشم، برگد کے پیڑ اپنی باہیں کھولے کھڑے تھے۔ آم کے باغات کا سلسلہ دائیں طرف والی زمین کے دوسرے چھور سے شروع ہوا تھا۔ اور اس کے آگے مسجد تھی۔ مسجد جو ویران پڑی تھی اور وہیں سے شروع ہوا تھا گاؤں کا سیدھا راستہ اور اسی سیدھے راستے پر چلتے ہوئے اچانک مجھے ایک جھٹکے سے رک جانا پڑا تھا۔ وہاں پر ایک نیا بورڈ لگا تھا۔ اور اس بورڈ پر لکھا تھا..... کارل مارکس گاؤں۔

"یہ کیا؟" رگھوبیر کے جسم میں ان گنت چیونٹیاں داخل ہو گئی تھیں۔

"تبدیلی" مہیتوش سنجیدہ تھا۔ "پارٹی ورک کر رہی ہے میرے دوست، تمہاری غیر موجودگی میں جو تبدیلی کی فضا قائم ہوئی ہے وہ میں تمہیں دکھانا چاہتا ہوں۔ یہاں آس پاس جتنے بھی گاؤں ہیں۔ وہاں کے نئے نام رکھ دیے گئے ہیں۔ جیسے اسٹالن گاؤں، ماوزی تنگ گاؤں۔"

ٹھیک اسی وقت ایک چھوٹے سے بچے نے قواعد کے انداز میں سلام داغا۔

"لال سلام صاحب!"

رگھوبیر چونکا۔ لال سلام صاحب، یہ لفظ اس کے اندر جیسے اتر گئے تھے۔ اس نے آنکھیں پھاڑے دیکھا۔ کتنے ہی چھوٹے بچے پتہ نہیں کہاں سے نکل کر اس کے سامنے کھڑے تھے۔ شرارتوں سے بے نیاز، انتہائی سنجیدہ، ان کے ساتھ آٹھ دس لوگ بھی تھے جو پارٹی ورکرس لگ رہے تھے......"

مہیتوش کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

"لال سلام صاحب۔" مسکراتے ہوئے کچھ نوجوان آگے بڑھے۔ ایک خوبصورت سا نوجوان آگے آیا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ وہ رگھوبیر صاحب، یہ سب دیکھ کر آپ کو تعجب ضرور ہوگا۔ ہونا بھی چاہیے۔ مگر میں بتاتا ہوں آپ کو..... ہم نے مضبوطی کے لیے اپنے طور پر گاؤں کا نام بدل دیا ہے اور ایک ہفتہ کی ٹریننگ کے دوران ان بچوں کو سکھایا گیا ہے ظلم مت سہو۔ لال سلام ان کے اندر قوت بڑھاتا ہے۔ مہاپرشوں کی کتابیں انہیں پڑھائی جاتی ہیں۔ اور گاؤں کا بدلا ہوا نام ان کی مٹھیوں کو سخت کرتا ہے۔"

"کوئی فرق، کوئی فائدہ۔"

رگھوبیر نے ان بچوں کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہم تو ایک مشن لے کر چل رہے ہیں۔ ویسے آپ آزما سکتے ہیں۔"

"تم آزماؤ تو سہی۔" مہیتوش نے رگھوبیر کی طرف دیکھا۔

"آزماؤں!"

"ہاں"

رگھوبیر کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ پھر ایک بچے پر جھک گیا۔ اب اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ وہ بچے سے مخاطب تھا۔

"سمجھو میں ایک ظالم شخص ہوں۔ میرا ارادہ ٹھیک نہیں ہے۔ میں تمہارے گھر

پر.....“

اور......

ابھی وہ اپنی بات پوری بھی نہ کر پایا تھا کہ بچے کا غصے میں چلایا ہوا پتھر سیدھا اس کے سر پر لگا تھا۔ اس کی چیخ نکل گئی۔ لڑکھڑاتا ہوا وہ زمین پر گرا۔ سر سے خون جاری ہو گیا تھا اور اس کی نبض آہستہ آہستہ ڈوبتی جارہی تھی۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ مسجد کے صحن میں تھا۔ پتھر امید سے زیادہ وزنی تھا یا نقاہت کا اثر کہ بجلی کی تیزی کی طرح چلے ہوئے پتھر کی چوٹ وہ برداشت نہ کر سکا۔ آس پاس کافی لوگ اس کے جسم پر جھکے تھے۔ سر اب بھی جھنجھنا رہا تھا مگر اب وہ ہوش میں تھا اور اس کی نگاہیں اس بچے کو ٹٹول رہی تھی۔

”وہ بچہ کہاں ہے؟“

”وہ تم سے نہیں ملے گا۔“ مہتوش سنجیدہ تھا۔

”مگر کیوں۔؟“

”اس لیے کہ تم ظالم ہو.....اس کا گھر جلاؤ گے۔“

”مگر یہ سب تو.....“

”امتحان تھا۔ تم نے صحیح کہا میرے دوست! مگر وہ بچہ اب تک اس بات سے بے خبر ہے۔ اب ہم یہ بتائیں گے کہ تم بھی اس کے دوست ہو اور یہ محض ایک امتحان تھا۔ تو وہ تم سے ملنے ضرور آئے گا۔۔۔“

اور کچھ ہی دیر بعد وہ بچہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ مگر شرمسار نہیں۔ اس کی مٹھیاں تنی تھیں۔ چہرے پر غصہ اب بھی بحال تھا۔۔۔ ہاں اس نے ہونٹوں پر نرمی لانے کی کوشش ضرور کی تھی اور اب وہ اس سے مخاطب تھا۔

”لال سلام صاحب! آپ کو زیادہ چوٹ تو نہیں لگی؟“

○○

سہیل۔۔۔۔۸۶ء

ورتمان ساہتیہ۔۔۔۔

"بیان" اُردو زبان کا پہلا مکمل سیاسی ناول ہے"۔۔۔ سیما مصطفیٰ

"بیان" اور "شہر چپ ہے"

کی غیر معمولی مقبولیت کے بعد

مُشرف عالم ذوقی

کا ایک اور اہم موضوعاتی ناول

سب سازندے

ملک کے حاشیے پر نظر آنے والے تمام جوکر اس ناول کے کردار ہیں۔ چاہے وہ امام پشاوری ہوں، جو حجرے میں بیٹھ کر مسلمانوں کی تقدیر کا فیصلہ کرتے ہیں۔ یا گِدہ سینا والے بچّہ ٹھاکر، جو اقتدار میں آنے کے بعد بھی ایک فرقہ کو سانپ سنپولیا کہنے سے باز نہیں آتے۔ ایسے ناول اشارے کنائے میں نہیں لکھے جاسکتے۔

"جو لوگ زبان زبان چلّاتے ہیں، اور صرف زبان کو لیکر باتیں کرنا چاہتے ہیں، دراصل ایسے نقاد آپ کو ٹھگ رہے ہیں، فریب دے رہے ہیں۔۔۔ وہ الفاظ کی چکاچوند میں آپ کو گمراہ کر رہے ہیں۔ دراصل وہ ایسا اسلئے بھی کر رہے ہیں کہ ان کے پاس گفتگو کا خزانہ ختم ہو چکا ہے اور ان کے مطالعہ کی بھٹّی سرد پڑ چکی ہے ۔۔۔ میں آپ کو اس جہان میں لے جانے آیا ہوں جو آپ کا دیکھا ہوا ہے اور جو آپ کی ضرورت ہے۔"

(مشرف عالم ذوقی کے ایک انٹرویو کا اقتباس)

تخلیق کار پبلشرز

۱۷۷۹۔ کوچہ دکھنی رائے، دریاگنج، نئی دہلی، ۱۱۰۰۰۲